کلیاتِ غزل

(جلد اوّل)

ظفر اقبال

معیاری اُردو زبان اور
دُرست املا کا محرک
اشاعتی ادارہ
MULTI MEDIA
AFFAIRS

نیک طبع شاعر نئی غزلیں نکالتا اور ان سے ایک
سفینہ بناتا ہے۔ لیکن یہ سفینہ دریا پار نہیں کر سکتا۔

آب رنگ ۔ عظمتِ اقبال (کلیات) جلد اول
ISBN:969-8483-39-X

اہتمام:
ایچ اے شیرازی
میاں جاوید اقبال ارائیں ایڈووکیٹ
اشاعت اوّل: 2004ء
ٹائٹل: ریاض
کمپوزنگ: اعظم علی شاہ
مطبع: انتخاب جدید پریس، لاہور
ناشر: ملٹی میڈیا افیئرز
قیمت: 650 روپے
$: 40
£: 30
€: 35

MULTI MEDIA
AFFAIRS

21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54500, Pakistan.
Tel: (92-042) 7356454 Mobile: 0333-4222998
E-Mail:multimediaaffairs@hotmail.com

اپنے مرحوم و مغفور والدین کے نام

بیدلؔ من و گرد سحر و قافلۂ رنگ
رفتیم بجائے کہ بجائے نرسیدیم

قرینہ

آبِ رواں

گل آفتاب

رطب و یابس

غبار آلود سمتوں کا سراغ

سرِ عام

عیب و ہنر

عرضِ ناشر

قارئین کرام! اگر آپ نے اپنی گونا گوں مصروفیات اور مشاغل میں سے مندرجہ ذیل چند معروضات کے لیے کچھ لمحات مختص کر لیے تو یقیناً آپ ایسا محسوس کریں گے کہ ظفر اقبال کے فن اور شخصیت سے متعلق کئی جہات، نکات اور اہم معلومات کو فروگذاشت کر دیا گیا تھا، تاہم میں تمام تر محوّلہ امور سے کماحقہٗ واقف ہوں کہ ظفر اقبال کے شعری کلیات بہر کیف اُن کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالے سے محظوظ ہونے چاہئیں۔ اوّل یہ کہ میں بطور ناقد دلائل اور دعاوی کے بجائے فقط ناشر کی سطح پر رہ کر چند قابلِ ذکر باتیں عرض کرنے کا خواہاں ہوں۔ دُوم ظفر اقبال اپنے آپ کو مانتے ہی نہیں، اور مان کر دیتے بھی ہیں تو صرف اس حد تک کہ اگر اُن کی شاعری میں کچھ ہے تو وہ اُن کے مرنے (خاکم بدہن) کے کم از کم پچاس برس سے قبل Explore نہیں ہوگا، اور بالفرض وہ گم نام بھی رہ گئے (جس کے امکانات بقول اُن کے بہت زیادہ ہیں) تو یہ بات اُن کے وارثان کے تئیں اس لیے بھی پریشان کن نہیں ہونی چاہیے، کہ اُن کے خاندان میں بھی کوئی شاعر ہُوا ہی نہیں، اگر وہ بھی نہ ہوئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں آئندہ کوئی بھی جملہ بناتے ہوئے کسی بھی جملۂ معترضہ سے صرفِ نظر کا ارادہ کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب ظفر اقبال نے اُردو غزل کی نئی روایت اور منفرد پیرایۂ اظہار کے احیا کی خاطر موضوعی، معروضی، لسانی اور معنوی طریق پر تخلیقی تجربے کا آغاز کیا تو دُنیائے شاعری نے اُنھیں تہِ دل سے خوش آمدید کہا، اور گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران اُنھوں نے ریاضتِ خونِ جگر کے عوض واقعتاً حق حلال کی داد و تحسین کمائی۔ اُنھوں نے نہ تو غیر سنجیدہ نوجوان طبقے کے جذبات سے اٹکھیلیاں کر کے نام نہاد شہرت حاصل کرنی چاہی، نہ فلمی نغمے، قوالیاں، ترانے اور مابعد الطبیعاتی شاعری کرنے کا پیشہ اختیار کیا، اور نہ ہی کسی منصوبہ بندی کے تحت عوامی یا درباری تقاضوں کے مطابق شعر گوئی کی۔ بلاشبہ ظفر اقبال نے تو بس ہمہ وقت اپنا تخلیقی فریضہ انجام دیا۔ نتیجتاً رائٹرز ایسوسی ایشن لاہور کے زیرِ اہتمام اور ملٹی میڈیا افیئرز

کی جانب سے "اب تک" کی صورت میں معیار اور مقدار ہر دو اعتبار سے فی الوقت تین جلدوں میں کلیاتِ ظفر اقبال پر مشتمل گراں قدر اُردو کلام کو ترتیب دیا جانا، کسی بھی صورت میں نظر انداز نہ کیے جا سکنے والے، اہم، قادر الکلام اور لسان العصر شاعر ظفر اقبال کی خدمت میں خراجِ تحسین ہے۔

اپنے تخلیقی تناظر میں ظفر اقبال کی بے اندازہ، تازہ، چٹکتی، مہکتی اور خوش نوا غزلوں کا تجزیہ ایک خوب صورت شاعری کی حیثیت سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ حال کے ساتھ اُن کا اتنا ہی تعلق ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بسر کر رہے ہیں، اور حال سے اُنھیں شکایت اس لیے بھی نہیں ہے کہ غالب کے زمانے میں بھی اُس کا "حال" ایسا ہی تھا، جس میں استاد ذوق کا ڈنکا بج رہا تھا، جیسے آج ظفر اقبال کے زمانے میں اُن کے معاصر دوست احمد فراز کا ڈنکا بج رہا ہے۔ وہ یہ بھی بہ خوبی سمجھتے ہیں کہ سنجیدہ شاعری آج چند گنے چنے شعرا کے علاوہ کسی کا سروکار یا مسئلہ ہی کب ہے، اس لیے کسی غیر متوقع مایوسی کا اُن کے ہاں کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

"اب تک" کی جلد اول میں شامل دوسرا مجموعہ کلام "گلافتاب" اُردو غزل کی تاریخ میں جہت نما اور عہد ساز صحیفہ ہے، اس کی اشاعتِ اول (1964ء) لسانی تشکیلات کی تحریک کے ہراول دستے میں نمایاں ترین مقام پا چکی ہے۔ البتہ یہاں دو نکتوں کا ذکر ضروری ہے، "گلافتاب" کی اشاعتِ دوم (1995ء) کی ابتدائی نصف غزلیات کم و بیش اُس صورت میں شائع کی گئی ہیں، جیسی ابتداً رسائل میں شائع ہو چکی تھیں، اور جنھیں اشاعتِ اول مرتب کرتے ہوئے ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کے لیے ایک نئی ٹریٹ منٹ دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں ظفر اقبال کی وساطت سے زبان میں جو اصل تبدیلی آئی، وہ "کا" کے بجائے "الف" کا استعمال تھا۔ اُنھوں نے بالخصوص محسوس کیا کہ یوں "الف" کے استعمال سے "کا" یعنی اضافت سے تو چھٹکارا مل جاتا ہے، لیکن بیشتر الفاظ کی معنوی کیفیت برعکس ہو جاتی ہے، جیسے اٹل میں ٹل، امر میں مر اور اٹوٹ میں ٹوٹ کے مفاہیم برعکس صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اشاعتِ دوم میں مزید جو تبدیلی کی گئی ہے، وہ یہ کہ پنجابی زبان میں منقلب کیے جانے والے افعال کو از سرِ نو اُردو قالب میں بحال کر دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ کام پہلے ہی دکنی زبان میں انجام پا چکا ہے۔ گو مذکورہ بالا دونوں نکتوں کو لسانی تشکیلات کے بنیادی معاملات سے زیادہ علاقہ نہیں، نیز ہر ادیب، شاعر کو اپنی تصنیف یا تجربے پر نظرِ ثانی کا حق تادمِ آخر حاصل رہتا ہے۔ بہ ہر حال "گلافتاب" کی موجودہ صورت میں بھی لسانی تجربات بدستور اپنی بنیاد پر قائم ہیں۔ بلاشبہ ظفر اقبال نے لسانی تشکیلات کے عمل کو معنوی

اُسلوب نہیں بننے دیا، بلکہ اسے معنوی تشکیلات سے ہم آہنگ کر دکھایا۔ اُن کی ہر غزل کا ہر شعر عروض، معروض، انداز اور تجربے کا غیر مختتم سلسلہ ہے، یہی ارتقائی اور ارتفاعی طرزِ احساس ظفر اقبال کو اپنے عہد کا ایک اہم اور بڑا شاعر ٹھہراتا ہے۔ ہاں، ایک اور قابلِ توجہ بات! ظفر اقبال کا مؤقف یہ ہے کہ لسانی تشکیلات کے عمل میں رموزِ اوقاف و اعراب نگاری (Punctuation) سے کنارہ کشی، اجتناب یا اغماض برت کر ہی لفظیات، جملے، مصرعے اور اشعار کے نت نئے تشکیلی امکانات اور لامحدود معنویت تک رسائی ممکن ہے۔ اس کے باوجود میں نے اُردو ادب کے طلبائے علم اور سنجیدہ قارئین کی سہولتِ قرأت و تفہیم کے لیے ان غزلیات پر بھی رموزِ اوقاف و اعراب نگاری کا کام انجام دیا ہے۔ مزید برآں تخلیقی تجربے پر یقینِ کامل رکھنے والے باشعور قارئین ان رموزِ اوقاف و اعراب نگاری سے صرفِ نظر کر کے موضوعات و معانی کے جہان ہائے دیگر کی سرحد پار کر سکتے ہیں۔

ظفر اقبال کی شاعری اپنے نقطۂ نظر اور مقصدیت کے تناظر میں، اپنے معاصر ادبی رویوں پر سیر حاصل عمرانی و ادبی تنقید کے فرائضِ منصبی سے بھی عہدہ برآ ہوئی ہے۔ یہ شاعری اپنے دیگر اختراعی و تخلیقی محاسن کے علاوہ تعلّی کے بجائے عجز، کم مائیگی کے بہروپ میں اعلیٰ مہارت، اور معصومیت کے نام پر تبلیغِ دانش کی بے نظیر مثال قائم کرتی ہے۔ ظفر اقبال نے اُردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی خاصا ادب تخلیق کیا، متعدد غزلیں، نظمیں لکھیں، اُن کی پنجابی غزلوں کے دو مجموعے "ہرے میرے" اور "کال بلیندی" کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں اور دیگر ہیئتوں یا اصناف میں بھی اچھا خاصا مواد تخلیق کیا ہے، جب کہ اُن کے تنقیدی مضامین کا کلیات بعنوان "حالا غرما بشنو" بھی موجود ہے، اور اُن کے تحریر کردہ لاتعداد صحافتی، سیاسی، سماجی، ادبی، مزاحیہ اور خیال افروز کالم بھی ریکارڈ پر ہیں، یہ سب کچھ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ظفر اقبال کے ہاں فکری یا فنی جمود کا کوئی تصور نہیں۔ وہ کسی بھی یکساں موضوع، تکنیک اور اندازِ بیان پر اکتفا یا تکیہ نہیں کرتے۔ اُن کی ہر غزل یا تو اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت میں اضافے کا باعث ہے، یا پھر کسی نہ کسی جدید روایت کے قیام کا محرک۔

ظفر اقبال کے ہاں تنوع کا عالم یہ ہے کہ جلد اول کے حصوں کے چھے مجموعے کسی نہ کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا تخلیقی کام بیشتر اکیڈمک ہے، اور کچھ زیادہ پھیلا ہوا بھی۔ اینٹی غزل اور لسانی تشکیلات کے متوازی دوسری جلدوں کا امتیاز یہ

ہے کہ ان میں تین مجموعے تو موضوعی ہیں۔ دوسری جلد میں شامل ایک مجموعہ "ہے ہنومان" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے منسوب ایک قول کے مصداق: "اس صدی کی سب سے زیادہ زیرِ بحث رہنے والی کتاب ہوگی۔" جب کہ تیسری جلد کا پہلا مجموعہ "تجید" حمدیہ غزلوں پر مشتمل ہے، انھیں قطعی منفرد اُسلوب کی حمدیں کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعنوان "تقویم" مجموعے میں حیات و کائنات اور عناصرِ اربعہ کے موضوعات بروئے کار لائے گئے ہیں۔ مجموعہ بعنوان "تساہل" میں دس دس، بارہ بارہ اشعار کے سیٹ بنائے گئے ہیں، جب کہ ہر سیٹ میں ذرا سے ردّ و بدل کے بعد ایک ہی زمین کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھی جلدوں میں لگ بھگ ڈیڑھ ڈیڑھ سو اشعار پر مشتمل پانچ طویل غزلیں بھی شامل ہیں، عجب یہ کہ ان طول طویل غزلیات میں بھی قافیے کی تکرار دستیاب نہیں ہوتی۔ مزید برآں طویل غزلیات کے علاوہ ہر غزل نو اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ التزام پہلی جلد کے غُرف مجموعے "رطب و یابس" اور "عیب و ہنر" میں بھی رکھا گیا ہے، جب کہ پہلے نو مجموعوں کے بعد والے نو مجموعوں میں (یعنی دسویں سے اٹھارھویں مجموعے تک) ہر مجموعہ، طویل غزلوں سمیت، 121 غزلوں پر مشتمل ہے۔ ظفر اقبال کے ہاں فنی، تکنیکی اور دیگر کئی زاویوں، سطحوں، پرتوں، سمتوں کے اعتبار سے بہت سے التزامات، قرینے، ترجیحیں، تراکیب شعوری اور لاشعوری ہر دو طریق پر دستیاب ہیں۔

بہت سے اسباب موجود ہیں، جن کی بنا پر ظفر اقبال کو بجا طور پر شاعر الشعراء کہا جاتا ہے۔

ظفر اقبال سے متعلق چند روایات یہاں رقم کرنا ضروری سمجھتا ہوں: اُن کے ایک ہم عصر عادل منصوری نے پندرہ برس پہلے لکھا تھا: "جدید غزل شروع کہیں سے بھی ہوئی ہو، ختم تم پر ہو رہی ہے۔" اسی طرح ایک اور بھارتی شاعر پریم کمار نظر نے ایک خط میں ظفر اقبال کو لکھا کہ یہ ایک عجب "فنامینا" ہے کہ آپ نے بہ یک وقت تین نسلوں کو متاثر کیا ہے: ایک نسل جو ختم ہو گئی ہے، اُس کو ۔۔۔ اور ایک نسل جو ختم ہو رہی ہے، اُس کو ۔۔۔ اور ایک نئی نسل جو شروع ہو رہی ہے، اُس کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ میں نے سُن رکھا ہے کہ اُن کے دوست افتخار عارف کہا کرتے ہیں: "ظفر بھائی! بات کچھ بھی نہیں ہوتی اور آپ شعر بنا دیتے ہیں، جب کہ یار لوگوں کے ہاں بات تو بے شک ہوتی ہوگی، لیکن شعر نہیں بنتا۔" یوں ہی جیلانی کامران نے "غبار آلود سمتوں کا سراغ" کو ظفر اقبال کا ماسٹر پیس قرار دیتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب دیوانِ غالب کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ مجھے آفتاب اقبال نے بتایا تھا کہ انھیں فون پر گفتگو کے دوران میں شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ میر کے بعد ظفر اقبال ہی ہیں، اور جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ 35 برس سے پورے برِصغیر میں ظفر اقبال کے رنگ میں غزل کہنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گو ایسے کلمات سُن کر ظفر اقبال ولولہ خیزی یا Excitement میں نہیں، بلکہ عجز میں مبتلا ہو کر جواباً سمجھانے کی تدبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب اُن کے چاہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں، اس لیے ان تبصروں میں سے، یعنی سو میں سے اگر پیار محبت کے نمبر نکال دیے جائیں تو وہ زیادہ سے زیادہ پانچ نمبروں کے مستحق ٹھہرتے ہیں، اور وہ بھی بہت کھینچ تان کر۔

آپ کی طرح میں بھی یہ خوب جانتا ہوں کہ ظفر اقبال نے نوخیز شاعروں کی جس طرح حوصلہ افزائی کی اور اپنے سینئر ہم عصروں کا جس طرح کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، وہ ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں، اُن کا ایمان ہے کہ دوسرا جس جائز تعریف کا حق رکھتا ہے، وہ ضرور ادا ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ اعتراف آپ پر فرض ہے، بلکہ آپ کے پاس ایک امانت ہے، جس میں خیانت نہیں کی جانی چاہیے۔ بقول ظفر اقبال:

انکار دُوسروں کی حقیقت سے ہو جسے
دُنیا میں اُس کا اپنا فسانہ کہیں نہیں

میں نے کئی مواقع پر ظفر اقبال کو یہ کہتے سُنا ہے کہ حسد اور تنگ نظری کے رویّے سے خود اپنا ہی نقصان ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ آپ کے تخلیقی کام میں برکت ہی باقی نہیں رہتی، اس لیے جس کا جو حق ہے، اُس کو دینا چاہیے۔ وہ اس سلسلے میں بائبل کے اس قول کا حوالہ بھی اکثر دیا کرتے ہیں: "جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو ۔۔۔ اور جو خُدا کا ہے، وہ خُدا کو ادا کرو!" لیکن اگر آپ اپنے کلام یا رائے کو باقاعدہ بیچنا شروع کر دیں، جو کہ اپنی اولاد ہی کو بیچنے کے مترادف ہے، تو آپ کے کلام میں سے تاثیر اُٹھ جائے گی، اور یہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر بات: "طبعِ رواں، منظرِ معنی، اور بے شمار امکان" کے عنوان سے شمس الرحمٰن فاروقی نے 1997ء میں "کلیاتِ ظفر اقبال" کے لیے دیباچہ سپردِ قلم کیا تھا، جو بہ مشکل "ہے ہنومان" تک کی غزلیات کا احاطہ کرتا ہے، حال آں کہ اس سے اگلے نو شعری مجموعے بھی ان کلیات میں شامل ہیں، یعنی "اب تک" کی ان تینوں جلدوں میں جتنے بھی دیباچے اور فلیپ شامل ہیں، وہ ظفر اقبال کے مجموعی تخلیقی عمل کا کلّی طور پر محاکمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یقیناً یہ کام اگلی نصف صدی میں کسی بھی وقت مکمل ہو جائے گا۔ میں نے کلیات کے فلیپ بھی اپنی خاطر

طبعِ رواں، منظرِ معنی، اور بے شمار امکان

ظفر اقبال کو ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ متنازع فیہ شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب متنازع فیہ ہونا زندگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی وہی شخص تو معرضِ بحث اور معرضِ سوال میں آئے گا، جو لوگوں کو تشویش، تفکّر یا مسرت سے دوچار کرے۔ مکمل اتفاق تو موت ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن آج کے ماحول میں لوگ بوجوہ زیادہ محتاط یا زیادہ عافیت پسند ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں کہ وہ خود اپنے لیے عافیت طلب کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہ اُن لوگوں کے بارے میں اُن کی رائے فوراً خراب ہو جاتی ہے، جو عافیت طلب نہ ہوں یا عافیت میں نہ ہوں۔ (اگر وہ اچھا آدمی ہوتا تو منکٹ میں کیوں پڑتا؟) آج کا فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص معرضِ بحث میں ہے، وہ کسی حد تک نامعتبر اور کسی حد تک خطرناک آدمی ضرور ہوگا۔ ظفر اقبال بہت دن سے موضوعِ بحث (زیادہ تر مُخالفانہ بحث) رہے ہیں۔ لیکن اُن کا پہلا کمال تو یہی ہے کہ چالیس پچاس برس کی مدّتِ شعر گوئی نے بھی اُن کی اس صلاحیت کو کُند نہیں کیا ہے۔ وہ نہ ایک کل بیٹھتے ہیں اور نہ اپنے پڑھنے والے کو ایک کل بیٹھنے دیتے ہیں۔ بعض لوگ اُسے غیر سنجیدگی سمجھتے ہیں (اور غیر سنجیدہ آدمی معتبر کیسے ہو سکتا ہے؟) بعض لوگ اُسے غزل کے خلاف دہشت گردی سمجھتے ہیں (خدا ہم سب کو حفظ و امان میں رکھے۔) بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ظفر اقبال ایک عرصے سے غزل گوئی ترک کر کے ہزل گوئی، یاوہ گوئی، مُہمل گوئی کی مشق کر رہے ہیں۔ (غزل کو بہو بیٹیوں والی چیز ہمارے بزرگوں حالی، حسرت وغیرہ نے ہزار مشکل سے بنایا تھا، اس کی بُری عادتیں چُھڑوائی تھیں۔ اب ظفر اقبال اس کا کردار پھر بگاڑ رہے ہیں۔) لوگ یہ بُھول جاتے ہیں کہ: (۱) ظفر اقبال کی ہزل گوئی وغیرہ بھی انتہائی سنجیدہ چیز ہے۔ (۲) اُن کے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اور (۳) ظفر اقبال جو کچھ کر رہے ہیں، یا جو کچھ انھوں نے کیا ہے، وہ کسی نہ کسی شکل میں ولی، سراج، میر، سودا، انشا، ناسخ، غالب نے بھی کیا ہے۔ اس فہرست میں اور بھی نام آ سکتے ہیں، میں نے صرف بالکل سامنے کے ناموں پر اکتفا

لکھوانے ضروری جانے تاہم یہ خصوصیت ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ "اب تک" کے عنوان سے فی الحال تین جلدوں میں شائع ہونے والی یہ کتاب، آئے روز طباعت کے مراحل سے گزرنے والی سرسری، تجارتی تصانیف سے قطعی کوئی علاقہ نہیں رکھتی، کیوں کہ "کلیاتِ ظفر اقبال" نہایت غیر معمولی تخلیقی رویّوں، لسانی تشکیلات، رنگا رنگ موضوعات اور اصطلاحات و اسالیب ساز معنویتوں پر مبنی ہے۔ بالآخر "اب تک" آپ تک پہنچ چکی ہے، یُوں ملٹی میڈیا امیجز جیسے سنجیدہ، منتخب اور مقصدی اشاعتی ادارے کا بڑا، اہم منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس عظمت آثار شاعری کی تخلیق جہاں جناب ظفر اقبال کا کارنامہ ہے، وہاں اس کے لیے اشاعتی امور کی انجام دہی میرے لیے واقعتاً باعثِ اعزاز ہے۔ یہ عرض داشت میں نے کلیات کی طباعت کے دوران مختصراً مگر پوری ذمہ داری سے رقم کی ہے۔ افسوس کہ جناب ظفر اقبال سے اس کی منظوری بھی حاصل نہ کر سکا۔ شاید اس میں بھی مصلحتِ ایزدی شامل ہو، ورنہ یہ کٹ کٹا کر ایک آدھ صفحے جتنی رہ جاتی، اور اُلٹا ڈانٹ بھی پڑتی۔

درحقیقت جناب ظفر اقبال کی شاعری نہ صرف بیسویں صدی کی متنازع اور اکیسویں صدی کی مُسلّمہ شاعری ہے، بلکہ انھیں بجا طور پر اُردو غزل کا دبستانِ جدید گردانا جا چکا ہے۔

اظہر غوری

ستمبر 2004ء

کیا ہے۔

ایک مشکل یہ ہے کہ خود ظفر اقبال غزل میں اپنے انقلابی اور احیائی کردار کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ کبھی وہ غزل کو نظم کے مطلعے کی چیز منوانے کی بات کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ خود غزل کو پسند ہی نہیں کرتے۔ شاعر کے کلام سے گواہی لانے کے بجائے اُس کے بیانات اور دعاوی سے گواہی لانے کی رسم، ہمارے یہاں بہت پُرانی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم شعر سے استدلال لاتے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ظفر اقبال نے غزل کے بارے میں اِدھر اُدھر جو باتیں کہی ہیں، لوگ اُنھیں ہی ظفر اقبال کا کلام سمجھ لیتے ہیں۔

دُوسری مشکل، جو بڑی مشکل ہے، یہ ہے کہ لوگ ظفر اقبال کا مطالعہ حاؔلی، حسرؔت اور فاؔنی کی غزل اور شعریات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یہ غزل اور یہ شعریات ظفر اقبال کو سمجھنے کے لیے نہ صرف ناکافی ہے، بلکہ مُضر بھی ہے۔ حسرت موہانی نے غزل کے لیے جن باتوں کو لازم قرار دیا ہے (اور جن کا اتباع اندھا دھند کیا گیا، اور جو آج بھی بڑی حد تک جاری ہے) اُن میں سے اکثر باتیں کلاسیکی غزل کی شعریات سے بے خبری، اُس کے اکثر تصورات کی ناقدری، اور اُنیسویں صدی کے بعض تنگ خیال اساتذہ، اور حالی کے رائج کردہ شعریات پر مبنی تھیں۔ اُن کے برخلاف، ظفر اقبال کی غزل "روایتی غزل" سے باغی ہے اور غزل کی اصل روایت سے اپنا رشتہ اُستوار کرتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معاصر ذہن اور فکر کا اظہار کرتی ہے۔ زبان کے بارے میں اُس کا رویّہ ہمیں بعض جگہ جارحانہ اور "غیر شاعرانہ" محسوس ہوتا ہو تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ظفر اقبال کی غزل پٹڑی سے اُتری ہوئی ہے، بلکہ یہ کہ ہماری تنقید اور غزل کے بارے میں ہماری فکر کلاسیکی صراط مستقیم سے ہٹ کر "شاعرانہ زبان"، "غزل کی زبان"، اور "تغزّل" کی بے معنی وادیوں میں گم کردہ راہی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ کم لوگوں کو اس بات کا یقین آئے گا کہ "تغزّل"، "شاعرانہ زبان"، "غزل کی زبان"، "غزلیت" جیسی اصطلاحیں ہمارے تذکروں میں نہیں ملتیں، اور تذکرے تو تذکرے ہیں، اُردو شاعری کے سب سے پہلے اور مؤثر جدید کار محمد حسین آزاد کی "آب حیات" میں بھی ان اصطلاحوں کا وُجود نہیں۔ یہ اصطلاحیں (اگر انھیں "اصطلاح" جیسے موقر نام سے پکارا جائے) بیسویں صدی کے شروع کی دہائیوں میں انگریزی کی Lyric کے تتبع اور نقل اور جواب میں ایجاد کی گئیں۔ جب ہماری غزل کے بارے میں اعتراض ہُوئے کہ اس میں "از دل خیزد بر دل ریزد" والی بات نہیں ہے۔ بلکہ "خیالی طوطا مینائوں" کی اُڑانیں ہیں، تو کہا گیا ہے کہ نہیں، غزل تو دراصل ذاتی واردات اور داخلی تاثرات کا اظہار ہے۔ انگریزی میں Lyric سے مُراد لیتے تھے، ایسی نظم یا کلام منظوم جس میں شاعر اپنے واردات بیان کرے اور اُس کا مخاطب وہ خود ہو، کوئی اور شخصِ واحد اور یا کوئی مجمع نہ ہو۔ بیسویں صدی کے شروع میں ہمارے نقادوں نے مفروضہ قائم کیا کہ غزل بھی ایسی ہی شاعری ہے۔ اور جس طرح Lyric کی صفت Lyricism ہے، اُسی طرح غزل کی صفت "تغزّل" ہے۔ غزل اور قصیدے کا فرق بھی اسی مفروضے کے تحت یُوں بیان کیا گیا ہے کہ قصیدے میں "شکوہِ الفاظ" ہوتا ہے، اُس کا کوئی مخاطب ہوتا ہے۔ غزل کا کوئی مخاطب اصلاً نہیں ہوتا ہے، اور غزل میں "نرم و نازک، سُبک، شیریں" الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُن لوگوں نے مومن کے ــ یاد ایام عشرت فانی، اور غالب کے ــ صبح دم دروازۂ خاور کُھلا اور ــ ہاں مہ نو سُنیں ہم اُس کا نام، جیسے قصیدے نہیں پڑھے ہوں گے۔ ورنہ وہ اس بات پر اصرار نہ کرتے کہ قصیدے میں لازماً گھن گرج والے پُر شکوہ، ڈھول تاشے کے مزاج سے ہم آہنگ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ غالؔب کے مؤخر الذکر قصیدے کے بارے میں طباطبائی جیسے سخت گیر اور غالب کے خلاف تعصّب رکھنے والے نقاد نے لکھا ہے کہ "اس سارے قصیدے میں عموماً...... مُصنّف نے اُردو کی زبان اور حُسنِ بیان کی عجب شان دکھائی ہے۔" پھر لکھتے ہیں کہ "میری نظر میں یہ قصیدہ، خصوصاً اس کی تشبیب، ایک کارنامہ ہے مُصنّف مرحوم کے کمال کا، اور زیور ہے اُردو کی شاعری کے لیے۔ اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شرُوع ہوئی ہے، اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی"۔ (ملحوظ رہے کہ طباطبائی نے اُردو زبان اور حُسنِ بیان کی شان کی بات کی ہے، اور تشبیب کی تازگی مضمون و اسلوب کا ذکر کیا ہے، شکوہِ الفاظ اور بانگِ دُہل کی بات نہیں کی ہے۔) یہ بھی نہ بھولیے کہ اکثر قصیدوں کی طرح اس قصیدے کے اندر بھی ایک غزل موجود ہے۔

اب رہی غزل، تو جن لوگوں نے "نرم و نازک، سُبک، شیریں الفاظ" کی شرط اس کے لیے لگائی تھی، وہ لسانیات کے اس اُصول سے تو ناواقف تھے ہی، کہ کوئی لفظ اصلاً نرم و نازک، سُبک، شیریں وغیرہ نہیں ہوتا، بلکہ اُس کا محلِ استعمال اُسے ان صفات سے متصف کرتا ہے۔ اُنھیں غزل اور قصیدے کی تاریخ سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ ورنہ وہ فارسی میں منوچہر اور قاآنی جیسے قصیدہ نگاروں سے واقف ہوتے اور اُردو میں آبرو، ناسخ، غالب، انشا، سودا، میر، جیسے شُعرا کی زبان کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوتے کہ اُن کی زبان ہر جگہ بہت "نازک" اور "سُبک" ہے۔ عربی کی تراکیب اور الفاظ کے بارے میں ہمارے یہاں یہ خیال عام ہے کہ اُن کا آہنگ ہماری

زبان کے آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں نے کسرۂ اضافت تو قبول کر لیا، لیکن عربی کا الف۔ لام نہ ہضم کر پائے۔ اس کے باوجود میرؔ کو الف لام والی اضافتوں کو برتنے اور خاصی کثرت سے برتنے، اور عربی الفاظ اور فقرے غزل میں نظم کرنے سے کوئی عار نہ تھا۔ عربی کو اردو میں حل کرنے کی روایت (میں محض نظم کرنے کی نہیں، بلکہ حل کرنے کی بات کہتا ہوں) ہمارے یہاں اقبال کی غزلوں تک آئی ہے۔

نئے اور انوکھے یا نامانوس الفاظ، یا پڑوسی زبانوں کے الفاظ بقدر ضرورت یا بقدر شوق استعمال کرنے کی رسم ہمارے یہاں چھ سو برس سے رائج تھی۔ گجری اور دکنی (یعنی قدیم اردو) کے چند صفحات کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دے گا۔ پھر ولیؔ اور سراجؔ تک آتے آتے زبان کم پیچیدہ اور موجودہ طرز کے مطابق ہو چلی تو غیر زبانوں اور عربی کی آمیزش کا چلن کم نہ ہوا، بلکہ اس کے طرز میں ذرا زیادہ نفاست آ گئی۔ ولیؔ اور سراجؔ اور جعفر زٹلی کو پڑھنا ہمیں غواصیؔ اور نصرتیؔ اور محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں سہل معلوم ہوتا ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ اول الذکر کی زبان میں وہ حرکی طباعی (dynamic creativity) اور خلاقانہ طور طریق نہیں ہیں، جو مؤخر الذکر کی زبان میں نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ جعفر زٹلی، ولیؔ، سراجؔ، آبروؔ وغیرہ کی زبان میں الفاظ کی وہ شکلیں زیادہ ہیں، جو آج مروج ہیں۔ ورنہ الفاظ تازہ کی درآمد کے سلسلے میں یہ لوگ بھی کم و بیش گجری اور دکنی والوں کی طرح باہمت اور مہم جو ہیں۔ شاہ حاتمؔ نے ایک حد تک اس تازہ کاری کو بند کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کسی نہ کسی شکل میں ناسخ بلکہ غالب تک باقی رہی۔ نیا زمانہ آتے ہی آتے شاعر پر یہ پابندی لگ گئی کہ وہ اپنی زبان کو اس منزل سے آگے نہ بڑھنے دے، جہاں غالب اسے چھوڑ گئے تھے اور غالبؔ خود اس بات پر اصرار کرنے لگے تھے کہ فارسی الفاظ و تراکیب وہی استعمال ہوں، جن کی سند ایرانی اہل زبان سے مل سکے۔ انگریزی وغیرہ کے نئے الفاظ لائے تو جائیں (انھوں نے لکھا ہے کہ ایسے الفاظ کا استعمال مجھ کو پسند ہے، اور مزہ دیتا ہے) لیکن دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ محاورۂ شاہ جہان آباد کا تتبع کیا جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک نوبت بایں جا رسید کہ جدید عہد کے سب سے بڑے شاعر اقبال کی زبان پر اعتراضات ہونے لگے۔ فلاں ترکیب غلط ہے، فلاں استعمال خلاف محاورہ ہے، فلاں فقرہ غیر فصیح ہے، وغیرہ۔ پھر کیا تعجب کہ "گلافتاب" (۱۹۶۶ء) میں ظفر اقبال کو لکھنا پڑا کہ "اصولاً یہ پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ یہ تازہ

خون اردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دور کرنے کے لیے ضروری تھا...... اب میں سانس لے سکتا ہوں"۔ اپنے پہلے مجموعے "آب رواں" (۱۹۶۲ء) کو ظفر اقبال نے "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" اپنے لیے الگ بنانے سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن وہاں بات کا پہلو لسانی تشکیلات کی طرف اتنا زیادہ نہیں، جتنا دنیا کو دریافت کرنے اور بیان کرنے کے سفر کی صعوبتوں کی طرف تھا۔ "گلافتاب" میں شاعر نے خود کو دریافت کرنے اور بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس مہم میں اس نے سب سے زیادہ کام زبان سے لیا۔ زنگ آلودہ زبان اور مختلط اسالیب کی حابس فضا سے نفرت اس کتاب میں قدم قدم پر نمایاں ہے۔

"گلافتاب" کے اول ایڈیشن میں سرنامے کے طور پر کوئی شعر نہ تھا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۹۵ء) میں مندرجہ ذیل شعر کو سرنامہ بنایا گیا ہے:

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

یہ شعر "رطب و یابس" (اولین اشاعت الہ آباد 1970ء) سے لیا گیا ہے، یعنی "گلافتاب" کی تصنیف کے وقت اس کا وجود نہ تھا۔ یہ شعر ہے تو بالکل حسب حال، اور میرا خیال ہے، وقت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ ظفر اقبال نے زبان کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو مومنؔ کے مطلع میں باد صبا نے زلف یار کے ساتھ کیا تھا (بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی) لیکن اس شعر کو، جو کتاب کی تصنیف کے وقت موجود نہ تھا، اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا سرنامہ بنانے میں تھوڑی بہت معذرت، تھوڑے بہت دفاعی انداز کی جھلک تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے تمام مجاہدانہ، سرفروشانہ عزائم اور کارناموں کے باوجود ظفر اقبال محسوس کرتے ہیں کہ "گلافتاب" جیسی غیر معمولی کتاب کو اشاعت کے تقریباً تیس سال بعد بھی ایسی کسی توجیہ، کسی جواز کی ضرورت ہے؟

اگر ایسا ہے تو اس میں ظفر اقبال کی تھوڑی بہت شکست اور جدید غزل کے نام لیواؤں کی بہت بڑی شکست ہے۔ ظفر اقبال کی تھوڑی بہت شکست میں نے اس لیے کہا کہ کام تو انھوں نے اپنا کر ہی دیا۔ انھوں نے غزل کے تقریباً تمام امکانات کو چھو لیا یا ان کی طرف اشارہ کر دیا کہ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں۔ اب اگر ان کا اثر خاطر خواہ قبول نہ کیا گیا تو اس میں ان کا قصور اور ان کی شکست نہیں، بلکہ ہمارے محتاط، کھلیے، کم کوش، مغربی شاعری کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے والے نقادوں، غزل گویوں اور پڑھنے والوں کا المیہ ہے۔ بلراج کومل نے بہت پہلے لکھا تھا کہ

محفوظ، نام نہاد شائستہ زبان کا ذائقہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا، اور افتخار جالب نے اُن سے بھی پہلے اپنے رہنے کی خاطر تھوڑی سی جگہ کے لیے دہائی دی تھی۔ سلیم احمد نے اُن دونوں سے بھی پہلے سودا اور انشا کو دوبارہ دریافت کر کے جدید غزل میں اُن کا نام بلند کیا تھا۔ بلراج کومل کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ خود نہایت محتاط اور ''مہذب'' زبان میں نظم کہتے تھے اور کہتے ہیں، اور اس کے باوجود وہ ''غیر محتاط اور غیر محفوظ'' زبان میں لکھنے والوں کے حق کے لیے نبرد آزما تھے۔

سلیم احمد نے تجربے اور دلاوری کی منزلیں اپنے طور پر طے کیں، پھر وہ ذاتی محرومی اور تیسری دنیا کے المیے اور تاریخ پر مبنی شاعری کی طرف چل پڑے۔ عادل منصوری اور محمد علوی اصولاً اور اصلاً توڑ پھوڑ اور تعمیرِ نو پر عمل پیرا رہے اور ہندوستان میں اُنھیں قبولیت بھی ملی۔ زیب غوری، باقی، شکیب جلالی، بعد میں انور شعور، جمال احسانی اور اُن کے بھی بعد میں افضال احمد سید نے تجربے کو غنیمت قدر کے طور پر قبول کیا، لیکن اُن میں سے کسی کو (زبان کے ممکن استثنا کے سوا) غزل کے مثالی نظریہ ساز اور عمل طراز کی حیثیت نہ مل سکی۔ یہ رتبہ ایک حد تک ظفر اقبال کو ملا، لیکن اُن کی نظریہ سازی اور عمل طرازی کو شیطانی حیثیت حاصل ہوئی، ایمانی نہیں۔

مثال کے طور پر، میرے پاس ایسی غزلیں بغرض اشاعت بہت آتی ہیں جن کے مصنف کہتے ہیں کہ یہ ''ظفر اقبال کے رنگ میں'' ہیں۔ دوسرے رسالوں میں بھی ایسی غزلیں نظر آتی ہیں جن کے بارے میں مصنف کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ظفر اقبال کو اپنا نمونہ قرار دیا ہے۔ لیکن ایسی بیش از بیش غزلیں ظفر اقبال کے اُس انداز کی ہوتی ہیں جن میں زبان اور مضمون دونوں کا انداز ''لفنگے پن'' پر مبنی ہوتا ہے، اور اُس میں تھوڑی سی بھونڈی جنس کی ''چاشنی'' ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان، مضمون، لہجہ، ان میں ظفر اقبال جب بے تکلفی، یا ملنگ پن، یا لفنگے پن یا بلند کوشی اور مہم جوئی کا اظہار کرتے ہیں تو اُس کے پیچھے بڑا گہرا ریاض، اور اُردو غزل کی روایت کا بڑا گہرا عرفان ہوتا ہے۔ آہنگ کی بے ساختہ بوقلمونی، عروض پر کامل دسترس، دوسری زبانوں، خاص کر پنجابی کے شعری آہنگ کا پورا پورا رچاؤ، زبانِ اُردو کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لانے کی بھرپور صلاحیت، یہ سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر ملنگ پن نہیں بلکہ بھونڈا پن، بہادری اور بانک پن کی جگہ تصنع اور بے لطف سہل پسندی، آہنگ کی رنگا رنگی کی جگہ سپاٹ پن اور زبان پر حاکمانہ تسلط کے بجائے تقلید اور امکانات سے لاعلمی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ پھر ظفر اقبال کا مزاج ہے، جو مزاج المومنین کی طرح محتاط اور شرمایا ہوا سا نہیں، بلکہ بے جھجک، بے جھجک ہے۔

اس میں شدید طنز سے لے کر ''اپنا مقصد آپ ہی'' کا معصومانہ رنگ رکھنے والے ظرافت تک کے انداز موجود ہیں اور مایوسی یا شکست یا فریب شکستگی کے عالم میں بھی خود پر ہنس لینے اور اپنا مذاق اُڑانے کی ادا بھی پائی جاتی ہے۔ افتخار جالب نے ظفر اقبال کی ظرافتِ طبع کا ذکر تحسینی انداز میں کیا تھا۔ میں اُس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ظرافت نامنفعل اور ایک طرح کے ''مردانہ'' مزاج کی پیداوار ہے۔ اس کوچے میں قدم رکھنے والے کو انفعالیت سے سروکار نہیں ہوتا، اور اس کی سب سے اچھی مثالیں میر اور ناسخ کے یہاں نظر آتی ہیں۔ (ناسخ کے نام پر چونکیے نہیں، انھیں پڑھ کر دیکھیے اور یہ نہ بھولیے کہ ناسخ بھی معتقدِ میر تھے۔)

دوسری اور شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ظفر اقبال کے مقلدوں اور معاندوں نے اُن کی صرف اینٹی غزل (اگر ہم اس اصطلاح کو آج بھی قائم رکھیں) کو نظر میں رکھا اور ظفر اقبال نے جو اور دسیوں طرح کی شاعری کی ہے، اُسے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ طرح طرح کی زبان اور طرح طرح کے تجرباتی رنگوں پر مشتمل غزل لکھنے والا ظفر اقبال ہر جگہ ایک ہی ہے (جس طرح میر کے ''خراب اپست'' شعر بھی میر ہی کے رنگ کے ہیں، ہماشا کی سطح کے نہیں) لیکن کوئی بھی شاعر ہو، وہ اقبال ہی کیوں نہ ہوں، میر انیس ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی جلوہ گری مکمل قبولیت اور مکمل مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' کو قبول کرنا اور ''رام'' کو رد کرنا یا ''ذوق و شوق'' کو قبول کرنا اور ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کو ترک کرنا، اقبال اور اردو شاعری دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیات بھی ہے اور عالمی و قومی حالاتِ حاضرہ بھی۔ اقبال نہ اس کے بغیر مکمل ہیں اور نہ اُس کے بغیر مکمل ہیں۔ اسی طرح ظفر اقبال کے یہاں فلسفیانہ محرومی بھی ہے، فارسی کی نفاست اور لطافت بھی ہے۔ ٹھیٹ اُردو کی بے تکلفی اور پنجابی کا جارحانہ انداز بھی ہے، ذاتی المیہ اور کائناتی احساس بھی ہے، اور ''ٹکسالی، معیاری اُردو'' بھی ہے، بلکہ فارسی اور ''معیاری'' اُردو کو ظفر اقبال نے جس طرح کامیابی سے برتا ہے، اُس کی مثال آج 1997ء کے زمانے میں بہ مشکل ہی ملے گی۔ اس کو بیان کرنے کے لیے صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ ظفر اقبال کو کلاسیکی محاورے پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ یہ بات تو بہت سے اچھے شاعروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ پھر ظفر اقبال کی تخصیص کیا ہے؟

دیکھنے کی بات دراصل یہ ہے کہ کلاسیکی یا معیاری زبان سے شاعر نے کام کیا لیا ہے؟ یعنی اس کے ذریعے کیا اور کس طرح کے مضمون بیان کیے گئے ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ غزل میں

نئے مضامین کا قحط ہے، اور نئے مضامین ہی کی تلاش نے خیال بندی کو رواج دیا، جس کے باعث ہمیں شاہ نصیر، ناسخ، ذوق اور غالب جیسے شاعر ملے جو "مضامینِ نو" کی تلاش میں آشیان و گلشن سے بہت دور نکل جاتے، حتیٰ کہ واپس نہ آنے کا بھی جوکھم مول لینے کو تیار رہتے تھے۔ نئے زمانے میں بہت سے پرانے مضامین ترک ہوئے، بہت سے قائم رہے۔ بہت سے ترک ہونے کے بعد دوبارہ اختیار کیے گئے، اور بہت سے بالکل نئے تو نہیں، لیکن نسبتاً تازہ مضامین دریافت یا ایجاد ہوئے۔ کلاسیکی محاورے سے رشتہ استوار رکھنے کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ شاعر نے پچھلوں کے خیالات یا استعاروں یا تاثرات کو کس طرح برتا ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں "رطب و یابس" کی وہ غزل تمام و کمال دیکھیں جس کا ایک شعر ظفر اقبال نے "گلافتاب" کے دوسرے ایڈیشن کا سر نامہ قرار دیا ہے:

یقیں کی خاک اُڑاتے گماں بناتے ہیں
مگر یہ طرفہ عمارت کہاں بناتے ہیں
لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساسِ فکر نہ طرزِ بیاں بناتے ہیں
قریب و دُور سے بے جوڑ عکس اشیا کے
تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں
کہ مل سکے نہ ہمارا سراغ ہم کو بھی
بنائے ابر و ہوا پہ مکاں بناتے ہیں
پُرانے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لیے
ہم اپنے سر پہ نیا آسماں بناتے ہیں
نہیں نصیب میں مرنا سوادِ ساحل پہ
جو ڈوبنے کے لیے کشتیاں بناتے ہیں
فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گردِ رنگِ رفتۂ دل
زمیں پہ شامِ طلب کا نشاں بناتے ہیں
وہ جس کی نے پہ لرزتا ہے برگ برگ بدن
اُس ایک رنگ سے نقشِ خزاں بناتے ہیں
ظفر! یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

نو شعروں کی اس غزل کا مفصل تجزیہ مختصر مضمون کے حدود میں نہیں سما سکتا۔ لیکن بعض بنیادی باتیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اس غزل میں ایک محزونی نظمِ کائنات کے سامنے ایک طرح کی بے چارگی اور ساتھ ہی ایک طرح کا طنطنہ اور نخوت بھی ہے، یعنی اس بے چارگی میں رحم طلبی نہیں ہے۔ یہ انداز میر و غالب دونوں کے یہاں ہے۔ غالب کے کلام میں بالکل نمایاں، اور میر کے یہاں اُن کی معمولہ چابک دستی اور قاری فریبی کی اداؤں کے باعث ذرا زیرِ زمیں ہے۔ کلاسیکی شعرا میں سے اکثر کے یہاں یہ صفت کم و بیش مل جائے گی۔ غالب اور میر کی مثالیں سامنے کی ہیں، ورنہ یہ فن اُن سے مخصوص نہیں ہے۔

(۲) اس غزل کا لہجہ کسی معاصر شاعر سے نہیں ملتا۔ ذرا دور جا کر غالب اور ناسخ کو اس لہجے کا اصل نمونہ (Paradigm) کہہ سکتے ہیں۔

(۳) اس غزل میں وہ صفت بہت کم ہے جسے "کیفیت" کہتے ہیں۔ یعنی ان اشعار کا حسن براہِ راست جذبہ انگیزی اور دل پر اثر کرنے میں نہیں، بلکہ ایسے مضامین میں ہے جن کی خوبی ذرا غور کرنے پر سمجھ میں آتی ہے۔ ناصر کاظمی، منیر نیازی، محمد علوی، شہریار، شکیب جلالی، آخری دور کے سلیم احمد، یہ کیفیت کے شعرا ہیں۔ ظفر اقبال، باقی، زیب غوری، بمل کرشن، اشک، عادل منصوری، مضمون کے شعرا ہیں۔ اُن کے ڈانڈے نسیم دہلوی، غالب، ذوق وغیرہ سے ملتے ہیں۔ غالب کے یہاں کیفیت بہت کم ہے، مضمون پر زور زیادہ ہے۔ کیفیت والے شعر عموماً عاشقانہ ہوتے ہیں:

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں
کچھ ہو نہیں گئی غزلِ عاشقانہ فرض

(نسیم دہلوی)

(۴) اس غزل میں بعض باتیں نمایاں ہیں۔ مثلاً شگفتہ فارسیت، ردیف کا ابہام، اس بات کا احساس (یا دعویٰ) کہ غزل کی شعریات میں کچھ بدل رہا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ متکلم کبھی خود پر ہنستا ہے، کبھی رنجیدہ ہوتا ہے۔ یعنی غزل کے متکلم کا تعین دشوار ہے۔ ملاحظہ ہو:

شگفتہ فارسیت: (۱) بنائے ابر و ہوا (بنائے ابر و ہوا پر مکان بنانے میں مزید لطف ہے۔) "بنا" کے ایک معنی "عمارت" بھی ہوتے ہیں۔ یہ مزید علیہ ہے۔ (۲) سوادِ ساحل (دریا/سمندر کی

موج کے لیے بھی "سواد" لاتے ہیں۔ بیدل کا مصرع ہے: چشم ماہی از سواد موج دریا روشن است۔ یہ مزید لطف ہے، یعنی دوسرے مصرعے میں ڈوبنے کا ذکر ہے کہ سواد ساحل پر مرنا نصیب میں نہیں۔ لیکن "سواد ساحل" میں ڈوبنے کا اشارہ پھر بھی ہے۔ (۳) گرد رنگ رفتہ دل (یعنی رنگ دل تو ضائع ہو ہی گیا۔ اب اس کی خاک ڈھونڈ رہے ہیں کہ شاید اڑ کر آسمان کو گئی ہو۔ یہ ترکیب تعریف سے مستغنی ہے☆)۔ (۴) برگ برگ بدن (یہاں "برگ برگ" اور "بدن" کو مضاف، مضاف الیہ، یعنی "برگ برگ" اور "بدن" کے درمیان کسرۂ اضافت فرض کر سکتے ہیں۔ یا پھر "برگ برگ بدن" کو ایک ترکیب سے اضافت فرض کر سکتے ہیں)۔ (۵) نقش خزاں (رنگ کی لے اور پھر اس سے نقش خزاں بنانا حس (Sense) کی مختلف قوتوں کا ادغام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔)

ردیف کا ایہام: یعنی ہم بناتے ہیں (= میں بناتا ہوں)، ہم لوگ بناتے ہیں، وہ لوگ بناتے ہیں۔ بعض شعروں میں تینوں امکانات ہیں۔

غزل کی شعریات: مندرجہ ذیل اشعار میں متکلم اشاعر بعض باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جن کا تعلق غزل کی شعریات سے ہے:

لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساس فکر نہ طرز بیاں بناتے ہیں

قریب و دور سے بے جوڑ عکس اشیا کے
تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اور لفظیات میں تبدیلیوں کے باعث پڑھنے اسننے والوں کو غزل میں نئے ذائقے کا احساس ہو رہا ہے، اور یہ ذائقہ اس قدر اجنبی ہے کہ سننے اپڑھنے والے پر زخم کا سا اثر کر سکتا ہے (غزل کی زبان میں نئے ذائقے کی اساس کا تذکرہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی ایسے الفاظ درج کیے ہیں جن کا استعمال ظفر اقبال نے خاص کامیابی کے ساتھ کیا ہے)۔

☆غنی کاشمیری نے چہرے کے رنگ کو اپنے گھر کی بنیاد قرار دیا ہے۔ (رنگ ریختن = بنیاد ڈالنا):
شکست از ہر در و دیواری بار دگر گردوں
ز رنگ چہرۂ ما ریخت رنگ خانۂ ما را

شعر ۲ میں مضمون یہ ہے کہ ہم مختلف اور دور دراز کی چیزوں کو جمع کر کے (اپنی دنیا کی الوگوں کی) داستان بناتے ہیں۔ اس مضمون پر کولرج کی بھی چھوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

شعر ۳ میں یہ دعویٰ ہے کہ غزل کی زبان کے ساتھ جو زیادتیاں یا آزادیاں ہم برت رہے ہیں وہ دراصل زبان کی تعمیر اور ترقی کا کام ہے۔

متکلم کی شخصیت کا عدم تعین: ظفر اقبال کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ متکلم کا لہجہ کیا ہے۔ یہ بھی کہ ان کا متکلم مختلف شعروں میں مختلف معلوم ہوتا ہے۔ یہ صفت کلاسیکی غزل میں ہے۔ جدید اور قبل از جدید غزل متکلم کی یک رنگی اور وحدت پر زیادہ زور دیتی معلوم ہوتی ہے عندلیب شادانی نے اس بات پر بہت زور صرف کیا ہے کہ غزل کے شاعر کو اپنے ذاتی محسوسات و تجربات ہی نظم کرنا چاہیں۔ وہ قبل جدید غزل گویوں مثلاً حسرت، جگر، فانی وغیرہ سے اس لیے خفا ہیں کہ ان کے کلام میں (بقول شادانی) ذاتی تجربات نہیں بیان ہوتے ہیں۔ ظفر اقبال نے کلاسیکی غزل کو قائم رکھتے ہوئے متکلم کی ہمہ رنگی کو دوبارہ رائج کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

یقیں کی خاک اڑاتے گماں بناتے ہیں
مگر یہ طرفہ عمارت کہاں بناتے ہیں

یہ طے کرنا مشکل ہے کہ فاعل (Subject) اپنی تحسین کر رہا ہے یا اپنا مذاق اڑا رہا ہے۔ یا بیک وقت دونوں ہی کام کر رہا ہے۔

کہ مل سکے نہ ہمارا سراغ ہم کو بھی
بنائے ابر و ہوا پر مکاں بناتے ہیں

مطلع کی گونج یہاں بھی سنائی دیتی ہے۔ صاف کھلتا نہیں کہ اس کام میں چالاکی ہے یا سادہ لوحی۔ میر نے بالکل اخیر عمر میں کہا تھا:

اے میر گھر جہاں میں لڑکوں کے سے بنائے
جب چاہا تب مٹایا بنیاد کیا جہاں کی

(دیوان ششم)

مندرجہ ذیل شعر میں مظلومیت سے محبت پر طنز بھی ہے اور اسے بطور لائحہ حیات بھی بیان کیا گیا ہے:

بُرا نے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لیے

ہم اپنے سر پہ نیا آسماں بناتے ہیں

میر نے بڑا برجستہ شعر کہا تھا کہ غیر کو تو صرف قتل کیا اور مجھ پر ستم بھی کیا، پھر قتل کیا۔ اس صورتِ حال میں تیغوں کا سا تفاخر بھی ہے اور توقیرِ لذتِ آزار بھی، جسے غالب نے عام کیا تھا۔ میر، دیوان پنجم:

غیر کے میرے مرجانے میں تفاوت ارض وسما کا ہے

مارا اُن نے دونوں کو لیکن مجھ کو کر کے ستم مارا

اس پر طرہ یہ کہ میر کا تفاخر ایک گونہ شکایت بھی ہے، کہ مجھ پر بڑے بڑے ظلم کیے۔ زلا زلا کر مارا۔ غالب کی لذتِ آزار میں یک رنگی ہے:

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے

جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

غالب کا ایک شعر "گرد رنگ رفتہ دل" والے شعر کے سامنے رکھیں تو یہی صورت نظر آتی ہے کہ دونوں کے شعروں میں محزونی اور خود پر طنز ہے۔ غالب کے یہاں طنز نمایاں ہے اور ظفر اقبال کے یہاں سعیِ لاحاصل پر محزونی۔ ہاں غالب کا شعر روانی اور ظرافت کی ہلکی سی لہر کے باعث ظفر اقبال کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے:

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے

متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

مندرجہ بالا مختصر تجزیے پر اس غزل کا جائزہ ختم نہیں ہوتا۔ میں نے وقت اور صفحات کا لحاظ رکھتے ہوئے بات یہاں تمام کر دی ہے۔ ورنہ ابھی اُن شعروں کا ذکر تو باقی ہی ہے جو تجزیے میں نہیں آئے، اور خود ان شعروں پر بھی، جو تجزیے میں شامل ہیں، بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اتنی بات تو اب بھی صاف ہے کہ اس غزل میں مضمون و معنی کی جتنی دبازت اور گھنا پن ہے، اور فن کے مختلف پہلوؤں پر جتنی دسترس اس غزل سے نمایاں ہے۔ اس کی مثال کسی اور شاعر کے یہاں آج نہ ملے گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ تو شعری غزل میں کسی اور شاعر کے یہاں تین چار پانچ شعر ایسے ہوں جن میں پیکر اور استعارہ کی تونگری ایسی ہو، فکر اور مضمون کی بلندی اور معنی کا گھنا پن ایسا ہو جیسا ظفر اقبال کے یہاں نو کے نو شعروں میں ہے، لیکن پوری غزل اتنی بلند رتبہ کہیں نہ ملے گی۔

اس پر طرہ یہ کہ غزل کی فضا جدید ہے، لیکن ربط بین المصرعتین، روانی، الفاظ کی مناسبت اور دروبست میں خالص کلاسیکی آداب کی پابندی بھی ہے۔

ظفر اقبال کی اور جدید اُردو غزل کی بدقسمتی یہ ہے کہ ظفر اقبال کو محض "اینٹی غزل" کا شاعر قرار دیا جانے لگا۔ (اس مفروضے کو عام کرنے میں ظفر اقبال کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے، وہ الگ بات ہے)۔ لوگوں نے تعریف یا تنقیص میں ظفر اقبال کے جس رنگ کی تقلید کی یا استہزا کیا، وہ یہی اینٹی غزل کا رنگ تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال کی شاعری کا مجموعی انقلابی رنگ، اور خاص کر زبان کے بارے میں اُن کی جرأت مندی، خلاقی اور طباعی قبول کرنا اور ہضم کرنا اُن لوگوں کا کام نہیں جن کی شعریات "آبِ حیات"، "مقدمہ شعر و شاعری"، "کاشف الحقائق"، "شعر العجم"، "ہماری شاعری"، "معائب سخن" اور طباطبائی کی "شرح غالب" پر مبنی ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو انگریزی شاعری کو فی نفسہٖ اُردو شاعری پر فوقیت دیتے ہیں اور وہ اُردو میں وہی دیکھنا چاہتے ہیں جو اُن کے خیال میں انگریزی میں ہے۔ پنجاب، جہاں اُردو شاعری میں جدیدیت اور جدت کا آغاز اب سے سوا سو برس پہلے ہوا، وہاں بھی "گلافتاب" کو غیر مشروط طور پر قبول نہ کیا گیا۔ رسالوں کے ایڈیٹروں میں ظفر اقبال کی قبولیت کی تاریخ اس سلسلے میں سبق آموز ہے۔

"آبِ رواں" کی اشاعت کے بعد زیادہ تر لوگوں نے محسوس کیا کہ جدید غزل میں تازہ فکری، زبان پر قدرت اور عروض و آہنگ میں بے تکلفی کی ایک نئی مثال قائم ہو رہی ہے۔ "گلافتاب" کے بارے میں ایک بار میں نے لکھا تھا کہ دیوانِ غالب کی اول اشاعت (1841ء) کے بعد اُردو غزل کی تاریخ میں دوسرا انقلابی قدم "گلافتاب" کی اشاعت (1966ء) تھی۔ سچ میں کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ اپنی تمام تر تازگی اور جدیدکاری کے باوجود (بلکہ اس کی وجہ سے) ظفر اقبال کا کلام پنجاب سے باہر کے رسالوں میں بالکل نہ چھپا۔ کراچی کے حلقوں میں ظفر اقبال کو عام طور پر شک، اور خوف اور عدم اعتمادی کے ساتھ دیکھا گیا۔ خود پنجاب کے ایسے رسالے، جن کے مدیران میں حسِ مزاح (یا شائستہ لطیف) کم تھی، ظفر اقبال کا کلام شائع کرنے سے گریز کرتے رہے اور گریز کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اُن کا کلام صرف "شب خون" میں چھپتا تھا اور ہے، اور اکثر اس کے خلاف خطوط اور اعتراضات (غیر سنجیدہ ہے، زبان غلط ہے، غزل کی نزاکت کو غتربود کر دیا گیا ہے) چھپتے رہتے ہیں۔ کراچی کے رسالوں

نے انھیں بہت دیر میں درخورِ اعتنا قرار دیا، اور وہ بھی بڑے تحفظات اور تکلفات کے ساتھ۔

''عیب و ہنر'' میں ایک غزل ہے "مظلوم کی حد تک، معلوم کی حد تک"۔ ردیف و قافیے کی ہی تازگی اس غزل کو کہیں بھی نمایاں مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔ کراچی کے ایک موقر رسالے میں یہ غزل شائع ہوئی تو مدیر نے اس کے چند شعر حذف کر دیے (اور بعد میں اپنے اداریے میں کچھ اعتذار کے ساتھ انھیں چھاپا)۔ ان میں ایک شعر یہ بھی تھا:

سوائے شکوۂ مظلوم خود بھی کچھ کیا ہوتا
خدارا اس طرح مت کیجیے مظلوم کی ہتک

ظاہر ہے کہ دال اور تائے فوقانی کے اجتماع کے بنا پر ''ردیف'' حد تک'' کو ''ہت تک'' پڑھ بآسانی سکتے ہیں۔ لیکن اس امکان پر نظر جانا بڑی خلاقی کی دلیل ہے، اور اس امکان کو بالقوت سے بالفعل بنانا بڑی جرأت کی دلیل ہے، اور اس بات کی بھی، کہ شاعر اپنے بزرگ پیش رووں کے طور طریقوں سے واقف ہے۔ ظفر اقبال نے مزید یہ کیا کہ عربی لفظ ''ہتک'' (بروزن ''ہمک''، جو اردو میں بروزن ''کنک'' ہے) کا پنجابی تلفظ (بروزن ''کب تک'') استعمال کیا، اور اس طرح ''ہت تک'' کی بے معنویت کو معنی بخش دیے۔ ایسے شاعر کو خلاق معانی نہ کہیں تو کیا کہیں۔ لیکن کراچی کے مدیر گرامی کو یہ شعر چھاپنے کی ہمت نہ ہوئی، یا انھیں یہ ''زیادتی'' اچھی نہ لگی۔ کراچی کے ایک خاصے ضخیم رسالے کی تازہ اشاعت میں ظفر اقبال کی ایک غزل کے ساتھ ان کے خلاف تیس صفحے کا مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

ادبی تہذیبوں کا عام اصول ہے کہ زبان جیسے جیسے ترقی کرتی ہے، شعرا کی آزادیاں بڑھتی جاتی ہیں اور وہ زبان کے ساتھ طرح طرح کے تجربے کرتے اور نت نئے طرز برتنے لگتے ہیں۔ فرانسیسی جیسی قدامت پرست زبان بھی لسان (یعنی Langue) کے خلاقانہ استعمال کے سامنے گھٹنے ٹیکتی رہتی ہے اور ہر سال درجنوں الفاظ کے بارے میں Academic francaise کا اعلان باول ناخواستہ شائع ہوتا ہے کہ اچھا صاحب ان ان ''اجنبی'' یا ''غیر مہذب'' الفاظ کو فرانسیسی زبان میں داخل ہونے کا پروانہ دیا جاتا ہے۔ رولاں بارت ڈرتے ڈرتے کہتا ہے، مگر کہتا ہے کہ شاعر زبان کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح بچہ ماں کے بدن سے کھیلتا ہے، اور ضرورت پڑنے پر وہ زبان پر تشدد اور توڑ پھوڑ بھی روا رکھتا ہے۔ لیکن اردو کا معاملہ ہمیشہ سے (نہیں، ہمیشہ سے تو نہیں، لیکن ایک عرصۂ دراز سے) الٹی گنگا بہانے کا رہا ہے۔ یہاں الفاظ کو داخل کرنے کے بجائے خارج کرنے اور الفاظ و قوافی کی تازہ شکلوں کو قبول کرنے کے بجائے رد کرنے اور مردود قرار دینے کو موجب فخر و مباہات قرار دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کا دعوائے استادی اسی بات پر قائم تھا کہ ہم نے اتنے الفاظ متروک قرار دیے ہیں، اتنے فقروں اور تراکیب پر غلط ہونے کا حکم لگایا ہے، اور قافیے کی فلاں فلاں مزید پابندیاں اپنے اوپر عائد کی ہیں، اور فلاں فلاں ''حروفِ عربی و فارسی'' کے دبنے کو معیوب گردانا ہے۔

مصحفی کے زمانے تک یہ صورتِ حال نہ تھی۔ ان سے ایک بار کسی نے کہا کہ آپ نے فلاں جگہ لفظ ''مصحفی'' کی یائے تحتانی دبا دی ہے، درحالے کہ وہ لفظ عربی کا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ خود میرے تخلص (جو اصلاً عربی ہے) کی تحتانی سیکڑوں جگہ ساقط ہوئی ہے۔ کس کو دماغ ہے کہ اسے درست کرے۔ اس زمانے تک ''بہار دامن / مارے دامن'' (درد)، ''زیبائی شمع / منگوائیے شمع'' (قائم)، ''واہ رے میں / بابرے میں'' (انشا) جیسے قوافی، اور ردیفوں میں تصرف (جیسا کہ انشا کی مندرجہ بالا مثال یا ''آئی نہ / آئینہ وغیرہ) معیوب نہ تھے۔ آبرو کے زمانے سے (1685 تا 1733ء) تک قوس / مس، ت / ط وغیرہ کا قافیہ عام تھا، اور ضرورتِ شعری کے تحت عربی فارسی الفاظ کے تلفظ میں تصرف بھی بے دریغ ہوتا تھا۔ یا پھر عربی فارسی الفاظ کو ان کے عام تلفظ کے اعتبار سے نظم کرتے تھے۔ دکنی شعرا کے یہاں تو تصرف، عام تلفظ کی پابندی اور روانی کی خاطر لفظ کے تلفظ میں تبدیلی کرنے کی روش عام تھی۔ دکنیوں کے یہاں زبان میں خلاقانہ تصرف اور آزادی کی اس قدر خوش گوار فضا ملتی ہے، اور تخلیقی جوش کی وہ کثرت نظر آتی ہے کہ مجھے اپنے معاصروں پر ترس آتا ہے کہ کس قدر غیر فطری پابندیوں میں جی رہے ہیں۔ ظفر اقبال اگر ان پابندیوں کو کہیں کہیں اور کبھی کبھی توڑ رہے ہیں تو ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے، نہ کہ شاکی۔ مناسب بات تو یہ تھی کہ ان سے درخواست کی جاتی کہ ھل من مزید؟ لیکن ہم اردو کے ادیب ہی ایسی قوم ہیں جو زنجیروں کو زیور کی طرح قبول کرتے ہیں۔ ورنہ عام بولنے والا تو بے تکلف اپنے رجحان اور زبان کے مزاج کی پابندی کرتا ہے، اور کیوں نہ ہو؟ اس نے ہماری کتابیں پڑھی نہیں ہیں؟

شیکسپیئر کی طرح میر کو یہ بات معلوم تھی کہ زبان کے استعمال میں وہ سب باتیں قابل قبول اور قابل عمل ہیں جنھیں ''اشراف'' ناپسند کریں گے، اور انھیں ''لفنگا پن''، ''قباحت'' سے گراں بار اور ''شرافت'' سے دور قرار دیں گے۔ عام پڑھے لکھے آدمی کی لفظیات بارہ پندرہ سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اوسط درجے کا اچھا مصنف ڈھائی ہزار الفاظ میں گزارہ کر لیتا ہے۔ پھر شیکسپیئر نے چھبیس

ہزار (26000) الفاظ لسان سے برتے ہیں، جب کہ بقول بن جانسن (Ben Jonson)
اُس کا مبلغِ علم Small Latin and less Greek (تھوڑی سی لاطینی اور اُس سے بھی
قلیل یونانی) سے زیادہ نہ تھا؟ ظاہر ہے کہ اگر وہ ہماری طرح قدغنوں میں رہتا تو اتنے الفاظ کا
نصف بھی اُس کو نصیب نہ ہوتا، اور اگر میر ہر لفظ اور فقرے کی منظوری کا پروانہ عربی فارسی کے عالم
سے مانگنے جاتے تو اُن کا بھی ذخیرۂ الفاظ آج کے شعرا کی طرح ہزار دو ہزار الفاظ سے آگے نہ
جاتا۔ اور ایسا نہیں ہے کہ میر پڑھے لکھے نہ تھے۔ قاضی عبدالودود جیسے شخص نے میر کی علمیت کا لوہا
مانا ہے اور اُن کے مقابلے میں سودا کو "جاہل" ٹھہرایا ہے۔ مصحفی اور جرأت کا بھی کلام آج اسی لیے
زندہ اور متحرک معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں بہت نئے الفاظ اور استعارات نظر آتے ہیں۔
افسوس کہ تازگی کا سرچشمہ مصحفی کے بعد سوکھنے لگا، اور ناسخ اور شاہ نصیر کی آنکھ بند ہوتے ہوتے وہ
بالکل ہی خشک ہو گیا۔ غالب اگر فارسی تراکیب کے اس قدر غیر معمولی ماہر نہ ہوتے تو اُن کی
لفظیات بے حد مایوس کن ہوتی۔ لیکن آج کے شاعر کو فارسی اس طرح نہیں آتی اور اُردو کے باہر
مقامی زبانوں سے اُس کا ربط ضبط وہ نہیں جیسا کہ مصحفی اور اُن کے معاصروں تک باقی تھا۔ اُس
وقت کے لوگ اُردو کے علاوہ اودھی یا برج یا پوربی سے (اور اکثر ان تینوں سے) واقف ہوتے
تھے۔ میر اور مصحفی کے یہاں ان کے علاوہ پنجابی کا بھی ہلکا سا لطف ہے۔ پھر فارسی عربی تو اُن
لوگوں کی علمی زبان تھی ہی۔ انشا تو اور بھی کئی زبانوں سے کام لیتے تھے۔ ظفر اقبال نے پنجابی سے
وہی کام لینا چاہا ہے جو میر و مصحفی اور جرأت نے اودھی اور پوربی سے لیا تھا۔ ظفر اقبال کے یہاں
الفاظ کی فراوانی فارسی اور پنجابی کی مرہونِ منت ہے۔ اور اُن کے یہاں مضامین کی فراوانی خود اُن
کی تخلیقی قوت کے علاوہ میر، غالب، مصحفی، انشا، اور نظیر اکبر آبادی کی مرہونِ منت ہے۔

انتظار حسین نے "عیب و ہنر" کے دیباچے میں ظفر اقبال کے کلام کو ٹپکے ہوئے یا درخت پر
پکے ہوئے آموں کی ناند سے تشبیہ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "اچانک میرے تصور نے پیچھے کی طرف
ایک زقند لگائی اور میں اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ گیا۔ بس جیسے رم جھم بارش ہو رہی ہے، ناند
میں بھرے پانی میں تر بتر آم رکھے ہیں۔ میں آم چوس رہا ہوں: ایک کھٹا، دوسرا کھٹا، تیسرا اچھ گلا
ہوا، چوتھا پکی کیری اور پھر جو آم میرے ہاتھ میں آتا ہے تو تالو اور زبان کے بیچ رس گھل جاتا ہے
اور اب مجھے ظفر اقبال کی شاعری میں لطف آنے لگا تھا۔ اب مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس شاعر کو
کیسے پڑھنا چاہیے۔ اب میں دوسروں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی اسے ایسے مت پڑھیے جیسے
اور شاعروں کو پڑھتے ہو۔ ظفر اقبال کی غزلیں ایسے پڑھو جیسے آم کھا رہے ہو۔ ٹیبل پر بیٹھ کر چھری
کے ساتھ قلمی آم نہیں، بلکہ جیسے کھٹے میٹھے دیسی آموں سے بھری ناند آپ کے سامنے رکھی ہے اور
آپ آستینیں چڑھا کر اطمینان سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں۔" اب اس لاجواب نثر کا جواب میں
کیا لکھ سکتا ہوں، لیکن انتظار حسین کی بات سے بات ضرور ملانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں
کہ ظفر اقبال کی غزل پڑھ کر ایک نامیاتی جوش، ایک تخلیقی آبشار کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کی غزل
کی سب سے بڑی (یا سب سے نمایاں) خوبی اُس کا وفور، اُس کی کثرت، اُس کی ہما ہمی اور بھرا پُرا
پن (Plenitude) ہے، جس کے باعث ظفر اقبال کا کلام تخلیقی فطرت کی بے لگام قوت کا
احساس دلاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اُس کے کلام میں اچھا بُرا، پست بلند،
خراب و خوب بے دردی سے رلے ملے ہوئے ہیں اور خراب کی زیادتی ہے، لیکن سب کو ایک
ساتھ قبول کرنا ہوگا۔ اور ہر بار دریافت کے استعجاب کا لطف اُٹھانے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ ایسا
نہیں ہے کہ آموں کے پیڑ کی طرح ظفر اقبال کا کلام کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں۔ ایک ہی ڈال
پر چار آم کھٹے، دو چار کھٹ میٹھے اور ایک دو میٹھے نکلیں گے۔ ظفر اقبال کے کلام میں اچھے بُرے شعر
تاش کے پتوں کی طرح پھینٹے ہوئے نہیں ہیں اور اُن کے قاری کو کھلاڑی نہیں بننا چاہیے کہ جواری
کی طرح ہر بار کسی توقع اور اُمید کے ساتھ گڈی میں ہاتھ ڈالتا ہے کہ اب کی بار لگتا ہوا پتا یا جوکر
ہاتھ آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ظفر اقبال نے خراب شعر نہیں کہے ہیں۔ ضرور کہے ہیں۔ لیکن اُنھوں
نے (عجزِ نظم کے باعث یا لاپروائی کے باعث) غلط شعر نہیں کہے ہیں۔ ہمیں یہ حق تو ہے کہ ہم اُن
کے بعض شعروں کو اپنی ذاتی پسند ناپسند کی روشنی میں مسترد کر دیں۔ لیکن ہمیں یہ بات خیال میں
رکھنی چاہیے کہ ظفر اقبال کی اپنی شعریات ہے اور یہ بڑی حد تک کلاسیکی غزل کی شعریات ہے، اور
اس کی رُو سے ظفر اقبال کے ان ہی شعروں کا جواز بنتا ہے اور ان کی قدر متعین ہوتی ہے جنھیں
انتظار حسین یا دوسرے قاری ناپسند کرتے ہیں۔ ظفر اقبال کے بہت سے شعر حدِ اعتدال سے متجاوز
معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حدود ہے جو حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی
اور فراق گورکھپوری وغیرہ نے مقرر کی تھی، غالب، میر، سودا، انشا، مصحفی، ناسخ اور جرأت نے نہیں۔

انتظار حسین کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ اُن سے اچھا قاری کم ہی آج کے زمانے میں کسی
کو میسر آئے گا۔ وہ جتنے اچھے افسانہ نگار اور نثر نویس ہیں، اُتنے ہی اچھے نقاد بھی ہیں۔ اور کلاسیکی
معاشرے، اُس کی تہذیب، مفروضات اور تصوّر کائنات سے اُن کی واقفیت گہری ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہمیں ظفر اقبال کے کلام میں لطف آتا ہے۔ انھیں اور ہم سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ہمیں ظفر اقبال کے کلام میں hit or miss کی کیفیت نظر آتی ہے تو یہی بات تو لوگ میر کے بارے میں بھی کہا کرتے تھے (اور شاید اب بھی کہتے ہیں)۔ ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ "میر کے یہاں کھیت کھیت پر ایک شعر نظر آتا ہے"۔ میر کے بارے میں یہ بات اب غلط ثابت ہونے لگی ہے۔ ممکن ہے ظفر اقبال کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ مصحفی کو پڑھتے پڑھتے ہم تھک جاتے ہیں، لیکن مصحفی شعر کہتے کہتے نہیں تھکتے (اور شعر بھی ایسے ویسے نہیں، ایسے شعر جو سب کے سب بہت نادر نہ بھی ہوں تو نک سک سے درست ضرور ہوتے تھے۔) ظفر اقبال کی پُرگوئی کے ڈانڈے میر اور مصحفی کی پُرگوئی سے ملتے ہیں۔ ہم اُن لوگوں کے بہت سے شعروں کو ناپسند یا مسترد کر سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان لوگوں کا معاملہ عجزِ نظم یا تخیل کی ناکامی کا معاملہ نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کی پُشت پر ایک باقاعدہ، ترقی یافتہ شعریات ہے۔

یہاں دو بظاہر غیر متعلق لوگوں کا ذکر معاملے کو مزید واضح کرنے کی غرض سے کرتا ہوں:
لوکاچ نے یورپی ناول کا مفصل فلسفیانہ اور ادبی مطالعہ اپنی مشہور کتاب Studies in European Realism میں کیا ہے۔ اسپنڈر سے ایک گفتگو کے دوران اُس نے جوائس اور فرانس کے "نئے ناول" لکھنے والے ناول نگاروں کا ذکر کیا۔ جن کی حقیقت نگاری بظاہر روایتی حقیقت نگاری اور بیانیہ کی نفی کرتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کی عظمت اور اہمیت کا قائل ہے، لیکن کہتا ہے کہ وہ مجھے متاثر نہیں کرتے۔ نہ وہ حقیقت پسند ناول کے لیے نمونے کا کام کر سکتے ہیں، اور نہ زندگی کے بارے میں اُس کے علم میں کوئی اضافہ کرتے ہیں۔ پروست کو وہ پھر بھی بہت پسند کرتا ہے☆۔ دوسری طرف، لوکاچ سے کچھ پہلے فرائڈ نے اپنے زمانے میں تیزی سے مقبول ہوتے ہوئے مصوری کے تجریدی اور "غیر واقعیت پرست" اسالیب پر رائے زنی کی ہے۔ کم لوگوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ فرائڈ نے تخلیقی عمل، مزاج، مصوری وغیرہ کے تعلق سے بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ فرائڈ کو تجریدی مصوروں سے یہ شکایت تھی کہ وہ سیدھی لکیریں نہیں کھینچتے، ہر چیز بگاڑ کر ٹیڑھی میڑھی کر دیتے ہیں۔ لیکن اُس نے یہ بھی لکھا کہ بے شک ایسا کرنا آسان نہیں، اور ٹیڑھی ترچھی لکیروں کو مصوری کا درجہ دے سکنا، اُسی وقت ممکن ہے جب مصور سیدھی لکیر اور معروف رنگ کو برتنے میں پوری طرح ماہر ہو چکا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ مجھے پسند نہیں آتے۔ لیکن ان کی مہارت کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہے۔

کچھ یہی معاملہ ظفر اقبال کے ساتھ بھی ہو تو انصاف کا تھوڑا بہت حق ادا ہو۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ زبان کے ساتھ جو تشدد ظفر اقبال نے کہیں کہیں روا رکھا ہے وہ اسی وجہ سے ممکن ہوا ہے کہ وہ ہمارے زمانے کے سب سے قادر الکلام شاعر ہیں، اور زبان کے روایتی اسالیب و قواعد کو وہ بخوبی برت سکتے ہیں اور اپنے حسب دلخواہ برتتے ہیں بھی۔ زبان اور محاورے میں تصرف وہی کر سکتا ہے جو زبان اور محاورے سے پوری طرح واقف ہو، ورنہ بات ہی نہ بنے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال قدم قدم پر اپنی مہارت اور لیاقت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی طرح، جو لوگ اُن کے یہاں غزل کی "روایتی خوبیاں" دیکھنے میں ناکام رہتے ہیں، وہ لوکاچ کا قول مدِ نظر رکھیں تو انھیں مشکل نہ ہو۔ جوائس کا ناول حقیقت پسندی کی نفی نہیں کرتا، لیکن وہ لوکاچ کے مقصود کی حقیقت پسندانہ تعبیر بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ لوکاچ کے کام کا نہیں، مگر وہ اُس کی اہمیت کا معترف ہے۔ ظفر اقبال کی اہمیت کا اعتراف نہ کرنا خود اعتمادی کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔

حسرت موہانی وغیرہ کے زیر اثر ترویج و فروغ پانے والی غزل کی زبان اور شعریات کو مسترد کر کے ظفر اقبال نے بڑی قربانی دی ہے۔ اگر وہ "آبِ رواں" کی حدود میں رہتے تو معترضین کو موقع کم ملتا۔ لیکن پھر جدید غزل کی وہ توسیع اور جگہ جگہ سے تعبیرِ نو بھی نہ ہوتی جو ظفر اقبال کے ہاتھوں انجام پائی۔ ظفر اقبال آج بھی کم کوش اور کم بیں لوگوں کے لیے فیضان و الہام نہیں بلکہ خوف و انکار کا سرچشمہ ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر اقبال کی تقلید آسان نہیں۔ جس طرح جوائس اور پروست کا ناول بعد والوں کے لیے نمونے کا کام نہ دے سکتا تھا۔ اسی طرح ظفر اقبال کی غزل دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتی۔ جو اُن کی نقل کرتا ہے، منھ کی کھاتا ہے، اور پھر ظفر اقبال پر برستا ہے کہ آپ شاعری کو خراب کر رہے ہیں۔ کردن صد عیب و نہ کردن یک عیب کے مضمرات سے ظفر اقبال کو خوب واسطہ پڑا ہے۔

ظفر اقبال کی زبان کے اتنے چرچے ہیں کہ ہم لوگ اکثر یہ پوچھنا بھول جاتے ہیں کہ ظفر اقبال نے اس زبان کو کن مضامین و موضوعات کے بیان کے لیے استعمال کیا ہے؟ اس زبان سے انھوں نے کیسے پیکر اور استعارے بنائے ہیں؟ اُن کی استعارہ سازی کی قوت کس طرح کی ہے اور کس چیز میں ہے؟ ان باتوں کی طرف تھوڑا سا اشارہ افتخار جالب نے کیا تھا۔ انھوں نے ظفر اقبال کے استعاروں میں "مخفی لسانی مناسبتوں" کے علاوہ کسی اور شے کا نشان باقی نہ رہنے کا

☆ اگرچہ پروست بھی روایتی قسم کا حقیقت نگار نہیں۔

ذکر کیا تھا۔ پھر جہاں تک پیکروں اور استعاروں کے باہم دروبست کا سوال ہے، اُنھوں نے دو غزلوں (۱) "لہو کی سرسبز تیرگی ہے کہ رنگ اُڑتے لباس کا ہے" اور (۲) "میدان تھے جہاں وہاں جنگل ہوئے" کا غیر معمولی تجزیہ پیش کیا تھا اور دکھایا تھا کہ یہاں محسوس اور معقول کے ذریعہ معمولی اور غیر معمولی، جنسی اور روحانی، ہر طرح کے تجربے کو "محسوسات کی ثابت وسالم شکل" عطا کی گئی ہے۔ "گلافتاب" کے بیشتر اشعار کے لیے یہ حکم بالکل دُرست ہے۔ لیکن یہ ظفر اقبال کے اس طرز کی طرف ہمیں منعطف نہیں کرتا جو "آبِ رواں" کی اکثر غزلوں میں جھلکتا ہے، اور "رطب ویابس" اور "غبار آلود سمتوں کا سراغ" کے زیادہ تر شعروں میں اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ اس اُسلوب میں استعارے کی صلابت معقول سے زیادہ محسوس اور تخیل سے زیادہ فکر سے تشکیل پاتی ہے۔ یہاں سب سے پہلی بات معاصر دُنیا کا خارجی سطح پر شعور ہے، جب کہ "گلافتاب" میں یہ شعور زیادہ تر داخلی سطح پر تھا۔ یعنی اب خارجی حوالے زیادہ صاف دکھائی دیتے ہیں، ابہام کم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ باصرہ، شامہ، سامعہ اور لامسہ نے براہِ راست ترسیل کا کام شروع کر دیا ہے:

کچھ کہہ سکو تو گوش بر آواز ہیں درخت
ان جنگلوں میں مرگِ صدا کا خطر نہیں

بکھر کے صد پارہ ہُوا ابر میں اٹکا ہُوا چاند
سر پہ چادر سی نظر آئی شبِ تار مجھے

مجھے دیا نہ کبھی میرے دُشمنوں کا پتا
مجھے ہوا سے لڑاتے رہے جہاں والے

ملا تو منزلِ جاں میں اُتارنے نہ دیا
وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا

پڑے برہنہ سری کو دُعائیں دو کہ یہاں
جنھیں کُلاہ کا خطرہ تھا اُن کا سر بھی گیا

پھر سرِ صبح کسی درد کے دَر وا کرنے
دھان کے کھیت سے اک موج ہوا آئی ہے

کوئی شرر نہ اُٹھا سنگِ تیرہ بختی سے
کوئی گُہر نہ یمِ حادثات سے نکلا

میں چپ رہوں تو ظفر میری موت ہے اس میں
بھی فغاں میری جاں ہے پُر اثر نہ سہی

فرازِ شام سے گرتا رہا فسانۂ شب
گدائے گوہرِ گفتار نے سُنا ہی نہیں

پڑے رہو کہ یہ جھنکار بھی غنیمت ہے
کرو گے حلقۂ زنجیر سے نکل کر کیا

سیلاب تھا یہاں سے بھی ہو کر نکل گیا
اب یاد ہے شکستنِ دیوار و در کسے

ان اشعار میں ذاتی المیہ اور خارجی دُنیا کا شعور کم وبیش برابر کا درجہ رکھتے ہیں، اور بعض اوقات دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ بُنیادی بات یہ ہے کہ یہاں پیکر اور استعارہ دونوں تجرد سے محسوس کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ شروع کے دونوں شعر خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ رائیگانی، انسانی اعمال و تاملات کی بے اثری، اور اظہار کی بے چینی بلکہ مجبوری، اس شاعر کے خاص اوصاف ہیں۔ آٹھویں شعر میں (خیال رہے کہ مصرعِ ثانی میں تسکین اوسط ہے) کہا گیا کہ اظہار برابر ہے زندگی کے، فغاں علامت ہے وجود کی، اور بیان رُوح ہے، زندگی ہے۔ اس کے بغیر متکلم کو ہر طرف موت نظر آتی ہے۔ اسی بات کو تاڈاراف نے الف لیلہ کے حوالے سے کہا ہے کہ جب تک کہانی باقی ہے زندگی باقی ہے۔ کہانی برابر ہے زندگی کے، اور خاموشی مرادف موت ہے۔ نویں شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ سُننا بھی ایک طرح کی خاموشی، اور اس لیے ایک طرح کی موت ہے۔ دسویں شعر میں اسی بات کو اور رنگ سے کہا ہے۔

اوپر جو شعر میں نے نقل کیے وہ سب "آبِ رواں" سے لیے گئے ہیں۔ ان میں ظفر اقبال کے تمام سروکار، زندگی (داخلی اور خارجی) کے بارے میں اُن کے رویے، شعر کے بارے میں اُن کا تصوّر، علامت، پیکر اور استعارے سے اُن کا شغف، سب نظر آتے ہیں۔ عام حالات میں تو "آبِ رواں" کے مصنف کو زندگی بھر ان اشعار کی کمائی کھانی چاہیے تھی، لیکن ظفر اقبال عام شاعر نہیں، اور وہ عام حالات میں یقین بھی نہیں رکھتے۔ "گلافتاب" میں "آبِ رواں" کے بنیادی رنگوں کو تیز تر کرتے ہوئے ایک نیا عنصر شامل ہوتا ہے۔ افتخار جالب نے "گلافتاب" کے بنیادی رنگ حسبِ ذیل بتائے تھے: زبان، تجرید اور مزاح۔ حقیقت یہ ہے کہ ہلکے ہی سہی، لیکن یہ سب

رنگ ''آبِ رواں'' میں صاف نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ''آبِ رواں'' سے ''گلافتاب'' تک ایسی طویل جست ہے جسے Quantum Jump ہی کہہ سکتے ہیں، یعنی ایسی جست جو بیچ کے منازل کو چھوڑتی ہوئی عمل میں آئے۔ ''گلافتاب'' میں جنس اور اس کی مایوسیوں کا تجربہ اپنے اوپر ہنسنے کا انداز اور عشق و ہوس دونوں کے رایگاں ہونے کا احساس، یہ سب چیزیں نسبتاً نئی ہیں۔ زبان کے ساتھ وہ سلوک جسے رومن یاکبسن نے ''منظم تشدد'' کہا ہے، اور جسے اُس نے شاعری کی بنیادی صفت بتایا ہے، یہاں تقریباً ہر غزل میں نمایاں ہے۔ کتاب ختم ہوتے ہوتے ایسی غزلیں سامنے آنے لگتی ہیں جن میں زبان کے بند تقریباً ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ زبان کے بندھن پوری طرح نہ توڑ سکنے کے باعث شاعر کو خود پر شدید غصہ ہے، اور وہ زبان کے آہنی در و دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر اس غصے کو ظاہر کر رہا ہے، یعنی ''گلافتاب'' کی آخری غزلوں کی بدحواس کن بے معنویت خود ہی استعارہ ہے، اس بات کا کہ ہم بقول لطشے ''زبان کے زنداں'' میں قید ہیں۔ ہم کچھ بھی کریں، اگر ہمیں زندہ رہنا اور کلام کرنا ہے تو ہم زبان کے باہر نہیں جا سکتے۔ ظفر اقبال نے زبان (Parole) کو وسیع کرنے اور اسے لسان (Langue) سے بیش از بیش حصہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کوشش کی کامیابی اور ناکامی دونوں کا اظہار ان غزلوں میں ہُوا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں دونوں (کامیابی اور ناکامی) کے مابین تناؤ صاف چمکتا ہے:

لہو لہلوٹ سیاہی پھیلیں چپ
کڈھب کاغذ طلب تحریرتے کے
دن درگاہوں لکھیا لیکھ ہوا کے نیلے ورقاں
رت کرت چمک چانن میں فرق زمین آسمان کا
اشکل پیروی انجان ایجاد
تمکن متھیڈ عجب اشعارنے کا
فصیح فراست عزائم بلیغ عنقا میں
کدام خاک اڈائیم دشت دریا میں

اس بات سے قطع نظر کہ ''دلدارنے کا انکارنے کا'' والی غزل جیسی تجربے کے تلذذ کا ایک ایسا شاہکار ریان ہے کہ شاید جعفر زٹلی یا ابونواس کے یہاں، یا پھر ovid کے یہاں اس کی مثال ملے، ان تمام غزلوں میں ریختہ (یعنی فارسی اُردو ملی جلی زبان، جو قدیم اُردو کا ایک روپ تھی) کا اثر

نمایاں ہے۔ ریختہ ایک طرح کی کھچڑی زبان (Creole) تھی اور زیادہ دن چلی نہیں۔ لیکن ظفر اقبال کے یہاں اس کریول کاری (Creolisation) کے ذریعہ زبان کے حدود وسیع کرنے کی کوشش کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ ''گلافتاب'' کی یہ آخری غزلیں نمونے (Model) اور زیست پذیر (Viable) شاعری کی حیثیت سے ناکام سہی، لیکن ایسی غزلیں کہنے والے کی بے مثال جرأت اور بے نظیر قادر الکلامی کی داد ضرور دینی چاہیے۔ بعد کے مجموعوں، خاص کر ''اطراف'' اور ''عیب و ہنر'' میں شاعر نے اس تجربے سے کام بھی لیا ہے جو اسے ''گلافتاب'' کی ان غزلوں کو کہہ کر حاصل ہُوا۔

''گلافتاب'' کی محولہ بالا غزلوں کے ساتھ ساتھ ظفر اقبال کی مملکتِ سخن میں استحکام اور انتظام و انصرام کی علامت کے طور پر اُن کے لہجے میں وہ چیز متشکل ہو کر نظر آتی ہے، جسے میں ''حاکمانہ قدرت'' کا نام دیتا ہوں۔ اپنے اپنے طور پر یہ صفت میر، سراج، سودا، ولی، قائم چاند پوری، غالب، ناسخ سب کے یہاں ہے۔ یعنی شاعر خود سے، معشوق سے، آپ سے، زمانے سے یوں گفتگو کرتا ہے گویا وہ سب میں ممتاز اور سب سے الگ ہو، اور شاید سب سے بہتر بھی۔ گذشتہ مجموعوں میں تعلّی اور در مدحِ خود کے اشارے تھے، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ اب شاعر واقعی فرازِ مسند سے گفتگو کر رہا ہے۔ ''رطب و یابس'' میں ''اینٹی غزل'' کا جوش ہے، اور حاکمانہ غزل کا بھی۔ (اپنے طور پر اینٹی غزل بھی حاکمانہ ہے، لیکن وہ الگ بحث ہے۔) پڑھنے والوں نے اینٹی غزل کے آگے نگاہ نہ کی، ورنہ مندرجہ ذیل طرح کی غزلیں ''رطب و یابس'' میں اور پھر بعد کے مجموعوں میں کثرت سے ہیں:

اِک دن اِدھر سوار سمندر سفر تو آئے
خود بڑھ کے روک لیں گے کہیں وہ نظر تو آئے
کچھ دیر پھڑپھڑا کے نکل جایئے مگر
وہ دامِ دل پذیر کہیں زیرِ پر تو آئے
وہ دردِ لادوا ہی سہی دل پہ وا تو ہو
وہ حُسن اک بلا ہی سہی اپنے سر تو آئے
کیا کہ آبگینہ سلامت ہی لے کے جائیں
کچھ ٹوٹ پھوٹ تو رہے کوئی ضرر تو آئے

شامل نہیں خلوص ہمارے میں وہ تو کیا
یہ بھی بہت ہے بام سے نیچے اتر تو آئے

ارزاں ہے خونِ خلق تو پھر گو یہ گو تو ہو
ہے دستک ہتم تو ذرا در پہ در تو آئے

آنکھیں چمک دکھائیں تو آساں ہو راہِ مرگ
یعنی سحر سے پہلے چراغِ سحر تو آئے

مجھ بن سکے نہ ہم تو بگو کر دکھا دیا
یوں کارگاہِ شوق میں کچھ کام کر تو آئے

نازاں ہوں اپنے عیبِ سخن پر ہزار بار
لازم ہے آدمی کو ظفر کچھ ہنر تو آئے

قافیہ مشکل، ردیف مشکل لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو محض اوسط درجے کا ہو۔ سب کے سب بلند رُتبہ، سب کی بندش چست، مضمون ہر شعر میں پُورا پُورا بیان ہوا ہے۔ اور مناسبت الفاظ، ربط، لہجے کا بانک پن، کثرتِ معنی سب موجود ہے۔ پُوری غزل حشو و زوائد سے محفوظ ہے۔ اُوپر اُوپر ذرا خوش طبعی اور تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے رنگ کی تہہ میں برہمی، المیہ اور سیاسی نکتہ چینی کے بھی کنایے ہیں۔ شاعر / متکلم کا اپنے اُوپر اعتماد اور لہجے میں برتری کا آہنگ ان چیزوں نے اس غزل کو خارجیت اور داخلیت کی بحثوں سے اُوپر اٹھا دیا ہے۔ باہر والوں سے اور خود سے تخاطب، دونوں میں ایک طرح کی سچائی نُمایاں ہے۔

سیاسی رائے زنی سے ظفر اقبال کا شغف پُرانا ہے۔ لیکن ''عہدِ زیاں'' جو نئی غزلیں ہیں (اکثر غزلیں بحوں کی توں یا بادنیٰ تغیّر ''رطب و یابس'' کی ہیں) ان میں سیاسی باتوں کو غزل کی زبان میں بیان کرنے کی طرف دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ''غبار آلود سمتوں کا سُراغ'' میں لہجہ اور کیفیت بدل کر ذاتی نارسائی اور محرومی، اور اس محرومی پر ذرا خشک طنز اور خوش مزاج خود استہزا کا رنگ چمک اُٹھا ہے۔ ''عیب و ہنر'' سے سیاسی مضامین کی کثرت دوبارہ ہونے لگتی ہے۔ ''سرِعام'' میں یہ مضامین بالکل بے پردہ ہو کر سامنے آتے ہیں۔

سراج منیر نے ''سرِعام'' کی غزلوں کے لیے ''سیاسی مُعاملہ بندی'' کا دلچسپ فقرہ تراشا تھا۔ یہ ہے تو حسبِ حال لیکن پُورا حال نہیں بیان کرتا۔ خود ظفر اقبال اسے ''اپنی ناکام شاعری'' قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ان غزلوں میں ''موضوع اور شعریت کا توازن'' برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔ یہاں خود ظفر اقبال کو وہ غلط فہمی ہُوئی ہے جو اُن کے مُخالفین کا شیوہ ہے۔ سیاسی رائے زنی کلاسیکی غزل کی شعریات میں داخل ہے، بہ شرطے کہ رائے زنی کسی پارٹی لائن پر مبنی نہ ہو، بلکہ خود متکلم / شاعر نے سماج کے فردِ آزاد کی حیثیت سے یہ رائے زنی کی ہو۔ غزل کا متکلم ہمیشہ ''باہر کا آدمی'' (Outsider) اور ''غیر مُقلّد'' (nonconformist) رہا ہے۔ جب وہ زاہد اور مُلّا اور شاہ و شحنہ پر بے مُحابا نکتہ چینی کر سکتا ہے تو اُس کی آزادیِ رائے میں کیا شک؟ ہاں تہہ داری اور بالواسطگی اور کثیر المعنویت غزل کی دُنیا میں نہایت پسندیدہ ہیں، اور اگر سیاسی رائے زنی ان صفات کے ساتھ آئے تو کیا خوب۔ لیکن آبرو سے لے کر حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر تک غزل میں سیاسی خیالات کا جب اظہار کیا گیا تو برملا ہی کیا گیا۔ مصحفی کے کلام میں انگریزوں پر جو تنقید ملتی ہے وہ اس بات کو بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے:

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

(دیوانِ سوم)

ہے یہ فلک سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی
رکھتا ہے مہ و خور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ

(دیوانِ ہفتم)

توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں
فوجِ دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

(دیوانِ ہشتم)

دیوانِ ہفتم کے شعر میں پیکر اور استعارہ کی تھوڑی سی کارفرمائی ہے۔ ورنہ بقیہ دو شعروں میں تلخی (دیوانِ سوم) اور طنز (دیوانِ ہشتم) نُمایاں ہیں۔ معلوم ہُوا کہ سیاسی غزل گوئی کی شعریات اس تہہ داری اور پیچیدگیِ بیان کا تقاضا نہیں کرتی جو غزل کی عمومی صفت ہے۔ اس کے بجائے برہمی، طنز، تلخی، سخت و درشت لہجہ یہ چیزیں بروئے کار آتی ہیں۔ یہاں سوال اُٹھ سکتا ہے کہ ایسا ہے تو نیاز حیدر اور حبیب جالب کو نمایندہ شاعر کیوں نہ مانا جائے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اُن لوگوں کے یہاں شور زیادہ ہے، تلخی کم اور طنزیت ادنیٰ سطح کا ہے۔ لیکن دوسرا اور زیادہ موثر جواب یہ ہے کہ

ان لوگوں کی شاعری مُقررہ راہوں پر اور جانی پہچانی سمتوں میں سفر کرتی ہے اور پہلے سے طے شدہ نتائج نکالتی ہے۔ یہ نتائج نیاز حیدر اور حبیب جالب نہیں، بلکہ کوئی اور نکال کر اُن کے حوالے کرتا ہے، اور وہ اپنی نظم ان نتائج کے چاروں طرف تعمیر کرتے ہیں۔ "سرِ عام" کی غزلوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاعر ہر طرح کی ناانصافی اور استحصال کے خلاف ہے۔ اس کی برہمی کے لیے چند مخصوص ہی ہدف نہیں ہیں۔ مثلاً ترقی پسندوں کے لیے ویت نام کے خلاف لکھنا آسان تھا اور ہنگری یا افغانستان میں رُوسی استبداد اور خوں ریزی کے خلاف لکھنا غیر ممکن تھا۔ ممکن ہے "سرِعام" کا شاعر بھی کچھ عملی سیاسی نظریات رکھتا ہو، لیکن وہ کامیو کی طرح ہمیشہ ہر طرح کے استحصال اور جھوٹ سے نبرد آزما نظر آتا ہے۔ علاوہ بریں "سرِعام" میں ایسی بھی غزلیں ہیں جو غزل کی عام شعریات پر پُوری اُترتی ہیں۔ براہِ راست بیان اور بالواسطہ بیان، ان دونوں طرزوں کا انضمام بھی بعض غزلوں میں ہے، اور وہ غزلیں ہمارے زمانے کا قیمتی سرمایہ ہیں:

عرش پاتال ہو گئے میرے
لوگ بدحال ہو گئے میرے
شہر ویران ہو گیا یکسر
باغ پامال ہو گئے میرے
کونپلیں میری ہو گئیں خاموش
مور بے چال ہو گئے میرے
کوئی منظر کہیں بچا ہی نہیں
خواب کنگال ہو گئے میرے
رات دن بوجھ بانٹنے والے
فارغ البال ہو گئے میرے
گرہ کٹ چور اُٹھائی گیر بھی
قافلے وال ہو گئے میرے
دل کے اندر گرا تھا خون مگر
فرش کیوں لال ہو گئے میرے
کوئی پہچان ہی نہیں پاتا
کیا خدوخال ہو گئے میرے
گرمِ گفتار ہوں ظفر کتنا
حرف سیّال ہو گئے میرے

اب اس سے بڑھ کر کوئی کیا کہے گا؟ اور لطف یہ کہ زبان کا چونچال پن، مناسبتِ الفاظ، توازن بین المصرعتین کلاسیکی غزل کی طرف اشارے اور صدائے بازگشت سب موجود ہیں۔ شعر (۲) کی رنجیدگی اور تلخی یکساں وار کرتی ہیں۔ "میرے" کی کثیر المعنویت کس قدر دلکش ہے۔ بعض دوسری غزلوں میں صَرف ونحو کی پیچیدگی سے استعارے کا کام لیا گیا ہے:

غلط ہے اور میں اسے مسترد بھی کرتا ہوں
یہی کہ میرا مُقدر دیا گیا ہے مجھے
بیان دیتا رہا کون صلح جُوئی کے
ارادہ اور ہی بینُ السطور کس کا تھا
وہ نوکِ تیغ پہ رکھ لائے تھے ظفر دستار
قبول کر کے ہی آخر بچا ہے سر میرا

تیسرے شعر میں پیکر کی ڈرامائی وحشت ناکی قابلِ لحاظ ہے۔ امام ابوحنیفہ کو قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا اور بار بار پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے ہمیشہ انکار کیا، آخر زندانی کیے گئے، اور محبس ہی میں واصل بحق ہو گئے۔ تاریخ کو شعر میں یوں ڈھالتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کہیں مشکیزہ لکھ دیا، کہیں وحشت لکھ دیا، کہیں قُربانی کا ذکر کر دیا اور سمجھا کہ استعارہ، علامت، تمثیل کا سب حق ادا ہو گیا۔ استعارے کی تازگی کے علاوہ اس شعر میں بڑی بات یہ ہے کہ اس میں خود ترحمی کا شائبہ تک نہیں۔ پھر شعر کی صورتِ حال میں ڈراما ہے، لیکن اس ڈرامے کے مرکزی کردار وہ لوگ (وہ قومیں، ادارے) قرار دیے گئے ہیں جو نوکِ تیغ پر دستار رکھ کر لائے تھے۔

ظفر اقبال کے لیے استعارہ ہمیشہ مُکاشفہ اور توسیعِ معنی کے لیے آتا ہے۔ بعض اوقات تو اُن کا استعارہ اس قدر بالواسطہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر محسوس نہیں ہوتا۔ بیانیہ کی سطح پر شعر متاثر کرتا ہے، جب غور کریں تو اس کے دوسرے ابعاد کُھلتے ہیں۔ مثال کے طور پر "گلافتاب" کا ایک بدنام شعر ہے:

پھرتا ہوں بازار میں رُک جاؤں لیتا چلوں
اس کی خاطر بریز اپنے لیے دوائیاں

اس بات سے قطع نظر کہ وہ ہے ہی بحر تو غزل میں بالکل بیچ بیچ برتا گیا ہے، اور یہ خود ہی ایک طرح کا استعارہ ہے، قابلِ دید نکتہ یہ ہے کہ بازار میں بے مقصد پھرنے والا شخص دراصل استعارہ ہے، آج کل کے انسان کا، جو جسمانی اور جذباتی (یا دونوں) لحاظ سے نامرد ہے۔ (یا پھر وہ کوئی بوڑھا ہے جس کی جوان بیوی ہے) بدن میں طاقت نہ ہونے کے باعث وہ خود کو بیوی کے سامنے چور محسوس کرتا ہے اور اس کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ لیکن گھر تو جاتا ہی ہے، اور اگر بیوی کے لیے کوئی تحفہ خرید لے تو شاید آنکھ ملانا آسان ہو۔ تحفے میں بریزیر استعارہ ہے، بیوی کی جوانی کا، اور اپنے لیے دوائیں استعارہ ہیں متکلم کی جسمانی نا اہلی کا۔ شعر میں اولین تہ طنز کی ہے۔ لیکن جب اس تہ کو کھولیں تو استعارہ ملتا ہے۔

استعاروں کی یہ لطافت "عیب و ہنر" کے اشعار میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اب تماشائے دنیا میں ایک تھکن، ایک اضمحلال شامل ہو گیا ہے۔ ممکن ہے یہ متکلم/شاعر کے روحانی ارتقا اور ذہنی سفر کی ایک منزل ہو۔ یا پھر یہ شعر ہمارے سارے زمانے اور صدی کے آخری دس بارہ برسوں کی دنیا کا استعارہ ہوں۔ گویا ظفر اقبال کا کلیات ایک عظیم الشان سٹیج ہو جس پر دنیا روپ بدل بدل کر سامنے آ رہی ہو۔ جس سے شغف بھی اب کم ہو گیا ہے۔ نہ کامیابی کے جشن ہیں، نہ ناکامی کے رنج، اور نہ اپنی ہوس یا نامردی پر طنز۔ یہ سراسر وہ چیز نہیں ہے جسے ملٹن نے "ذہن کا سکون، سارے جذبہ و درد و جوش کا تیز جانا" کہا تھا، بلکہ اس میں کسی تازہ آگہی کی شان بھی شامل ہے۔ یعنی یہاں انتقام نہیں، بلکہ نئی طرح کی واردات آنے کا معاملہ ہے:

رات جگمگ کر اٹھی ہے کچھ اندھیرا سا مگر
دل کے اندر تھوڑی شام رہ جانے سے ہے

بہتا ہے نہ رہتا ہے کناروں میں سمٹ کر
دریا ہی کچھ ایسا ہے کہ دریا نہیں لگتا

اب وہ کھٹ میٹھی محبت قصۂ ماضی سہی لیکن
سو طرح کے بھولے بسرے ذائقے اب تک زباں پر ہیں

ایک اس کے وصل کی خوشبو کے پیچھے پھرنے والوں کا
یہ شرف بھی کون سا کم ہے کہ رزقِ رائگاں پر ہیں

شعر 3 اور 4 کی بحر (رمل مثمن سالم کے آخر میں ایک سبب خفیف بڑھایا ہے) غیر معمولی عروضی مہارت کا ثبوت تو ہے ہی، یہ اس بات کا استعارہ بھی ہے کہ تخلیقی قوت کا وفور ہے، جہاں سے یہ مال آیا ہے وہاں ابھی اور بھی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ "عیب و ہنر" میں نسبتاً اجنبی بحریں کئی بار استعمال ہوئی ہیں۔ اور "وہم و گماں" میں اشعار مجہول بحر میں بھی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ایسی اجنبی بحر اور ہر غزل میں وہ روانی کہ باید و شاید۔

"عیب و ہنر" اور "وہم و گماں" دونوں میں انداز کی بے تکلفی، لہجے کی صفائی، شعری روانی، یہ سب مشکل چیزیں خود انتقاد (Self Criticism) خود استہزا (Self mocking) کاروبارِ حیات اور کاروبارِ عشق کا بیان جیسی غیر متوقع چیزوں کے ساتھ مل گئی ہیں کہ جدید غزل کا ایک بالکل نیا اور ناقابلِ تقلید رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے لکھا ہے کہ میر کا بہت سا کلام ایسا ہے کہ پوری غزل پڑھے بغیر اس کا مکمل لطف نہیں حاصل ہوتا۔ یعنی کسی نہ کسی طرح کی نئی بات ہر شعر میں ہوتی ہے، اور لہجے کی بے ساختگی اور روانی اس کے لیے موسیقیاتی سنگت معلوم ہوتی ہے۔ ظفر اقبال نے "عیب و ہنر" کی غزلوں سے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مندرجہ ذیل دو غزلیں ملاحظہ ہوں۔ پہلی غزل "عیب و ہنر" سے ہے اور دوسری "وہم و گماں" سے:

(1)

مدت سے کوئی میرے بھی جیسا نہیں آیا
میں یوں ہی تو منظر پہ دوبارہ نہیں آیا

باقی ابھی کتنا ہے بدی کا یہ سمندر
ہوں کب سے رواں اور کنارہ نہیں آیا

موسم کئی ٹھہرے ہیں کہ اس پردۂ دل پر
بازو نہیں لہرائے ہیں چہرہ نہیں آیا

نکلے تھے یہ کس اندھے اندھیرے کے سفر پر
آنکھیں تو پلٹ آئیں تماشا نہیں آیا

کہتے ہیں کہ پانی ابھی تھوڑا نہیں سر سے
سیلاب ابھی شہر میں اتنا نہیں آیا

ہے کیسی مسافت کہ مری راہ میں اکثر
دیوار تو آئی ہے دریچہ نہیں آیا

ان اشعار کے تجزیے اور توضیح میں کئی صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اب تک جو کچھ میں کہتا رہا ہوں اُس کی روشنی میں شاید تفصیل کی ضرورت نہ ہو۔ ''اطراف'' کے دیباچے میں عبدالرشید نے لکھا ہے کہ ''ظفراقبال کی شاعری ایک ایسے مُعاشرے میں، جو عدم تحفظ کا شکار ہے، جہاں لفظ اپنے روایتی معنی کھو چکے ہیں، اور عصری حقیقتیں قبول کرنے کو تیار نہیں، اپنی واردات بیان کرنے کی سعی کرتی ہے''۔ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن جہاں تک لفظوں کے روایتی معنی کے کھو جانے کا سوال ہے، تو سچی بات یہ ہے کہ ہر بڑا شاعر زبان کو اپنے آپ میں زندہ کرتا ہے۔ اسی لیے والیری نے کہا تھا کہ شاعر کا منصب اور وظیفہ یہ ہے کہ وہ ''قبیلے کی زبان کو مزکیٰ (purify) کرے''۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب شاعر زبان کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو۔ یعنی وہ ایک طرف ''وہم و گمان'' میں ایسے ایسے شعر ڈال سکتا ہو کہ سودا، انشا، اور جرأت کی ہجوؤں کو پسینا آ جائے:

شو گل، زندہ باد | تقدیروں والے تھوہ
گُو شکر بھلا ظفر | انجیروں والے تھوہ
گورے گورے پانو تلے | کالی اینٹیں کالے روڑ
تھوڑی سی اس زمین پہ رم جھم کا ہے سوال | چھوٹی سی آسماں پہ دھنک مانگتے ہیں لوگ
وہ جاگے ہوں کہ سوتے کھا رہے ہیں | اِدھر ہم صرف غوطے کھا رہے ہیں
پُوچھا تو ناچار ظفر نے | اپنی ذات بتائی روئی
وردی میں آنے کا کچھ | اور مزہ ہے بھائی ڈکیت
پہلے آنے والوں سے | یہی بچا ہے بھائی ڈکیت

ان سب اشعار میں غصّہ زیادہ ہے، اتنا زیادہ کہ اگر زبان کی لگام ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو عجب نہ تھا۔ لیکن شاعر نے زبان کی ایک آدھ نزاکت ہر شعر میں پھر بھی رکھ دی ہے۔ دوسری طرف اب تک کے آخری مجموعے کا نام ''اطراف'' ہے، لیکن شاعر نے یہ واضح نہیں کیا کہ ''اطراف'' بروزن ''اقبال'' ہے، بہ معنی ''نئی نئی چیزیں پیدا کرنا''، یا بروزن ''اعمال'' ہے، بہ معنی ''طرف یا سمت کی جمع''۔ میر نے بھی کچھ ایسی ہی چالاکی سے کام لیا ہے، لیکن انھوں نے دوسرے مصرعے میں جس طرح کا استعارہ/پیکر رکھ دیا وہ زبان کو زندہ کرنے اور مزکیٰ کرنے کا ایسا نمونہ ہے جو کسی بھی زمانے کے شاعر کے لیے آدرش کا کام کر سکتا ہے۔ دیوانِ ششم میں ہے:

پھیلے شگاف سینے کے اطراف درد سے

ہم ہی وہیں پھرتے رہے اطراف میں اس کے

البتہ ملاقات کا موقع نہیں آیا

یہ طرفہ لطیفہ ہے کہ اس آگ میں ہم کو

جلنا نہیں آیا کبھی رُکنا نہیں آیا

لوگوں میں ظفر آپ زباں ساز بھی کہلائے

اور بات بھی کرنے کا سلیقہ نہیں آیا

(۲)

شہرِ خوابیدہ کے اندر نہیں جانے والی

یہ صدا وہ ہے جو گھر گھر نہیں جانے والی

خود تو میں اور زیادہ نہیں جینے کا مگر

مجھ میں اک چیز ہے جو مر نہیں جانے والی

آگے پیچھے رہی وہ شام تماشا مجھ سے

کہ ابھی میرے برابر نہیں جانے والی

اک ہوا ہے جو مرے چاروں طرف چلتی ہے

اور کسی ایک ہی رُخ پر نہیں جانے والی

رفتہ رفتہ کوئی مجھ میں سے گزرتی ہوئی شے

جا رہی ہے جو سراسر نہیں جانے والی

لہر سی ایک زمانوں کی مرے ساتھ ہی ساتھ

جاتی رہتی ہے جو اکثر نہیں جانے والی

کیوں نہ دشوار ہو اُس شہر کو جاتی ہوئی راہ

جو مری خاک سے ہو کر نہیں جانے والی

اُس طرف ڈرتی لرزتی ہوئی یہ موجِ نگاہ

جائے گی بھی تو مکرّر نہیں جانے والی

میرے اندر جو کھلا کرتا ہے اک پھول ظفر

اُس کی خوشبو کبھی باہر نہیں جانے والی

کوچہ ہر ایک زخم کا بازار ہو گیا

ظفر اقبال اسی راستے میں ہیں، لیکن وہ جگہ جگہ کلاسیکی مضامین کو subvert بھی کرتے چلتے ہیں۔ میر کا مشہور زمانہ شعر ہے:

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں

آگے ہو مے خانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے

میر نے ہوا سے رنگ ٹپکنے کا مضمون میر رضی دانش سے لیا، لیکن اس میں معنی کے اتنے امکان رکھ دیے کہ رضی دانش کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ رضی دانش:

در دشت ابر رنگ شبستان لالہ ریخت

نقش و نگار خانہ تماشا چہ می کنی

میر رضی دانش کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ یہ شعر آصف نعیم کی مرتب کردہ بیاض "گنجینۂ باز یافتہ" میں ہے۔ یہ بیاض برٹش میوزیم میں محفوظ رکھے ہوئے مخطوطوں پر مبنی ہے۔ یہ تفصیل اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ "شعر شور انگیز" میں میر کے منقولہ بالا شعر پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے رضی دانش کے شعر کا حوالہ دیا تھا۔ آصف نعیم کی کتاب اس وقت معرض وجود میں نہ آئی تھی، اور نہ "وہم و گماں" جہاں سے میں مندرجہ ذیل شعر نقل کرتا ہوں:

رنگ سا پھیلتا جاتا وہ ہوا کا ہر سمت

وہم سا پھر بھی ہے یہ تھرتھری ہے بھی کہ نہیں

یہاں کلاسیکی مشاہدے (وہم؟) کو جس طرح معرض سوال میں لایا گیا ہے، اس پر بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن لفظ "تھرتھری" کی پیکری جدت اور کثیر المعنویت کی داد دیے بغیر نہیں بنتی۔ وکٹر ہیوگو نے بودلیئر کو لکھا تھا کہ تم نے آسمان شعر پر ایک نئی تھرتھری (frisson) پھیلا دی ہے۔ بودلیئر کی لائی ہوئی تھرتھری اب تک باقی ہے۔ اوپر میں نے "سر عام" کی غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر ان غزلوں میں شاعر نے جگہ جگہ اپنی برہمی اور تلخی کو بقیہ تمام تاملات اور تحفظات پر حاوی آ جانے دیا ہے اور ایسی شاعری تخلیق کی ہے جو قدیم عربوں (اور بعض حالات میں جدید عربوں) کی ہجویات اور منظوم مجادلوں کی یاد دلاتی ہے، تو "رے ہنومان" تک پہنچتے پہنچتے شاعر اور اس کے صبر کا دامن ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ شاعری، اور خاص کر غزل کی شاعری میں جو تکلف اور تمکین کا تقاضا کرتی ہے، "رے ہنومان" کی برہنہ گفتاری کی متحمل ہو بھی سکتی ہے کہ نہیں۔ لیکن ذرا ٹھہریں اور "رے ہنومان" کو دوبارہ پڑھ جائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس برہنہ گوئی کے پیچھے بڑا نظم و ضبط اور معنی کا بڑا احترام و لحاظ بھی ہے۔ خود ظفر اقبال اپنے دیباچے کے ذریعے ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ "ہنومان" کئی چیزوں کا استعارہ ہے اور بعض اوقات یہ چیزیں کچھ متضاد بھی ہیں۔ شاعر کی توجیہ کو نظر انداز کر کے ہم شعر کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "ہنومان" استعارے سے زیادہ عمرو عیار کی زنبیل ہے، یا تیمکر کا پردہ ہے، جس میں سے شاعر اپنے مطلب کے موافق ہنومان جی کی دیومالائی شخصیت کی جگہ جدید انسان کی بہیمانہ، یا حریصانہ، یا زر پرستانہ، یا جنس آلودہ، یا استحصال کی چوٹ کھائی ہوئی صورت نکال کر ہمیں دکھاتا اور ہمیں شرمندہ کرتا ہے۔ "رے ہنومان" کی کامیابی اس بات میں ہے کہ یہ کتاب ہمیں قدم قدم پر شرمندہ کرتی ہے۔ اس کی دوسری کامیابی یہ ہے کہ یہاں بھی شاعر نے زبان اور عروض کے ساتھ وہی منہ زور رویہ اختیار کیا ہے جو اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ظفر اقبال بھی کوئی چالیس برس سے اردو غزل میں ایک نئی تھرتھری پھیلا رہے ہیں، اور یہ بھی تو کم نہیں کہ ابھی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ آگے کا حال اللہ جانے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الہٰ آباد

جنوری 1997ء

آبِ رواں

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب بھڑکے تھا سرو و سمن کے اندر
مصحفی

محمد کلیم خاں کے نام

ستم ظریفیِ قسمت تو دیکھیے کہ ظفر
چھٹی شراب تو یاری کلیم خاں سے ہوئی

پیش لفظ

خشکی کے دریاؤں کی اپنی چال ہے۔ ہر پھر کر وہ سمندروں میں جا گرتے ہیں، لیکن سمندروں میں بھی دریا ہیں جو بس بہتے رہتے ہیں۔ سمندر کا دریا گرے تو کہاں گرے؟ وہ تو آپ ہی سمندر ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ سمندر کے گرم دریا، ہزاروں میل دور جا کر، ٹھنڈے دیسوں کے ساحلوں اور موسموں کو گرماتے ہیں اور ٹھنڈے دریا جا کے گرم دیسوں کے ساحلوں اور موسموں کو ٹھنڈاتے ہیں۔ سب چیزیں اپنی ضد کی طرف حرکت کرتی ہیں، اپنی ضد سے توانائی حاصل کرتی ہیں اور حظ اُٹھاتی ہیں۔

کچھ اسی طرح ظفر اقبال کی غزلوں میں بھی دو رَویں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، ایک دُوسری کو اُلٹتی ہوئیں، ایک دُوسری کی سمت کو پرکھتی ہوئیں۔ انبساط کی رو، یاس کی رو، جیسے ایک ہی سمندر کی جڑواں، دو دھاری کھیتیاں۔ انبساط کی رو، یاس کے مناظر میں اس طرح در آتی ہے جیسے حرارت کا کوئی فوارہ اُبل کر اندھیروں میں ٹوٹتی پھوٹتی جگمگاہٹ بکھیرتا جائے۔ یاس کی رو انبساط کی زمینوں میں یوں پھٹکتی ہے، جیسے کوئی بلا کا سرد تھپیڑا کسی گرم، روشن منظر کو کمہلا دے اور پلکوں پر برف کی قلمیں بجنے لگیں۔ یہاں کچھ بھی محفوظ نہیں۔ یہ ایسی غزلیں ہیں جن میں ٹوٹ پھوٹ تک میں ایک نامیاتی سا توازن پیدا ہو گیا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ یہاں اُگتی ہی نہیں، پھلتی پھولتی بھی ہے۔ یہ سب آخر کیا ہے؟

ظفر اقبال ملاوٹ کا قائل ہے، بلکہ قائل کا لفظ تو یہاں ناموزوں ہے۔ وہ ملاوٹ پر مجبور ہے۔ اُس کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہ کسی چیز کو، کسی واردات کو، کسی شخص کو (حتیٰ کہ محبوب کو بھی) جُوں کا تُوں قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اُسے اُس وقت تک اپنے پاس جگہ دینے کو تیار نہیں ہوتا جب تک اُس میں اپنے پاس سے یا اِدھر اُدھر سے کچھ اور نہ ملا دے، اور وہ بھی کوئی ایسی چیز جو پہلی چیز کی اُلٹ ہو اور اُس میں پُوری طرح حل ہونے سے قاصر یا انکاری ہو۔ یہاں پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ عمل تو سبھی کرتے ہیں کیوں کہ جو چیز یا بات ہم تک پہنچتی ہے، جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آتا ہے، جن لوگوں سے ہم ملتے جلتے ہیں، اُن میں اپنی طرف سے تھوڑا بہت گھٹاتے بڑھاتے ضرور ہیں، بلکہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہی تب ہے، جب اُس میں ہماری ذات کی کچھ ملاوٹ ہو چکی ہو۔ یہ سچ ہے۔ لیکن بیشتر حالات میں یہ عمل شعوری سطح پر واقع نہیں ہوتا۔ دُوسرے یہ کہ یہ تجربہ عام سہی مگر اسے شعر میں بدلنے کی توفیق کتنوں کو ہوتی ہے؟ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن کہاں ہے کہ وہ اپنی بپتا کو تراش خراش کر دُوسروں کے واسطے بامعنی، حیرت ناک اور ہلا دینے والی بنا سکے۔

یہ ملاوٹ ظفر اقبال کی توانائی کی ذمے دار بھی ہے اور خرابی کی بھی۔ ملاوٹ کا یہ ختم نہ ہونے والا عمل نئی نئی صُورتوں اور صعوبتوں کو ظہور میں لاتا ہے۔ ظفر اقبال عشق میں ہوس، بیداری میں خواب، سیاست میں مثالیت پسندی، شائستگی میں بازاری پن، سنجیدگی میں ہزل، سچ میں جھوٹ، یاس میں نشاط ملا ملا کر دیکھتا جاتا ہے۔ جس طرح کسی تجربہ گاہ میں کوئی سنکی محقق طرح طرح کی چیزوں کو ملا کر دیکھتا ہو، یہ پروا کیے بغیر کہ اس قسم کے الٹے سیدھے تجربوں سے دھماکا بھی ہو سکتا ہے، آگ بھی لگ سکتی ہے، زہر ہلاہل بھی بن سکتا ہے، تریاق بھی وجود میں آ سکتا ہے۔ لیکن ظفر اقبال کچھ ایجاد کرنے کے درپے نہیں۔ وہ تو اپنے اندر کی دُنیا کو سنبھالا دینا چاہتا ہے، اپنے نفسی اضطراب کے مختلف منطقوں کے مابین توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِدھر سے کوئی چیز اُٹھا کر اُدھر کسی خانے میں ڈالنا، پالکی سے کچھ توڑ کر آنکھی میں جوڑنا، یہی بڑا اُلٹ پھیر ہے۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں کبھی نروان یا رہائی کا لمحہ بھی آ سکتا ہو گا۔ خبر نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ شاعری نے اُس کی شخصیت کے تانے بانے کو اُدھڑنے سے بچایا ہے، ورنہ سب کچھ کبھی کا تار تار ہو چکا ہوتا۔ اُس کا اپنا عالم تو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دُوسروں سے منوانا بھی چاہتا ہے، اور دُوسری طرف خود اپنے اندر اپنے آپ کو رد بھی کیے جاتا ہے۔ جس انبساط اور یاس کا پہلے ذکر ہُوا ہے، اُس کے تصادم بلکہ ترویج کے بعض اچھے نقشے ان اشعار میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً بگاڑ میں بناو اور بناو میں بگاڑ کی کئی تصویریں یہاں اُوپر تلے جمع ہیں:

کتنے دیے جلا گئی شام کی تند رو ہوا
پھول گرا کتاب سے، چاند ابھرا نقاب سے

اسی طرح یہ دو شعر بھی قابلِ ذکر ہیں:

کتنے ہنگاموں سے برپا کر رہا ہوں جشنِ مرگ
کوئی کیوں جانے کہ مجھ کو زندگی کا غم بھی ہے

دل میں خوشبو سے کہ بھی ہے رواں چاروں طرف
اس زمیں کا چپہ چپہ دامنِ مریم بھی ہے

یہاں بھی بہت سی مخالف چیزیں شعری پیکر میں ایک دوسرے میں نصب ہو گئی ہیں۔ گناہ کی خوشبو کی طرفگی اپنی جگہ لیکن معصیت کو بہادی اور معصومیت کو ٹھیراو کی کیفیت سے متعلق کر دینا بھی خالی از علت نہیں:

سیاہ خانۂ دل سے نکل کے آیا ہوں
کبھی بتاؤ، ڈروں گا اندھیری رات سے کیا

اور اس کے فوراً بعد یہ شعر:

وہ معرکے مری آنکھوں میں گرم ہیں کہ ظفر
میں سوچتا ہوں مجھے دل کی واردات سے کیا

جو پہلے شعر کی صاف نفی ہے۔

یوں تو ان غزلوں میں کہیں کہیں بہار آنے، عطر میں ڈوبا ہوا خط آ جانے، کسی کے پہلے خط سے دیارِ دل میں لہر بہر ہونے، زرنگار اور گل عذار صورتوں اور ہرے بھرے بدن کا بھی ذکر ہے، لیکن ان کا تعلق انبساط سے کم کم ہی نظر آتا ہے۔

انبساط کی جو رو، کبھی ہلکی کبھی تیز، پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے وہ دراصل شعر کہنے کے عمل سے متعلق ہے۔ اپنے حسی اور فکری تجربوں اور اُدھیڑبُن کو ان کی تمام پیچ در پیچ تہوں سمیت شعری قالب میں سمونے میں کامیابی بجائے خود بہت بڑی لذت ہے۔ شاعر ہونے کا احساس ریلے کی طرح آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ محض انبساط یا محض یاس سے بالاتر کوئی چیز ہے۔

یاس کی رو کا سرچشمہ تلاش کرنے میں شاید زیادہ وقت نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ ظاہری سطح پر دُنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو بےحِس یا اُفتادہ، قطعاً معمولی اور تکرار سے عبارت ہے۔ ہر چیز بار بار دُہرائی جاتی ہے۔ لوگ اپنے بندھے ٹکے انداز میں، چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح، صبح کو شام اور شام کو صبح کرتے رہتے ہیں۔ شاعری اس معمول کے خلاف بغاوت ہے۔ صرف شاعر اور فن کار ہی یکسانیت کے اس پھندے سے باہر نکل سکتے ہیں، ظاہری سطح کی موٹی، سنگین پرت کو توڑ کو اُس پار جھانک سکتے ہیں۔ ایسے لمحے سرمستی اور اہتزاز کے لمحے ہوتے ہیں۔ شاعر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب دُنیا کو، اپنے اور دوسروں کے لیے، بدل کر رکھ دے گا، روزمرہ کی اُوٹ پٹانگ بےرنگی پر اپنے نیرنگ کی چھاپ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دے گا۔ جذب و مستی کا یہ عالم محض سراب ہے۔ جب تخلیق کا جوش ٹھنڈا پڑتا ہے اور نشہ اُترتا ہے تو شاعر دیکھتا ہے کہ دیواریں اور رکاوٹیں اُسی طرح کھڑی ہیں، دُنیا کا معمولی پن اُسی طرح برقرار ہے، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ دُنیا کا دُنیا پن اُس سب کو جھٹلاتا ہے جو شاعر نے دریافت کے لمحے میں دیکھا اور شعر میں بیان کیا۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعری دُنیا کو بدل نہیں سکتی، لیکن وہ اپنے آپ کو دُہرانے سے باز بھی نہیں آتا۔ شعر کہنا بھی اصل میں ایک طرح کی سزا ہے، اسرار سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی سزا، اور شاعر سزا یافتہ باغی ہے۔ وہ صرف معافی مانگ کر قید سے باہر آ سکتا ہے۔ اُسے اپنے زخموں کو کریدتے جانے میں مزہ آتا ہے، حالاں کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس طرح زخم کبھی بھر نہیں سکیں گے۔

ہمارے زخمِ نہاں پر فسردہ ہو نہ کوئی
ہیں پُر بہار اسی نقشِ ناتمام سے ہم

"آبِ رواں" آج سے اُنیس سال پہلے چھپی تھی۔ ظفر اقبال کی حالیہ غزلوں کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید اُس نے دُنیا کے معمولی پن کو قبول کر لیا ہے۔ یہ قناعت شاعر کو زیب نہیں دے سکتی۔ کم از کم "آبِ رواں" میں وہ تمام کشیدگیاں، جو بنی بنائی دُنیا کو ٹھکرا کر اس کے مقابلے میں اپنی دُنیا آپ بنانے کے عمل سے پیدا ہوتی ہیں، نہ صرف موجود ہیں بلکہ مانوس بھی لگتی ہیں۔

محمد سلیم الرحمٰن
(دیباچہ طبع ثانی وسوم)

لب پہ تحریمِ تمنائے سُبک پائی ہے
پسِ دیوار وہی سلسلہ پیمائی ہے

تختۂ لالہ کی ہر شمعِ فروزاں ، جانے
کس بھلاوے میں مجھے دیکھ کے لہرائی ہے

خاک در خاک بچھی ہے مری آنکھوں کی چمک
جس خرابے میں تری انجمن آرائی ہے

اپنے ہی پانو کی آواز سے ڈر جاتا ہوں
مَیں ہوں اور رہ گزرِ بیشۂ تنہائی ہے

پھر سرِ صبح کسی درد کے در وا کرنے
دھان کے کھیت سے اِک موجِ ہوا آئی ہے

☆

یہ نرم نرم گھاس ، یہ پھولوں بھری زمیں
اک دن بہا تھا خون کا دریا یہیں کہیں

کس کو پتا ہے ٹوٹتے پتوں کی ٹولیاں
اُڑتی ہوا کے ساتھ کسے ڈھونڈنے چلیں

چھانے لگی خیال پہ دودِ رواں کی چھانو
بجھنے لگا چمکتی ہوئی آنکھ کا نگیں

چپ چاپ تیرگی کے نشیبوں میں سو رہے
جن کی نظر میں جاگتی شمعیں بھی ہیچ تھیں

یُوں ہی رہے گا زہر بھری چاندنی کا رنگ
رُوٹھے رہیں گے قریۂ مہتاب کے مکیں

ٹوٹے گا کس سے گھومتی آواز کا طلسم
سرگوشیاں اگر اسی رَو میں رواں رہیں

کس جستجو میں جسم جلاتے ہیں رات دن
سچ پوچھیے تو اس کی ہمیں بھی خبر نہیں

☆

جو پھول کھلا زیرِ زمیں، ہے مرے دل میں
وہ جب سے ہوا پردہ نشیں، ہے مرے دل میں

آئے ہیں جسے شہر بدر کر کے یہ ناداں
وہ شعلہ لب رنگ یقیں ہے مرے دل میں

کچھ آبلہ پا سے فروزاں ہے رہِ زیست
کچھ روشنیِ شمعِ یقیں ہے مرے دل میں

ناچیز ہے صد مُہرِ سُلیماں مرے نزدیک
بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل میں

ترسے گا ابھی کانپتی کرنوں کو زمانہ
تا دیر نہ یہ ماہ مُبیں ہے مرے دل میں

اُس شکلِ مُرقّع میں جو افسوں ہے، کہاں ہے
کہنے کو تو سو نقشِ حسیں ہے مرے دل میں

پھرتے ہیں نگاہوں میں کسی خواب کے پیکر
دھندلی سی کوئی یاد کہیں ہے مرے دل میں

وابستۂ سنگِ درِ دوراں ہی نہیں مَیں
اِک موم کی مُورت بھی مکیں ہے مرے دل میں

کیا بے ہنروں کو مَیں دکھاتا پھِروں، ورنہ
ہے کون سا جلوہ جو نہیں ہے مرے دل میں

-☆-

شب بھر رواں رہی گُلِ مہتاب کی مہک
پَو پھوٹتے ہی خشک ہُوا چشمۂ فلک

موجِ ہوا سے کانپ گیا رُوح کا چراغ
سیلِ صدا میں ڈوب گئی یاد کی دھنک

پھر جاڑے کی ٹھٹھرتی خرابوں کے دیس میں
سُونی، سُلگتی، سوچتی، سُنسان سی سڑک

رُخ پھیر کر جو ابرِ شبانہ میں چھپ گیا
جی میں پھِرا کرے گی اُسی چاند کی چمک

پھر پچھلے پہر آئنۂ اشک میں ظفرؔ
لرزاں رہی وہ سانولی صُورت سویرے تک

-☆-

ترے لبوں پہ اگر سُرخیِ وفا ہی نہیں
تو یہ عناد، یہ کج دیکھے مجھے روا ہی نہیں

میں تیری رُوح کی پتّی کی طرح کانپ گیا
ہوائے صبح سبک گام کو پتا ہی نہیں

کسی اُمید کے پھولوں بھرے شبستاں سے
جو آنکھ مَل کے اُٹھا ہوں تو وہ ہوا ہی نہیں

فراز شام سے گرتا رہا فسانۂ شب
گدائے گوہرِ گفتار نے سُنا ہی نہیں

چمک رہا ہے مری زندگی کا ہر لمحہ
میں کیا کروں کہ مری آنکھ میں ضیا ہی نہیں

-☆-

ہمیں ہی تھا لبِ خاموش کا قرینہ بھی
ہمیں سے ٹوٹ گیا ضبط کا نگینہ بھی

ہوا میں گھول کے میٹھی مُراد کی خوش بُو
اُداس کر گئی اُمید کی حسینہ بھی

کسی خیال سے ٹکرا کے ٹوٹ جائے گا
کہیں یہ روگ بھری سانس کا سفینہ بھی

جبینِ صبحِ مسرت کے چُومنے والے
اُٹھا چکے ہیں کبھی تختیِ شبینہ بھی

چلو، ہوا نہ سہی، لُو ہی چل پڑے، یارو
یہی بہت ہے اگر خشک ہو پسینہ بھی

-☆-

کس نے پیشانیِ خاک کو زرد پتوں کے جھومر دیے
کس کے نیل ورشی موہ سے خشک جنگل ہرے ہو گئے

شام تک ننھی پریاں طلسمی محلّوں میں دبکی رہیں
شام تک وادیِ قاف میں برف کے پھول گرتے رہے

شاید اک بار پھر جگمگائے یہ بارش بھری تیرگی
شاید اک بار پھر گھرے بادل کی حبشی حسینہ ہنسے

پھر ہوا ایک بھیگی ہوئی رُوح کی طرح، آہستہ رَو
آئی یادوں کے تالاب میں زرد کی کنکری پھینکنے

رُوپ کے آسمانوں کی سُورج مُکھی، میرے دل کی بہن
تُو کہاں ہے؟ مری انگلیاں تھک گئیں، آ! انھیں چوم لے

☆

ُجھے تیری نہ تجھے میری خبر جائے گی
ید اب کے بھی دبے پانو گزر جائے گی

ہ پچھلے آئے گا اک یاس کا جھونکا، جس سے
پتی پتی گُل حسرت کی بکھر جائے گی

سُرخ سُورج کی چمکتی ہوئی نوخیز کرن
تیغ بن کر مرے پہلو میں اُتر جائے گی

سوچتی آنکھوں میں پھر تیرے تصوّر کی پری
دل بدست آئے گی اور خاک بسر جائے گی

گلیوں بازاروں میں در آئیں گے کھلتے چہرے
پہ مرے دل کی کلی زرد سے بھر جائے گی

☆

چھپ سکی نہ لوگوں سے تیری کم نگاہی بھی
شہر بھر میں رُسوا ہے میری بے گناہی بھی

اَب تو صلح کر ڈالیں، کوئی دن کی مہماں ہے
تیری کج کلاہی بھی، میری بادشاہی بھی

دل کا پھول کیا کھلتا آنسوؤں کی شبنم سے
اُس نے تو بہا دی ہے آنکھ کی سیاہی بھی

اکثر اپنی حسرت کو خود ہی لُوٹ لیتا ہُوں
جادۂ وفا میں ہُوں راہزن بھی، راہی بھی

-☆-

نہ کوئی زخم لگا ہے، نہ کوئی داغ پڑا ہے
یہ گھر بہار کی راتوں میں بے چراغ پڑا ہے

عجب نہیں یہی کیف آفریں ہو شامِ ابد تک
جو طاقِ سینہ میں اک خُون کا ایاغ پڑا ہے

کبھی رُلائے گی اُس یارِ بے وفا کی تمنا
جو زندگی ہے تو صد لمحہ فراغ پڑا ہے

یہ ایک شاخچۂ غم سے اتنے پھول جھڑے ہیں
کبھی قریب سے گزرو تو ایک باغ پڑا ہے

-☆-

سدا بہار نہ تھے تیرے گل کدے ، لیکن
دلوں کے داغ دمکتے ہیں آج بھی تجھ بن

نجانے کب سے یہی گرمیوں کا موسم ہے
کڑکتی دھوپ ، دہکتی زمیں ، ہوا ساکن

ابھی جو کلبۂ شامِ الم سے نکلیں گے
تو بال کھولے کھڑی ہوگی رات کی ڈائن

کچھ ایسے قہر سے بدنامیوں کی لہر چلی
کہ پھر کبھی ترا ملنا نہ ہو سکا ممکن

وہ شام ، پہلے پہل جب ترا خط آیا تھا
دیارِ دل میں عجب لہر بہر تھی اُس دن

☆

در پہ سورج ہے کھڑا ، اُٹھ بیٹھو
سحرِ شب ٹوٹ چکا ، اُٹھ بیٹھو

چشمۂ صبح سے قطرہ قطرہ
گر رہی ہے یہ صدا: "اُٹھ بیٹھو"

لمحۂ امروز کا یہ سیلِ رواں
پھر تو آنے سے رہا ، اُٹھ بیٹھو

سرخوشِ خواب رہو گے کب تک
شہر بھر جاگ اُٹھا ، اُٹھ بیٹھو

پھر کسی درد نے پہلو بدلا
اور چپکے سے کہا: "اُٹھ بیٹھو"

☆

شبِ سیاہ میں اُمّید کا دیا بھی مَیں
نشانہ جستم موجہ صبا بھی مَیں

کڑکتی دھوپ میں صحراؤں سے گزرنے کا
مجھی کو علم ہُوا ہے ، برہنہ پا بھی مَیں

دکھا رہا ہُوں ابھی پچھلی رات کے تیور
جو میرے ساتھ چلو تو سحر نما بھی مَیں

بچا سکوں خس و خاشاک آرزو کیسے؟
یہاں شرار بھی مَیں ہُوں ، دمِ ہوا بھی مَیں

جناب کو نظر آیا ہے کون سا پہلو
کہ بجھتی راکھ بھی مَیں اور کیمیا بھی مَیں

-☆-

غم کا چرچا تو کرو ، زخم کو رُسوا تو کرو
کیا خبر راہ پہ آ جائیں ، تقاضا تو کرو

اَب بھی اُس وادیِ دُشوار کی جانب ہیں رواں
لوگ انبوہ در انبوہ ، تماشا تو کرو

اَب بھی وہ سروِ رواں راحتِ جاں ہے سب کا
اَب بھی کر سکتے ہو اُس کو چمن آرا ، تو کرو

ایک دَر بند ہُوا ہے تو نچلے بیٹھے ہو
راستے اور بھی ہیں ، چشمِ جنوں وا تو کرو

پھر وہی قافلۂ رنگِ فراواں اک دن
کیوں نہ اُترے گا یہاں؟ خُود پہ بھروسا تو کرو

عرصۂ عمر سے چپ چاپ گزر جانا کیا
موت کی تو نہ سہی ، زیست کی پروا تو کرو

-☆-

مہتاب میں نہ رہگزرِ کہکشاں میں تھا
تھی جس کی جستجو مرے عجزِ بیاں میں تھا

جس دل کو آج گنجِ اماں کہہ رہے ہیں لوگ
آسیبِ آرزو اسی اُجڑے مکاں میں تھا

کھویا ہے خود خرابۂ جاں میں اُسے کہیں
جو عکسِ نازنیں مری چشمِ تپاں میں تھا

دل کا پتا سرشکِ مُسلسل سے پُوچھیے
آخر وہ بے وطن بھی اسی کارواں میں تھا

اُڑتا پھرا ہوں شام تلک یُوں تو دُور دُور
لیکن ہر آن دھیان مرا آشیاں میں تھا

☆

پریوں ایسا رُوپ ہے جس کا، لڑکوں ایسا ناؤ
سارے دھندے چھوڑ چھاڑ کے چلیے اُس کے گاؤ

پکی سڑکوں والے شہر میں کس سے ملنے جائیں
ہولے سے بھی پانو پڑے تو بج اُٹھتی ہیں کھڑاؤ

آتے ہیں، کھلتا دروازہ دیکھ کے رُک جاتے ہیں
دل پر نقش بنا جاتے ہیں یہی ٹھٹکتے پانو

پیاسا کوا جنگل کے چشمے میں ڈوب مرا
دیوانہ کر دیتی ہے پیڑوں کی مہکتی چھاؤ

ابھی نئی بازی ہوگی، پھر سے پتا ڈالیں گے
کوئی بات نہیں جو ہار گئے ہیں پہلا داؤ

☆

سانولے بھانولے مکھڑے سے شرموں کے گھونگھٹ اُٹھاتے نہیں
دُور ہی دُور سے جی جلاتے ہیں اور پاس آتے نہیں

دل میں میٹھا، گھنا شہد ہے، آنکھ میں گھولتا زہر ہے
ہم بھی دیکھیں گے وہ کب تلک دل کو آنکھوں میں لاتے نہیں

یُوں تو سارے زمانے سے ہنس ہنس کے باتیں کریں گے، مگر
جانے کیا راز ہے، ایک ہم سے ہی نظریں ملاتے نہیں

کوئی تو شے شرارت بھری، کالی آنکھوں میں بے چین ہے
کچھ تو ہے جس پہ ہم شمعِ اُمید کی لَو بجھاتے نہیں

ہنستے گالوں کے گہرے نشیبوں میں کیا جانے کیا سحر ہے
ورنہ ہم سے پُرانے کھلاڑی تو یُوں مات کھاتے نہیں

-☆-

دل وہ بگڑا ہُوا بچّہ ہے کہ جو مانگے گا
گر اُسی وقت نہ دیں گے تو مچل جائے گا

رات پھر آئے گی، پھر ذہن کے دروازے پر
کوئی مہندی میں رنگے ہاتھ سے دستک دے گا

دھوپ ہے، سایہ نہیں آنکھ کے صحرا میں کہیں
دید کا قافلہ آیا تو کہاں ٹھہرے گا

وہ تو خوش بُو ہے، اُسے چُوم سکو گے کیسے
مر بھی جاؤ تو یہ ارماں نہ کبھی نکلے گا

دیکھ کر شمعِ تمنّا کی ضیا آنکھوں میں
مُسکرائے گا، مگر بات نہیں مانے گا

آہٹ آتے ہی نگاہوں کو جھکا لو، کہ اُسے
دیکھ لو گے تو لپٹنے کو بھی جی چاہے گا

-☆-

وقت بتلائے گا اک روز تجھے میں کیا ہوں
آگ ہوں، راکھ ہوں، خورشید ہوں، یا ذرّہ ہوں

داغِ دل تیرے چمن زار کا ہمسر نہ سہی
میں بھی چھوٹا سا خزانہ تو لیے پھرتا ہوں

تُو منقش ہے مری رُوح کی دیواروں پہ
مجھ سے چہرہ نہ چھپا، میں تو ترا پردہ ہوں

دُکھ کے آنکھوں میں کسی وادیِ دشوار کا عکس
نارسائی کے بیاباں میں پڑا جلتا ہوں

دن بھر احساس پہ چادر سی تنی رہتی ہے
شام ڈھلتی ہے تو شبنم کی طرح روتا ہوں

لہر آتی ہے، مرا عکس بہا جاتی ہے
ڈوب ہی جاؤں کہ مدّت سے لبِ دریا ہوں

☆

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تُو نہ ملا

غزالِ اشک سرِ صبح دُوب ہوگاں پہ
کب آنکھ اپنی کھلی اور لہو لہو نہ ملا

چمکتے چاند بھی تھے شہرِ شب کے ایواں میں
نگارِ غم سا مگر کوئی شمع رُو نہ ملا

اُنہی کی رمز چلی ہے گلی گلی میں یہاں
جنہیں اُدھر سے کبھی اذنِ گفتگو نہ ملا

پھر آج مے کدۂ دل سے لوٹ آئے ہیں
پھر آج ہم کو ٹھکانے کا ہم سبُو نہ ملا

☆

اَب اور چاہتا کیا ہے، مجھے بتا تو سہی
کہ میں نے تیرے تغافل کی ہر ادا تو سہی

گزر نہ جا مرے دل کے دیار سے چپ چاپ
عجیب دشت ہے یہ، اس میں خاک اُڑا تو سہی

مرا ہی عکس نہ ہو در پسِ خسِ مژگاں
یہ سوچتی ہوئی چلمن ذرا اُٹھا تو سہی

میں خون و خاک میں لتھڑا تجھے پکارتا ہوں
مجھے اُٹھا نہ سہی، آ کے دیکھ جا تو سہی

یہ سُوئے شامِ غریبی! یہ شورِ نالۂ دل!
سمجھ پڑے نہ پڑے، میں نے کچھ کہا تو سہی

☆

رات دیکھی ہے پگھلتی ہوئی زنجیر کوئی
مجھے بتلائے گا اس خواب کی تعبیر کوئی

پڑھنے بیٹھوں تو ابھر آئے گی ہر صفحے پر
بات کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی تصویر کوئی

سہما سہما ہے سجاوٹ میں ترا سانولا تن
سُرخیٔ لب ہے کہ ہے شعلۂ شب گیر کوئی

لے گیا جان کا آرام وہ رخصت کا سلام
شہرِ یاراں میں بھی رہنے لگا دلگیر کوئی

خونِ دل سے اُسے لکھا تو ہے خط، لیکن اب
اُسے پہنچانے کی بھی سوچے تدبیر کوئی

☆

آنکھوں میں لہرائے لالہ زار ، بہار آ گئی
جان ہُوئی اور بے قرار ، بہار آ گئی

شاخوں نے پھیلائی ہی تھیں برہنہ بانہیں ابھی
لے کے تر و تازہ برگ و بار ، بہار آ گئی

صبح چلیں مہکی ہوائیں تو ہر اک شہر سے
شور اُٹھا: "آ گئی بہار ، بہار آ گئی"

خُون کی سُرخی گُداز گالوں پہ رقصاں ہُوئی
دھوپ میں دہکے گُل و گُل زار ، بہار آ گئی

سوئے ہُوئے جذبے آنکھیں ملتے ہُوئے جاگ اُٹھے
سُونے دلوں میں پھر ایک بار بہار آ گئی

شہرِ غزل پہ فرازِ شام سے گرنے لگے
بھیگے رنگوں کے آبشار ، بہار آ گئی

آ ہی گیا خط کسی کا عطر میں ڈوبا ہُوا
مان گیا رُوٹھا ہُوا یار ، بہار آ گئی

-☆-

آپ ہی قزاق تھے ، خود ہی سے تھی مار دھاڑ
سو رہے آرام سے ، جب ہُوئی بستی اُجاڑ

ساتھ چلے کیا کوئی ، اے مہِ آوارگی
ایک تری دوستی ، سارے جہاں سے بگاڑ

داغ وِرثوں چاہیے ، سر میں جنوں چاہیے
شہر سے ناتا نہ توڑ ، لہر میں کپڑے نہ پھاڑ

دیکھ لیا ، خود نُما ! طُولِ سفر بھی بجا
مُنہ کا پسینا نہ پُونچھ ، پانو سے مٹی تو جھاڑ

ایک تو بے تیشہ ہُوں ، پھر یہ زوالِ جنوں!
کِس کے لیے چھوڑ دُوں ، آہ ! یہ اُونچا پہاڑ

-☆-

خُوشی مِلی تو یہ عالم تھا بدحواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا

چمک اُٹھے ہیں جو دل کے کلس، یہاں سے ابھی
گزر ہُوا ہے خیالوں کی دیوداسی کا

گزر نہ جا یونہی رُخ پھیر کر، سلام تو لے
ہمیں تو دیر سے دعویٰ ہے رُوشناسی کا

خُدا کو مان، کہ تجھ لب کے چُومنے کے سِوا
کوئی علاج نہیں آج کی اُداسی کا

گرے پڑے ہُوئے پتّوں میں شہر ڈھونڈتا ہے
عجیب طور ہے اِس جنگلوں کے باسی کا

-☆-

چھوٹی خُوشی سہی، وہ کہیں دیکھتا نہ ہو
یُوں زور زور سے نہ ہنسو، سُن رہا نہ ہو

موسم کی بے حسی تو کچھ ایسی گراں نہ تھی
آنسو کے آئنے میں وہی بے ادا نہ ہو

کیا جانتے تھے جی میں سمائے گا اس طرح
جو شوخ ابھی کچھ ایسا جواں بھی ہُوا نہ ہو

کاغذ پہ لکھ کے پڑھتے رہتے ہیں اُس کا نام
جو خواب میں بھی ہم سے کبھی آشنا نہ ہو

کب تک چلے گی دُور کی خوش بُو سے دوستی
دُنیا اُجاڑ ہوتی ہے جس دن ہُوا نہ ہو

دیکھا نہ جائے شوق کا جلتا ہُوا یہ شہر
اَب تو مِلیں گے اُس سے جو مِل کر جُدا نہ ہو

-☆-

ٹھہری ہوئی تھی دل و جگر تک
پہنچی ہے جو آگ بال و پر تک

بچپن ہے وہی شباب میں بھی
سوتا ہے وہ شوخ دوپہر تک

آگے بھی تو کتنی منزلیں ہیں
نالے کی تو دوڑ تھی اثر تک

یہ قرب ہی فاصلہ ہے اب کے
سو کوس ہیں شاخ سے شجر تک

دھندلا گئی آنکھ، چھپ گئے چاند
جلووں کا جہان تھا نظر تک

یوں دل سے گزر گیا ہے کوئی
حیران ہے خاکِ رہگزر تک

زندانیِ غنچہ ہی رہے ہم
پوچھی نہ ہواؤں نے خبر تک

☆

فروغِ جسم نہ رنگینیِ قبا دیکھوں
جو دیکھ پاؤں تو ان سب سے ماورا دیکھوں

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو ٹھنڈ پڑ جائے
اگرچہ لاکھ رمِ شعلۂ حنا دیکھوں

وہ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتاب کی صورت
ہر ایک لفظ، ہر اک نقش کی ادا دیکھوں

بریدہ زلف کے کنڈل، وہ پیچ پیچ بھنور
کبھی تجھے بھی وہاں ڈوبتا ہوا دیکھوں

وہ دن بھی ہو کہ کڑی دوپہر میں، آنکھوں کے
اُداس دشت میں تجھ کو برہنہ پا دیکھوں

وہ شب بھی ہو، تجھے بانہوں میں لے کے ساری رات
میں تجھ کو یاد کروں، تیرا راستہ دیکھوں

بدن سے پیرہنِ خاک اُتار کر اک بار
تری بجھی ہوئی آنکھوں میں آئنہ دیکھوں

پہنچ تو جاؤں ترے شہر تک، مگر اے کاش
برونِ شہر تجھے منتظر کھڑا دیکھوں

☆

روش روش رواں ہُوئی ہیں رنگ دار صُورتیں
مہک اُٹھی ہیں شام سے ہی گُل عذار صُورتیں

بَرسے گی قُمقُموں کی دُودھیا پھوار رات بھر
یُونہی بنی رہیں گی ماں کا سنگار ، صُورتیں

چمک جھمک رہے ہیں سُرخ ، زرد ، سُرمئی مکاں
کھُلی ہیں کھڑکیاں ، کھڑی ہیں تاب کار صُورتیں

جلو میں جھلملاہٹوں کے کارواں لیے ہُوئے
گُزر رہی ہیں موڑوں میں ، زرنگار صُورتیں

بہشت کی سرشت دے رہی ہیں خاک وحشت کو
نظارہ بار صُورتیں ، ستارہ وار صُورتیں

جوانیوں کے زور میں ، روائتوں کے شور میں
منائے جا رہی ہیں جشنِ رہگوار صُورتیں

ابھی تو رقص کر رہی تھیں کُوچہ خیال میں
کہاں چلی گئیں ، قطار در قطار ، صُورتیں

پڑے رہو تو ہیں یہی اُداسیاں ، نراسیاں
اُٹھو تو جان کے قرار کی ہزار صُورتیں

-☆-

جہاں نگارِ سَحَر پیرہن اُتارتی ہے
وہیں یہ رات ستاروں کا کھیل ہارتی ہے

شبِ وصال ترے دل کے ساتھ لگ کر بھی
مری لُٹی ہُوئی دُنیا مُجھے پکارتی ہے

خُمارِ شوق میں اُبھی ہُوئی شعاعِ نظر
ہزار رُوٹھتے رنگوں کے رُوپ دھارتی ہے

اُفُق سے پھُوٹتے مہتاب کی مہک جیسے
سکونِ بحر میں اک لہر سی اُبھارتی ہے

پسِ دریچہ دل یاد ہُوئے ہُوئے نشاط
نہ جانے کب سے کھڑی کاکلیں سنوارتی ہے

درِ اُمید سے ہو کر نکلنے لگتا ہُوں
تو یاس روزنِ زنداں سے آنکھ مارتی ہے

جہاں سے کُچھ نہ ملے حُسنِ معذرت کے سوا
یہ آرزو اُسی چوکھٹ پہ شب گزارتی ہے

جو ایک جسم جلاتی ہے برق، ابرِ خیال
تو لاکھ زنگ زدہ آئنے نکھارتی ہے

-☆-

دل کی صدا پکارتی ہے رات بھر کسے
گوشۂ سینہ میں شعلہ ملا بھی ، مگر کسے

ماتھے کے گھاو ہی نے کیا اتنا شرمسار
اس حال میں دکھایئے زخمِ جگر کسے

سایے بھی جل کے راکھ ہوئے ، اتنی دھوپ ہے
اس دوپہر میں ڈھونڈتے ہو بام پر کسے

سیلاب تھا ، یہاں سے بھی ہو کر نکل گیا
اب یاد ہے شکستنِ دیوار و در کسے

مقصد ہے آب و دانہ ، تہِ دام ہی سہی
ایسی فضاؤں میں ہوسِ بال و پر کسے

دل کا علاج خود ہی کیا چاہیے ، کہ اب
اس بت کے بعد کیجیے گا چارہ گر کسے

سینہ ہے اور سانس کی تلوار ہے ظفر
اس معرکے میں فرصتِ عرضِ ہنر کسے

☆

ہزار ربط بڑھائیں خیالِ خام سے ہم
نکل نہ پائیں گے تنہائیوں کے دام سے ہم

جو شامِ غم میں لبوں پر لرز گیا کئی بار
کبھی کے بھاگے ہوئے تھے اس ایک نام سے ہم

شبِ خمار تھی ، مے تھی ، بہار تھی ، لیکن
لپٹ کے سو رہے عکسِ فروغِ جام سے ہم

الجھ رہیں گے کسی اور بحرِ بے تہ میں
نکل بھی جائیں اگر سیلِ صبح و شام سے ہم

یہ اور بات کہ صحبت ہی مل گئی ایسی
وگرنہ شہر میں آئے تھے اپنے کام سے ہم

جو دوسروں کے لیے آبدار رکھتے تھے
ہوئے ہیں قتل اسی تیغِ بے نیام سے ہم

رواں دواں رہی دنیا مثالِ مور و مگس
اتر کے دیکھ نہ پائے فرازِ بام سے ہم

ہمارے زخمِ نہاں پر فسردہ ہو نہ کوئی
ہیں پُربہار اسی نقشِ ناتمام سے ہم

ہمارے شعر ہمیں پر نہ کھل سکیں شاید
ڈرے ہوئے ہیں کچھ ایسے قبولِ عام سے ہم

☆

سخن سرائی تماشہ ہے، شعر بندر ہے
خلل کی مار ہے، شاعر نہیں، مچھندر ہے

ہے جستجو کبھی اپنا بھی عکسِ رخ دیکھوں
تری تلاش نہیں، تو تو میرے اندر ہے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہے بے حسی دل کی
ہزار کہتے پھریں مست ہے، قلندر ہے

مزے کی بات ہے، اُس کو بھجن سکھاتے ہیں
جو خود ہی مورتی ہے اور خود ہی مندر ہے

جزیرۂ جہلا میں گھرا ہوا ہوں ظفر
نکل کے جاؤں کہاں، چار سو سمندر ہے

☆

بزمِ سخن میں ہم پہ نہ اٹھی نگاہ بھی
احباب اگرچہ کرتے رہے واہ واہ بھی

کل پھر وہ موجِ آب کی صورت نکل گیا
حائل نہ ہو سکی ہوسِ بے پناہ بھی

دل خوں اگر نہ ہو تو یہاں پوچھتا ہے کون
لے کر پھرا کرے کوئی حالِ تباہ بھی

بیدل نہ ہو کہ ریگِ بیابانِ یاس پر
صد خیمۂ بہار ہے برگِ گیاہ بھی

وہ دن بھی تھے کہ بادیہ پیمائی شغل تھا
اب جاں گداز ہے سفرِ گاہ گاہ بھی

جو اشک تھا سو تختِ ہوا پہ بکھر گیا
ٹوٹا فسونِ گریۂ ابرِ سیاہ بھی

بے جا ستم نہ ڈھاؤ کہ اب جانتا ہوں میں
اس شہرِ بے اماں سے نکلنے کی راہ بھی

☆

بچا نہ کوئی بھی ، غوّاص کیا ، شناور کیا
جو بحر ہی میں نہیں ، پاؤ گے وہ گوہر کیا

اُس آفتاب کی رونق نہیں مقدّر میں
تو ایسی چہرہ شبی میں سجایئے گھر کیا

ہے دل کے چاروں طرف آبِ تازہ کی خوش بُو
برس گیا ہے کوئی ابر اس زمیں پر کیا؟

نگاہ میں وہی بے برگ شاخ پھرتی ہے
بنا ہے اب کے بھری زندگی کا محور کیا

خزاں نے جیب و گریباں جلا کے خاک کیے
اب آ بھی جائے تو ہم کو بہار کا ڈر کیا

فساد سارے بدن میں رچا ہُوا ہو جہاں
وہاں ، بتاؤ ، کرے ایک نوکِ نشتر کیا

جزا خود آئنہ نازک ہے ، میری جان ، ظفر
تُو دُوسروں کی طرف پھینکتا ہے پتھر کیا

-☆-

سفر کٹھن ہی سہی ، جان سے گزرنا کیا
جو چل پڑے ہیں تو اب راہ میں ٹھہرنا کیا

جو دل میں گونجتی ہو ، آنکھ سے جھلکتی ہو
کسی کے سامنے اُس بات سے مُکرنا کیا

ابھی رواں دواں لہروں پہ زندگی کٹ جائے
ہو تیرا ساتھ میسّر تو پار اُترنا کیا

ملے نہ گوہرِ مقصود ڈوب کر بھی اگر
تو لاش بن کے پھر اُس بحر سے اُبھرنا کیا

جس آبِ رود کی اوقات چند قطرے ہو
تو اُس کو پھاندنا کیا ، اُس میں پانو دھرنا کیا

جہاں غرورِ ہنر پروری ہو پنبۂ گوش
وہاں تکلّفِ عرضِ نیاز کرنا کیا

فسادِ خلق بھی ہنگامہ دیدنی تھا ظفر
پھر ایک بار وہی شوشہ چھوڑ ، ڈرنا کیا

-☆-

اب کی بہار میں تو عجب ماجرا ہُوا
زخموں کا باغ ایک ہی شب میں ہرا ہُوا

آ دیکھ میرے سینے میں ہے دل ہی دل تمام
اور وہ بھی تیرے شور و شغب سے بھرا ہُوا

صحرائے دل میں خاک اُڑاتی ہیں خواہشیں
ہر ذرّہ اس دیار کا وحشت سرا ہُوا

دُنیا کے کاروبار میں لگتا نہیں تھا دل
دُکانِ شوق میں بھی کھوٹا ، کھرا ہُوا

سچ ہے ، شفق کی آگ جلاتی نہیں ، مگر
مَیں ہوں کسی کے رنگِ حنا کا ڈرا ہُوا

روشن ہے اُس کی یادِ شبِ برشگال میں
طاقِ خیال میں یہ دیا سا دھرا ہُوا!

کوئی تو لے گیا تری نیندوں کی نرمیاں
اے حیلہ جُو وہ مَیں نہ ہُوا ، دُوسرا ہُوا

-☆-

دینے والے ، مجھے یہ دردِ خوش آغاز نہ دے
یا فغاں کے لیے اُجڑا ہُوا انداز نہ دے

دل برباد سہی میرا مقدّر ، لیکن
اس خوشی میں مجھے ٹوٹا ہُوا ساز نہ دے

آن کر سایۂ دیوار میں بیٹھا ہوں ابھی
پھر مرے ہاتھوں میں تصویرِ تگ و تاز نہ دے

سیرِ افلاک مجھے راس نہیں آئے گی
خاک کا ڈھیر ہوں مَیں ، مجھ کو یہ اعزاز نہ دے

تُو کرِ حسرت سے مجھے ڈھونڈے گا ، پچھتائے گا
آج بہتر ہے جو مجھ کو پرِ پرواز نہ دے

مَیں ہَوا ہوں ، مجھے گلیوں سے گزرنا ہے ابھی
اے گُلِ سُرخ ، مجھے اپنا کوئی راز نہ دے

اِسی زنجیرِ زمستاں سے لپٹ کر سو جا
رُوٹھ کر جاتے ہُوئے شعلے کو آواز نہ دے

نقدِ دل تھا ، سو ظفرؔ ، سکّۂ باطل نکلا
اب روا ہے جو وہ یاقوت لب ناز نہ دے

-☆-

رَو میں آئے تو وہ خود گرمیِ بازار ہوئے
ہم جنھیں ہاتھ لگا کر ہی گنہ گار ہوئے

دن کا دیدار بھی فردوسِ نظر تھا ، لیکن
رات چمکی تو عجب نقش نمودار ہوئے

تھا ہمیں کے لیے اَن دیکھے دیاروں کا سفر
لیکن اس بار تو کچھ یار بھی تیار ہوئے

اُنھیں اس دور میں دعویٰ ہے مسیحائی کا
ہم جنھیں دُور سے ہی دیکھ کے بیمار ہوئے

آج تسخیرِ مہ و مہر کی دھن ہے اُن کو
جن سے اس دشت کے ذرّے ہی نہ بیدار ہوئے

اِس دل میں نہ بچی بوند لہو کی ، ورنہ
رات محفل میں کئی جام نگوں سار ہوئے

نہ مِلا ، گوہرِ گفتار ہمیں کو نہ مِلا
ہم تو اِن گونجتی گلیوں میں عبث خوار ہوئے

غیر بھی پھولوں سے ہلکے تھے کبھی اس دل کو
آج یہ حال کہ احباب گراں بار ہوئے

دشمنی ہے تو ظفر ، سامنے آؤ ، یہ کیا
جب ہوئے اپنے ہی سے برسرِ پیکار ہوئے

☆

کچھ بادشہ کا ہے یہاں زور بھی بہت
کچھ یار ہیں مچائے ہوئے شور بھی بہت

ڈھونڈو اگر تو وحشتِ بے رنگ ہی نہیں
ان جنگلوں میں ناچتے ہیں مور بھی بہت

سوچو اگر تو کم نہیں آنکھوں کے چاند بھی
دیکھو اگر تو رات ہے گھنگور بھی بہت

سو بار دل میں کشتِ وفا بوئیے ، مگر
یہ دیکھ لیں کہ ہے یہ زمیں شور بھی بہت

آخر کو خود ہی اپنی نظر میں سما گئے
دیکھا ہے ورنہ ہم نے تری اور بھی بہت

ٹوٹا مکاں سہی ، مگر اپنا تو ہے میاں
اس دورِ سخت میں تو ہے یہ ٹھور بھی بہت

لرزا گیا ہے سایۂ خورشیدِ عمر بھی
سہما رہی ہے تیرگیِ گور بھی بہت

بے جا نہ یوں اچھالتے پھریے متاعِ فکر
اس دشتِ بے کنار میں ہیں چور بھی بہت

ویسے تو کہہ ہی لیتا ہے اچھی غزل ظفر
ہوتے ہیں بعض شعر مگر بور بھی بہت

☆

کبھی ہجومِ ہوس میں ہو گلبدن ہونا
تو منتظر ہی ملے گا اُداس بن ہونا

تمام عمر پھرے دل کے آس پاس ، مگر
نصیب میں نہ ہُوا اہلِ انجمن ہونا

وہی ہے اپنے بھی سر میں خمارِ تیشہ طلب
ہمیں بھی راس نہ آئے گا کوہکن ہونا

بنی ہے رات کہ آرام کر سکے دُنیا
نہ یہ کہ اُس کے لیے دل میں سو گمن ہونا

یہ موجِ آہ ، جسے رائیگاں سمجھتے تھے
اسی کے دم سے میسّر ہُوا چمن ہونا

☆

جو غم ملا جبیں کے شکن میں چھپا لیا
دل سی گداز چیز کو پتھر بنا لیا

جو آہ تھی شکستہ شی ساتھ لے گئی
جو اشک تھا ہوائے سحر نے اُڑا لیا

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات
نکلی برونِ شہر تو بارش نے آ لیا

ایسے ہے جیسے آنکھ سے بینائی اُڑ گئی
ایسے ہے جیسے دل نے کوئی بھید پا لیا

اک میں ہی واہمہ نہیں ، تُو بھی فریب ہے
اپنی ہی ذات سے ہے ترا بھی پتا لیا

اک عمر جس کی مار پہ رہ کر بچے رہے
پہنچے تھے اوٹ میں کہ وہی تیر کھا لیا

ہم بھی شکستِ شوق پہ نالاں رہے ، مگر
دل نے تو آسمان ہی سر پر اُٹھا لیا

ہم نے ، کہ بختِ خفتہ نہ جاگ اُٹھے ، اے ظفر
معمورۂ ازل سے دلِ بے صدا لیا

☆

دن سُنے برسا رہے ہیں داد بھی ، بیداد بھی
حاتمِ دوراں ہیں اپنے دور کے نقاد بھی

جس طرح جنّات گزرے ہوں ابھی اس شہر سے
دور تک ملتی نہیں ہے بُوئے آدم زاد بھی

اک طرف پُرشور گلیاں ، اک طرف ملبے کے ڈھیر
دل کو مت پُوچھو ، کہ ہے برباد بھی ، آباد بھی

بات سچی ہے ظفر ، اس میں چمن کا کیا قصور
آپ ہی بُلبُل ہے تُو اور آپ ہی صیّاد بھی

-☆-

وہ ایک عکس کہ آئینہ نظر میں نہیں
وگرنہ کون سی شے ہے جو اپنے گھر میں نہیں

نشے میں جتنے مناظر دکھائے تھے دل نے
فغاں ، کہ ایک بھی دامانِ چشمِ تر میں نہیں

مجھے آج دور سے کہسار کا نظارہ کروں
کہ آج تاب و تواں میرے بال و پر میں نہیں

جو دُود تیرہ شبی میں دکھائی دیتا ہے
وہ پیچ و تاب ابھی شعلۂ سحر میں نہیں

ہزار سایہ ہوا دار بھی ، گھنا بھی ہے
مگر جو بات تھی دیوار میں ، شجر میں نہیں

وہ ایک قطرہ ، وہ اک ذرّہ ہی سہی ، لیکن
مَیں جس کو ڈھونڈتا ہوں ، تیرے بحر و بر میں نہیں

برے ہی دل کا جہنم جلا گیا مجھ کو
کہ اتنے زور کی آتش ترے شرر میں نہیں

-☆-

سبزۂ گلزار پہ پھیلا ہے جس کو خواب میں
روشنی کے رنگ تھے اُس گوہرِ نایاب میں

بادۂ منزل سے بھی مخمور تھا سارا بدن
راستے بھر کی تھکن بھی تھی مرے اعصاب میں

آج کی شب دل کی ہے زور آزمائی غم کے ساتھ
شام ہی سے ٹھن گئی ہے رستم و سہراب میں

کچھ بھرے دریاؤں میں بھی تھی نہ ایسی کیفیت
جو بھنور پیدا ہوئے ہیں اس دلِ پایاب میں

چپ رہو ، گر معترض بھی ہوں مدیرانِ کرام
مستند سمجھو انھی کو شاعری کے باب میں

-☆-

زخم کو منظر بناؤں ، چشم کو عریاں کروں
نیند فرصت دے تو کوئی عیش کا ساماں کروں

میں ، کہ بحرِ بے کراں قطرہ دکھائی دے مجھے
یہ ہنر مجھ میں کہاں ، قطرے کو بے پایاں کروں

وہ تو وہ ، اُس کی مہک بھی اس طرف آئی نہیں
اب دلِ بے خواب سے کوئی نیا پیماں کروں

تشنگی بھی ہے ، مگر دل میں ندیدہ پن بھی ہے
ابر سے گر بھیک مانگوں ، دشت کو داماں کروں

تنگ ظرفی نے مجھے تیرے ہی جیسا کر دیا
ورنہ میں چاہوں تو کتنی مشکلیں آساں کروں

تیرے میرے درمیاں ہیں آسماں پھیلے ہوئے
کیا تجھے دل میں بٹھاؤں ، کیا جزا ارماں کروں

-☆-

کسی کے ساتھ اگر دو قدم بھی چلتا ہوں
تو خود نمائی کے صحرا میں جا نکلتا ہوں

ہزار عذر تراشے بہار لالہ فروش
میں اپنا حصّہ گلستاں سے لے کے ٹلتا ہوں

ابھی تو راہ پہ نکلا ہوں لڑکھڑاتا ہوا
ابھی خبر نہیں، گرتا ہوں یا سنبھلتا ہوں

کسی نے آئنے میں بھی اُتار کر نہ دیا
وہ چاند، جس کے لیے رات بھر مچلتا ہوں

جو دل سے دُور ہیں، آنکھوں کا نُور ہیں وہ لوگ
جو دلنشیں ہیں اُنھیں دیکھ دیکھ جلتا ہوں

کبھی وہ لعل گنوایا تھا اس خرابے میں
کہ اب بھی سوچتا ہوں اور ہاتھ ملتا ہوں

کسی گئے ہوئے موسم کے داغ ہیں دل پر
نہال خشک ہوں میں، پھولتا نہ پھلتا ہوں

مری غزل مرے دوزخ کا ایک شعلہ ہے
کہ آگ پھانکتا ہوں، آگ ہی اُگلتا ہوں

☆

وہ جان مانگے تو دے دو، اسی پہ بس کیا ہے
جو پھنس گئے ہو تو اب اور پیش و پس کیا ہے

چلو وہ شوخ تو بیگانہ ہی سہی، لیکن
یہ دل تو غیر نہیں، اس پہ اپنا بس کیا ہے؟

جو ٹھن گئی ہے تو اب ہے سوال عزت کا
وگرنہ اُس سے گلے ملنے کی ہوس کیا ہے

تجھے جگائے تو شاید کوئی ڈراؤنا خواب
وگرنہ تیرے لیے شورش جرس کیا ہے

تری نگاہ میں ہے آب و تاب و روغن و رنگ
تجھے خبر ہی نہیں زندگی کا مس کیا ہے

میں وہ کہ محبسِ امکاں سے بھی نکل جاؤں
مری نظر میں یہ ٹوٹا ہوا قفس کیا ہے

زبانہ رکھتا ہوں مُنہ میں، ظفر، بجائے زباں
تمھیں کہو، مرے آگے یہ خار و خس کیا ہے؟

☆

اُس کی ہر طرزِ تغافل پہ نظر رکھتی ہے
آنکھ ہے، دل تو نہیں، ساری خبر رکھتی ہے

لب تک آئے گی، مگر آ کے پلٹ جائے گی
ٹوٹا پھوٹا سہی، یہ آہ بھی گھر رکھتی ہے

دل سے اُبھرا ہے جُدائی کا چمکتا سورج
رات بھی آج تب و تابِ سحر رکھتی ہے

چاند کی چاندنی دیتی ہے قرار آنکھوں کو
دل کی موجوں کو مگر زیر و زبر رکھتی ہے

مُجھ سے آگے ہیں مرے ساتھ نکلنے والے
اک یہی بات مجھے گرمِ سفر رکھتی ہے

تُو نے، اے منتظرِ مرگ، نہ سوچا، ورنہ
زندگی بھی اسی وادی میں گزر رکھتی ہے

بے دلی تیری کوئی دم کی ہے مہمان، کہ یہ
تودۂ برف ہے، سینے میں شرر رکھتی ہے

☆

اُسے منظور نہیں، چھوڑ، جھگڑتا کیا ہے
دل ہی کم مایہ ہے اپنا تو اکڑتا کیا ہے

اپنے سوئے ہوئے سُورج کی خبر لے جا کر
اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے

جانتا ہے کہ اُتر جائے گی دل میں مری بات
ورنہ سُن لے تو بتا تیرا بگڑتا کیا ہے

شبنمِ تازہ ہے یہ، پھول ہیں، یا پتے ہیں
دیکھ شاخِ شجرِ شام سے جھڑتا کیا ہے

دو قدم ہے شبِ غم سے شبِ وعدہ، اے دل
چند آہوں کے سوا راہ میں پڑتا کیا ہے

دل تو بھرپور سمندر ہے ظفر، کیا تجھے
دو گھڑی بیٹھ کے رونے سے بگڑتا کیا ہے

☆

اور، یہ اُفتاد ہے کیسی، اُسی سے رم بھی ہے
جس کا اک دیدار میرے زخم کا مرہم بھی ہے

دُور کے جلووں پہ مچھوتا ہُوا ہے دل کے ساتھ
گو سمجھتا ہُوں کہ جینے کے لیے یہ کم بھی ہے

دل سے ہنس ہنس کے نہ یُوں باتیں کرا ے پردہ نشیں
ایک تو رُسوا بہُت ہے، پھر یہ نامحرم بھی ہے

کِتنے ہنگاموں سے برپا کر رہا ہُوں جشنِ مرگ
کوئی کیوں جانے کہ مُجھ کو زندگی کا غم بھی ہے

کون ہُوں مَیں، اور کہاں ہُوں؟ کُچھ تو بتلاتا مُجھے
میرے بَس مصرف یہ دل، سو بار جامِ جم بھی ہے

دل میں خُوش بُوئے گُنہ بھی ہے رواں چاروں طرف
اِس زمیں کا چپّا چپّا دامنِ مریم بھی ہے

قطرے کو مت دیکھ، اپنے ظرف کا اندازہ کر
ڈوبنا چاہے تو یہ تیرے لیے قلزم بھی ہے

زُلف کی زنجیر میں جکڑے ہُوئے ہیں تیرے پانو
کیا تماشا ہے کہ تیرے ہاتھ میں پرچم بھی ہے

ٹُوٹنے پایا نہیں اپنی خموشی کا طلسم
ورنہ یاروں کی نوا میں شورشِ پیہم بھی ہے

☆

دل کا یہ دشت عرصۂ محشر لگا مُجھے
مَیں کیا بلا ہُوں، رات بہُت ڈر لگا مُجھے

آگے بھی عشق میں ہُوئیں رُسوائیاں، مگر
اب کے وفا کا زخم جبیں پر لگا مُجھے

اے دل وہ مہرباں ہے، یُونہی بدگماں نہ ہو
مارا تھا اُس نے غیر کو پتھر، لگا مُجھے

ہر سُو ترے وجُود کی خُوش بُو تھی خیمہ زن
وہ دن، کہ اپنا گھر بھی ترا گھر لگا مُجھے

ہنس کر نہ ٹال جا، کہ یہ اُمّید کی کِرن
وہ تیر ہے کہ سینے کے اندر لگا مُجھے

تاریکیِ حیات کا اندازہ کر، کہ آج
داغِ شکست مہر منوّر لگا مُجھے

سانچے تو تھے غزل کے سِوا بھی، مگر ظفر
کیا جانے کیوں یہ ظرف حسیں تر لگا مُجھے

☆

بجا کہ تختِ ہوا پر تری نشست بھی ہے
مگر یہ راز کہ تُو آشیاں پرست بھی ہے

تجھے اُٹھائے گی کیا فکرِ فتنۂ فردا
کہ تیرے سر میں ابھی نشۂ اَلَست بھی ہے

نہ توڑ سِلسلۂ آہِ سرد کو، ناداں
اِس ایک موج سے دل کی کشاد و بست بھی ہے

تمام شورِ تمنّا، تمام تر فریاد
یہ دل، کہ دُور سے دیکھو تو حال مست بھی ہے

حدِ نگاہ سے آگے ہے وصل کا مہتاب
طلسمِ شوق سے نکلو تو ایک جست بھی ہے

غنی ہو جن کی زمان و مکاں سے شام و سحر
بھلا انھیں کوئی پروائے بُود و ہست بھی ہے

ظفر کو دست و گریباں ہی پاؤ گے سب سے
مگر حریمِ ہوس میں، کہ دل بدست بھی ہے

☆

نہیں، کہ اُونچی ہوا میں کبھی سفر نہ کیا
نظر زمیں پہ رکھی، نازِ بال و پر نہ کیا

یہ سب ہیں کہنے کی باتیں، مَیں لامکاں بھی سہی
کیا ہی کیا ہے اگر اُس کے دل میں گھر نہ کیا

کوئی خرابۂ دل سے گزر گیا چُپ چاپ
ذرا بھی ماتمِ دیوار و بام و در نہ کیا

فقط مجھے دلِ وحشی عطا کیا، لیکن
مجھی کو ریگِ بیاباں سے بہرہ ور نہ کیا

لگی ہے سر پہ تو جاگا ہوں خواب سے، ورنہ
نوائے نرم نے اِس خاک پر اثر نہ کیا

اُسی میں تُندیِ طوفاں کی آتشیں تھیں، مگر
سکوتِ بحر نے بھی مجھ کو باخبر نہ کیا

سُنا گیا ہوں فسانے یہاں وہاں کے ظفر
پتے کی بات نہ کی، قصّہ مختصر نہ کیا

☆

کبھی تسلیم ہے ، اے منصفِ تیرہ ، مجھے
اپنے بھی شعر کی دکھلا کبھی تاثیر مجھے

مَیں کِسی نرم اشارے کا تمنائی ہُوں
اور وہ آ کے سُنا جاتے ہیں تقریر مجھے

کِتنے نادیدہ مہ و مہر تھے میرے دل میں
یہی حسرت رہی ، کرتا کوئی تسخیر مجھے

مَیں ترے پاس تو ہُوں ، تُجھ سے جُدا ہو کر بھی
یہی سمجھاتی ہے شب بھر تری تصویر مجھے

جیسے بے وجہ نہ ہوں دل کے یہ سناٹے
جیسے معلوم ہو اس خواب کی تعبیر مجھے

ایک جھونکے سے لرز جاتی ہے بنیاد مری
کون سی شاخ پہ تُو نے کِیا تعمیر مجھے

جوشِ گُل میں کبھی پُوچھا نہیں نادانوں نے
پھُول مُرجھائے تو کرنے لگے زنجیر مجھے

مَیں تو اس طرفہ کمیں گاہ سے واقف تھا بہت
کھینچ لائی ہے یہاں پانو کی زنجیر مجھے

لے چلو خطۂ اوکاڑہ میں مُجھ کو ، کہ ظفر
مرضِ غم میں وہی خاک ہے اکسیر مجھے

-☆-

بس ایک بار کِسی نے گلے لگایا تھا
پھر اُس کے بعد نہ مَیں تھا ، نہ میرا سایا تھا

گلی میں لوگ بھی تھے ، میرے اُس کے دُشمن لوگ
وہ سب پہ ہنستا ہُوا میرے دل میں آیا تھا

اُس ایک دشت میں سو شہر ہو گئے آباد
جہاں کِسی نے کبھی کارواں لُٹایا تھا

وہ مُجھ سے اپنا پتا پُوچھنے کو آ نکلے
کہ جن سے مَیں نے خُود اپنا سُراغ پایا تھا

مرے وجُود سے گُلزار ہو کے نکلی ہے
وہ آگ ، جس نے ترا پیرہن جلایا تھا

مُجھی کو طعنۂ غارت گری نہ دے ، پیارے
یہ نقش مَیں نے ترے ہاتھ سے بنایا تھا

اُسی نے رُوپ بدل کر جگا دیا آخر
جو زہر مُجھ پہ کبھی نیند بن کے چھایا تھا

ظفر کی خاک میں ہے کِس کی حسرتِ تعمیر
خیال و خواب میں کِس نے یہ گھر بنایا تھا

-☆-

حریفِ آتشِ پنہاں یہ چشمِ تر نہ سہی
جگر بھی اک شعلہ ہے، برونِ در نہ سہی

کھڑا تو ہوں سرِ رہ، ٹوٹ کر گرا تو نہیں
نہیں مقدر میں میرے برگ و بر، نہ سہی

جو خار و خس پھیلے ہیں یہاں وہاں، تجھ سے
جدا نہیں، تجھے اس بات کی خبر نہ سہی

فرازِ بام سے ہی دے کبھی نوید تو تو
بہار ہو کر یوں پاس سے گزر نہ سہی

بدن پہ سوچتے ساحل کی نرم ریت ہی مل
ہرے سمندر کی رُوح میں اتر نہ سہی

برہنہ ہو کے کبھی دھوپ سے وصال تو کر
یہ اجنبی سُورج تیرا ہم سفر نہ سہی

یہ سبزۂ سرکش، اس کو پایمال تو کر
دمیدہ گلشن میں رات بھر ٹھہر نہ سہی

یہ گھر کی کیا حالت ہے، ذرا خیال تو کر
ترا بھی حصّہ ہے اس میں، تمام تر نہ سہی

میں چپ رہوں تو ظفرؔ میری موت ہے اس میں
بھی فغاں میری جاں ہے، پُر اثر نہ سہی

☆

سچ ہے کہ میرے چاروں طرف جھمگھٹا بھی ہے
میں پوچھتا ہوں: ''کیا کوئی میرے سوا بھی ہے؟''

دل سے گزر گیا ہے جو بیگانہ وار آج
وہ صُورت آشنا ہی نہیں، آشنا بھی ہے

خوش ہے وہ اپنے گھر میں، چلو ٹھیک ہے، مگر
اتنی سی بات نے مجھے تڑپا دیا بھی ہے

آنکھوں کے شور و غل میں سنائی نہ دی مجھے
ورنہ شکستِ شیشۂ دل کی صدا بھی ہے

یہ دل بُرا سہی، سرِ بازار تو نہ کہہ
آخر تُو اس مکان میں کچھ دن رہا بھی ہے

☆

شام سے تنہا کھڑا ہوں اُدھ کھلے در کی طرف
آنکھ بھر کر دیکھ بھی لیتا ہوں بستر کی طرف

دہر کی ہمدردیوں کا بوجھ لے ڈوبا مجھے
کیوں اشارہ کر دیا سینے کے پتھر کی طرف

یوں ہی بے آباد لگتا ہے یہ بوسیدہ مکاں
ورنہ کس نے جھانک کر دیکھا ہے اندر کی طرف

کس نے دروازے کے شیشوں پر سیاہی پھیر دی
دیکھ بیٹھے تھے کبھی کس ماہ پیکر کی طرف

کون بے پردہ ہوا آنکھوں کے ویراں دشت میں
کس نے چھینٹے رنگ اُس بے نور منظر کی طرف

سب سُنہرے، سبز جنگل کی فضا میں کھو گئے
رُخ نہیں کرتا کوئی اُجڑے ہوئے گھر کی طرف

آج میں منزل نہیں ہوں، راہ کا پھیلاؤ ہوں
آج ہے میرا سفر اندر سے باہر کی طرف

ورنہ اِس آئینے میں صورت اُسی کی تھی ظفرؔ!
اُس نے دیکھا ہی نہیں آنکھوں کے جوہر کی طرف

☆

چلے ہیں تیرے لیے تیر شش جہات سے کیا
گِلہ ہے، یار، تجھے ایک میری ذات سے کیا

میں تیرے خون میں بجلی کی نرم رو ہی سہی
خبر بھی ہے مرے رشتے ہیں کائنات سے کیا

پگھل پڑے کہ بکھر جائے، تجھ سے کیا مطلب
تُو سنگ دیکھ، تجھے سنگ کی صفات سے کیا

مثالِ موجِ صبا لب کھلا ہوا تھا کوئی
پڑے پڑے بھڑک اُٹھا ہوں بات بات سے کیا

جو دیکھیے تو یہ شعلے ہیں میرا پیراہن
جو سوچیے تو تجھے اِن معاملات سے کیا

سیاہ خانۂ دل سے نکل کے آیا ہوں
مجھے بتاؤ، ذرّوں کا اندھیری رات سے کیا

وہ معرکے ہیں مری آنکھوں میں گرم ہیں کہ ظفرؔ
میں سوچتا ہوں تجھے دل کی واردات سے کیا

☆

امید دید کے سورج دکھا دکھا کے مجھے
سپرد کر گئے آخر شبِ بلا کے مجھے

معاملاتِ محبت میں سخت گیر ہیں ہم
وہ کہہ رہے تھے کسی سے، سنا سنا کے مجھے

شبِ حیات میں اُس مہرباں کا مہماں تھا
جو شہر چھوڑ گیا شہر میں بلا کے مجھے

وہ آنکھ ہے کہ جسے چوم کر لرز جاؤں
وہ زُلف ہے کہ اُڑا دے دُھواں بنا کے مجھے

ہجوم رنگ وہ چہرہ ـــ بڑے گلاب کا پھول
ملا نہ پھر کبھی شاخوں میں مُنہ چھپا کے مجھے

یہ بے حضور بدن اپنے نُور سے بھر دے
بس ایک رات کبھی سامنے بٹھا کے مجھے

مجھے خبر ہے کہ تُو خود ہی اپنا زنداں ہے
فریب دے نہیں زنجیر کی صدا کے مجھے

مرے وجود سے آگے بھی میں ہوں جلوہ نما
یقیں نہ ہو تو کبھی دیکھ لے بھلا کے مجھے

لرز رہی تھی مری لَو پڑے پڑے ہی ظفر
وہ لے چلے ہیں کہاں سامنے ہوا کے مجھے

-☆-

خوب ہے سلسلۂ جرم و سزا، رہنے دے
اور کچھ دیر یہی حشر بپا رہنے دے

چارۂ زخم نہ کر، تازہ ہوا آتی ہے
یہ دریچہ ہی کوئی روز کھلا رہنے دے

دل تو جو مانگتا ہے بس میں نہیں تیرے بھی
آنکھ جو چاہتی ہے جلوہ نما رہنے دے

مجھ سے ملنا ہے تو دل کھول کے ملنا ہوگا
یا ملاقات کی زحمت نہ اُٹھا، رہنے دے

چومنے دے مجھے ماتھے پہ بچی زُلف کی لہر
سُرخیِ لب کو ابھی شعلہ نوا رہنے دے

اسی ویرانے میں ہے گنجِ گراں مایہ ترا
دل کو پہچان، اسے یُوں نہ گنوا، رہنے دے

اسی ظلمات سے ہے گوہرِ شبنم کی نمود
گُلِ اُمید کو آغوش کشا رہنے دے

کون سربستہ اشاروں کو سمجھتا ہے ظفر
قصۂ درد کو پابندِ صدا رہنے دے

-☆-

جس سے چاہا تھا بکھرنے سے بچا لے مجھ کو
کر گیا تُند ہواؤں کے حوالے مجھ کو

تجھ کو سوچا تو تری رُوح کا اظہار تھا مَیں
تجھ کو چاہا تو پڑے جان کے لالے مجھ کو

کیا زمانہ تھا کہ جب پانو میں زنجیر نہ تھی
قیدِ اُمید سے اب تُو ہی نِکالے مجھ کو

مَیں وہ بُت ہوں کہ تری یاد مجھے پُوجتی ہے
پھر بھی ڈر ہے یہ کہیں توڑ نہ ڈالے مجھ کو

رنگِ راحت نہیں مَیں ، مجھ کو تماشا نہ بنا
حسرتِ دید ہوں ، آنکھوں میں چھپا لے مجھ کو

کانچ کا شہر ہوں ، دم بھر میں اُجڑ جاؤں گا
فُرصتِ شوق غنیمت ہے ، سجا لے مجھ کو

خشک پتّے کا سفر ہے مری تگ و دو حیات
راستے میں کوئی اپنا نہ بنا لے مجھ کو

مَیں یہیں ہوں ، اِسی ویرانے کا اِک حصّہ ہوں
جو ذرا شوق سے ڈھونڈے وہی پا لے مجھ کو

تحفہ دید ہی اِک ایسا کھلونا ہے ظفرؔ
کہ یہ دے کر کوئی جب چاہے منا لے مجھ کو

☆

نقابِ غم سے نہ ابرِ نشاط سے نِکلا
وہ چاند ہوں کہ خود اپنی ہی ذات سے نِکلا

یہ گرم دن کہ در آیا ہے تیری آنکھوں میں
مری جُدائیوں کی سرد رات سے نِکلا

یہ کیا فسُوں ہے کہ صُبحِ گریز کا پہلو
شبِ وصال تری بات بات سے نِکلا

چلو یہ عکس بھی آئینے سے ہُوا رُخصت
چلو یہ بُت بھی مرے سومنات سے نِکلا

کوئی شرر نہ اُٹھا سنگِ تیرہ بختی سے
کوئی گُہر نہ یمِ حادثات سے نِکلا

شجر حجر بھی چُپ سو گئے تو آخرِ شب
غزالِ غم کا شکاری بھی گھات سے نِکلا

بس اِک صدا رہی دشتِ ابد پہ سایہ فگن
بس ایک شخص بھری کائنات سے نِکلا

☆

مکاں لرزتے رہے، سیلِ غم گزر بھی گیا
چڑھا ہی تھا ابھی دریا، ابھی اُتر بھی گیا

پڑے برہنہ سری کو دُعائیں وہ کہ یہاں
جنھیں کلاہ کا خطرہ تھا اُن کا سر بھی گیا

وہ جان دینے کو تیار ہے ہمارے لیے
جو گھر میں بیٹھ کے رُسوائیوں سے ڈر بھی گیا

ابھی سے چُوم کے زُلفوں میں ٹانک لے، ورنہ
ابھی ہوا چلی اور میں ابھی بکھر بھی گیا

تُجھے یہ غم، تری آواز میں وہ لوچ نہیں
مُجھے یہ دُکھ ہے، تری بات سے اثر بھی گیا

وہ تُو، کہ جس کو نئی زندگی بھی راس نہیں
مُجھے بھی دیکھ کہ جو تیری موت مر بھی گیا

بس ایک خوابِ خنک سے نچُڑ گیا ہے بدن
بس ایک رات کے مہماں کے ساتھ گھر بھی گیا

کوئی تو منظرِ منزل نُما دکھائی دیا
جو چلتے چلتے سرِ راہ میں ٹھہر بھی گیا

یہ چھاؤں خُوب ہے، لیکن میں کیا کروں گا ظفرؔ
سفر کے ساتھ اگر حوصلہ سفر بھی گیا

☆

جنُونِ بے خطر و زخمِ بے نشاں رکھیے
کہ اتنے چاند ستارے کہاں کہاں رکھیے

جہاں کبھی ہوسِ حاصلِ شکست رہی
ہزار حیف کہ اب رنجِ رائگاں رکھیے

چلے ہیں شہرِ آوارگی سمیٹ کے اب
کہ جھوٹ سچ کہیں بنیادِ آشیاں رکھیے

کسی چھلکتے ہوئے تیر سے وصال کے بعد
کسی تنی ہوئی تلوار پر زُباں رکھیے

خود اپنی آنکھوں سے بے بہر دیکھیے اُس کو
مگر ترستے ہوئے دل میں سو گُماں رکھیے

اثر ہو، بے اثری ہو، نہ کیجیے کوئی فکر
بس ایک بات، کہ اندازۂ فغاں رکھیے

نگاہ میں نہ سہی، کوئی آس پاس تو ہے
صدائے پائے تمنّا کو درمیاں رکھیے

نہیں بہار کی جھنکار، دل اُداس تو ہے
خیالِ خُوبی و خاموشیِ خزاں رکھیے

ٹھہر ہی جائے گا دل، تُو رہینِ یاس تو ہے
ظفرؔ، اُمید کے چھینٹے کو بے کراں رکھیے

☆

ایک ہی رشتہ ہو اُس سے ، یہ کہ وہ بیگانہ ہو
کاش مل جائے کہیں جس کو مری پروا نہ ہو

دُوریوں ہی دُوریوں میں قرب کا شعلہ اُڑے
آن میں جل جائیں جنگل اور دُھواں پیدا نہ ہو

کون سی تصویر آنکھوں میں سجا کر بیٹھیے
روئیے کِس رنگ میں اُس کو جسے دیکھا نہ ہو

کیا قیامت ہے کہ سر بھی پھوڑ بیٹھے ہیں ، اور اب
دل سے وحشی کے لیے بھی صُحبتِ صحرا نہ ہو!

اپنی ہی خُوش بُو کی آتش سے بھڑک اُٹھتے ہیں باغ
جن کی قسمت میں ہوا کا ایک بھی جھونکا نہ ہو

آج اِن گلیوں میں پتھر مارنے والے کہاں
پھر جو پچھتائے گا پیارے ، سوچ کر دیوانہ ہو

پانو کو زنجیر ہو جائے ترا ذوقِ سفر
منزلوں کے دل دھڑکتے ہیں ، کہیں ایسا نہ ہو

مُستقل ہنگامہ تیری ذات سے برپا رہے
اِس بھری محفل میں تُو ہو ، یا ترا افسانہ ہو

اے ظفر ، ہم کو بھی اُس بزم میں لے چل ، جہاں
تُو ہی شمعِ ناز ہو ، تُو ہی دلِ پروانہ ہو

-☆-

اُسی سے آئے ہیں آشوب آسماں والے
جسے غبار سمجھتے تھے کارواں والے

مَیں اپنی دُھن میں یہاں آندھیاں اُٹھاتا ہُوں
مگر کہاں وہ مزے خاکِ آشیاں والے

مُجھے دیا نہ کبھی میرے دُشمنوں کا پتا
مُجھے ہوا سے لڑاتے رہے جہاں والے

مرے سرابِ تمنّا پہ رشک تھا جن کو
بنے ہیں آج وہی بحرِ بے کراں والے

مَیں نالہ ہُوں ، مُجھے اپنے لبوں سے دُور نہ رکھ
مجھی سے زندہ ہے تُو ، میرے جسم و جاں والے!

یہ مُشتِ خاک ، ظفر ، میرا پیرہن ہی تُو ہے
مُجھے زمیں سے ڈرائیں نہ کہکشاں والے

-☆-

مِلا تو منزلِ جاں میں اُتارنے نہ دیا
وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا

رواں دواں ہے یونہی کشتیِ زماں اب بھی
مگر وہ لمحہ، جو دل نے گزارنے نہ دیا

لگی تھی جان کی بازی، بساط اُلٹ ڈالی
یہ کھیل بھی ہمیں یاروں نے ہارنے نہ دیا

کوئی صدا مرے صبر و سکوت سے نہ اُٹھی
کوئی مزہ ترے قول و قرار نے نہ دیا

وہی علاجِ شبِ تلخیِ خزاں تھا ظفر
جو ایک پھول کسی نوبہار نے نہ دیا

-☆-

مِل ہی جائے گا کہیں وہ، جستجو کیا کیجیے
سُن ہی پائے گا کبھی تو، ہاؤہُو کیا کیجیے

آشنا ہو گا تو خود ہی آ ملے گا دشت میں
اجنبی شہروں میں طوفِ کاخ و کُو کیا کیجیے

ملنے ہی والے تھے دو بچھڑے دلوں کے جسم و جاں
آڑے آئی ایک جھوٹی آبرو، کیا کیجیے

کوئی آئے اور اسی چھاؤں والے پیڑ کو
کاٹ ڈالے، ورنہ اے ذوقِ نمو، کیا کیجیے

ساتھ کچھ ہمت بھی اب کرنی پڑے گی اے ظفر
وقت نازک ہے، اکیلی آرزو کیا کیجیے

-☆-

کس کا سُراغ پایئے ٹوٹے ہوئے خُمار سے
کون سا گھر جلایئے سانس کے اِک شرار سے

صبح کے ریگ زار سے چلتا ہے کاروانِ غم
جلتا ہے آشیانِ غم ، آتشِ انتظار سے

پاس وفا کے پیار سے رُوح میں زہر بھر دیا
خاک سیاہ کر دیا شعلۂ اعتبار سے

شوق کے رہگذار سے گر کے سنبھل ہی جائیں گے
بچ کے نکل ہی جائیں گے درد کے آبشار سے

کُلۂ کوہسار سے آ کے ہوا پلٹ گئی
وقت کی نبض کٹ گئی برف کی تیز دھار سے

آنکھ میں چھا گیا ظفرؔ کوئی ہرا بھرا بدن
شامِ خزاں لرز اُٹھی معجزۂ بہار سے

-☆-

جو چاند ڈوب چکا ہے تو رات کیوں ہے وُہی؟
کہ موجِ خُوں ہے وہی ، بحرِ بے سکُوں ہے وُہی

تُو ماورا بھی نہ تھا سیلِ وقت سے ، لیکن
ہنوز تُو ہے وُہی اور ترا فسُوں ہے وُہی

شبِ سیاہ کو محرُومِ انتظار نہ جان
کہ میری آنکھ کے در میں چراغِ خُوں ہے وُہی

مِری نگاہ کا مرکز بدل رہا ہے فقط
مجھے خیال وُہی ہے ، مجھے جنُوں ہے وُہی

مِٹے ہیں منزلِ شیریں کے سب نشاں ، لیکن
جتادہ راستے میں زہر کا ستُوں ہے وُہی

-☆-

ہرا بھرا کسی وادی میں ایک بن ہے کوئی
اور اُس کے وسط میں اُجڑا ہُوا چمن ہے کوئی

جو اپنے آپ میں ہے خود ہی بے کنار، تو کیوں
مرے ہی ڈوبتے ساحل پہ موجزن ہے کوئی

ابھی تو شعلۂ آواز کا ہُوں پروانہ
ابھی نظر میں بدن ہے نہ پیرہن ہے کوئی

اُسی کو ڈھونڈیں، اُسی کو خُدا بنا ڈالیں
سیاہ خانۂ دل میں اگر کرن ہے کوئی

بساطِ بامِ ثریا پہ جا کے بھول گئے
کہ فرشِ خاک پہ بھی گرم انجمن ہے کوئی

☆

شورشِ رنگِ جنوں عام ہے، سر خالی ہیں
خون آوارہ ہے گلیوں میں، جگر خالی ہیں

پھول پتے ہیں وُہی، چھاؤں کی چادر ہے وُہی
جانے کس شے سے مرے شاخ و شجر خالی ہیں

کھلی آنکھوں سے گزر جا، کہیں آواز نہ دے
کہ زمانوں سے یہ برباد نگر خالی ہیں

آ چکے جیسے کبھی دُور کے آنے والے
گوشۂ بام پہ کوئی نہیں، در خالی ہیں

آسماں ہو کہ زمیں، میرے سوا کچھ بھی نہیں
دیکھتا جاتا ہُوں، اوراقِ نظر خالی ہیں

☆

تھا گرچہ اسی خاک کی پوشاک سمندر
مٹی کی مِلاوٹ سے رہا پاک سمندر

ہے خود ہی کبھی موج، کبھی مُنتظر موج
اور موج میں آ جائے تو بیباک سمندر

سینے پہ سجائے تھا گُل حلقۂ آغوش
ظاہر میں گُریزاں رہا چالاک سمندر

چُپ چاپ سمندر پہ رواں خواب کی کشتی
اور خواب کی کشتی میں غضب ناک سمندر

پانی کی سیہ سانپ سی لہراتی ہُوئی لہر
ڈس لے تو اسی زہر کا تریاک سمندر

سیپی ہے نہ گھونگا ہے نہ گوہر ہے نہ ماہی
ویران پڑا ہے تہِ افلاک سمندر

ہو جائے جو منظور دُعائے لبِ ساحل
لے جائے بہا کر خس و خاشاک سمندر

آ آ کے پلٹ جاتی ہیں جب درد کی لہریں
دیتا ہے دِکھائی دلِ صد چاک، سمندر

اے جانِ ظفر، تندیٔ طوفاں ہو جہاں تُو
آرام سے بیٹھے گا وہاں خاک سمندر!

☆

دیکھا تو اِک آواز کا پیکر نظر آیا
سوچا تو کوئی اور ہی منظر نظر آیا

اِک شعلۂ آوارہ ہے عکسِ رُخِ رنگیں
باہر نظر آیا کبھی اندر نظر آیا

چھایا ہُوا آنکھوں پہ کسی خواب کا بادل
گُزرا تو کہیں ماہِ مُنوّر نظر آیا

سوتے ہیں کہ حالات ہی اپنے ہیں کچھ ایسے
کھولی ہے کبھی آنکھ تو بستر نظر آیا

ہم اپنے کنوئیں سے نکل آئے بھی تو ہم کو
دریا نظر آیا نہ سمندر نظر آیا

جو ہے اسی ویرانے میں ہے گنجِ گرامی
سب وہم ہے جو آنکھ سے باہر نظر آیا

چُپ چاپ رواں تھا سفرِ دل کا مُسافر
کیوں پیٹ پہ باندھا ہُوا پتھر نظر آیا

کیوں پانو میں کانٹا سی چُبھی وہم کی تصویر
کیوں ایک ہیولیٰ سا برابر نظر آیا

دیکھا تھا ظفر جو بھی، دکھا بیٹھا ہوں سب کو
اب پُوچھنے آ جائیں گے: ''کیوں کر نظر آیا''؟

☆

دے کے دل خوش ہوں ، چلو پاؤں سے کانٹا نکلا
تم نے تو ضد سے لیا تھا ، کہو ، کیسا نکلا!

چشمکیں کرتا رہا کوئی پسِ ابرِ خیال
کبھی آنچل ، کبھی بازو ، کبھی چہرہ نکلا

پاس آئے تو سہی ، شکل دکھائے تو سہی
چوم کر سینے میں رکھ لوں گا ، وہ جیسا نکلا

منتظر کوئی تو ہے بحر کی گہرائی میں
مدتیں ہو گئیں ، سر سے نہ یہ سودا نکلا

دل کے پاتال کا تاریک مسافر ، یہ لہو
گوشۂ چشم سے اُبھرا تو تماشا نکلا

سر سلامت ہے ابھی ، حُسن کی دیوار نہ توڑ
کیا کرے گا جو اُدھر بھی یہی صحرا نکلا

خاک پر آ کے سبک سیر ہُوا ہے ، ورنہ
کوہ سے جھاگ اُڑاتا ہُوا دریا نکلا

کشمکش ختم ہوئی ، جان میں جان آئی وہیں
دل سے جس لمحہ ظفر تیر تمنا نکلا

☆

یہی تیغ تیز تنی ہوئی ، یہی زخم ناب کھلا ہوا
سرِ شاخِ ظلمتِ زندگی یہی ماہتاب کھلا ہوا

کبھی انگلیوں کی اشارتوں میں چھپی چھپائی عبارتیں
کبھی لعلِ شوخ میں گفتگو کا برہنہ باب کھلا ہوا

یہ مہک جو تیر کی طرح میرے مشامِ جاں میں در آئی ہے
اسی باغ میں ہے یہیں کہیں وہ سیہ گلاب کھلا ہوا

کہیں پربتوں کی ترائیوں پہ ردائے رنگ تنی ہوئی
کہیں بادلوں کی بہشت میں گُلِ آفتاب کھلا ہوا

اسی زرد پھول کی بددعا ہے ظفر یہ دل کی فسردگی
بڑا منتظر رہا مدتوں جو پسِ نقاب ، کھلا ہوا

☆

مانا ، گُل و گُل زار پہ رعنائی وہی ہے
منظر تو بدل دے کہ تماشائی وہی ہے

اُجڑا تھا ابھی کل ہی تمنّاؤں کا بازار
اور آج یہاں زینت و زیبائی وہی ہے

پُوچھا ہے یہاں مَیں نے ہر آواز کا چہرہ
ان گونجتی گلیوں سے شناسائی وہی ہے

خوش بُو کی طرح اُڑ کے پہنچتی ہے خبر بھی
ہر چند نیا شہر ہے ، رُسوائی وہی ہے

اگلی سی بری آنکھ میں بینائی نہیں وہ
اے آبِ تماشا تری گہرائی وہی ہے

ہلچل نہ ہوئی گاؤں کے تالاب میں اک دن
ٹھہرا ہوا پانی ہے وہی ، کائی وہی ہے

دریافت ہوئیں دہر میں کیا کیا نہ زمینیں
اس دل کو مگر دعویٰ یکتائی وہی ہے

اس دھوپ میں اک سوچ کا سایہ رہا سر پر
اُٹھی ہے جو اندر سے گھٹا چھائی وہی ہے

کہتا ہوں ظفر شعر تو سہتا ہوں بدن پر
تنہائی وہی ، قافیہ پیمائی وہی ہے

☆

خُون کی رینگتی دیوار گرائے نہ کہیں
دن مُجھے توڑ کے باہر نکل آئے نہ کہیں

رات روشن ہے ، مرے دل کا نظارا کر لو
صبح پڑ جائیں کسی ابر کے سائے نہ کہیں

عیدِ نظارہ ہوئی تیز ہوا کے دم سے
دیکھ پائے نہ کہیں ، پردہ گرائے نہ کہیں

آج تنہائی میں جو عہد کیے ہیں خود سے
دل بہت سادہ ہے ، جا اُس کو بتائے نہ کہیں

پھر وہی مَیں ہوں ، وہی شہرِ خموشانِ خیال
پھر کوئی قبر سے باہر نکل آئے نہ کہیں

دل کا دربان بنا بیٹھا ہوں اور دیکھتا ہوں
کوئی اُمّید ، کوئی خواب در آئے نہ کہیں

مُجھ میں یہ کون ہے ، اے حسرتِ تعمیرِ حیات!
تُو نے جو نقش بنائے ہیں ، مٹائے نہ کہیں

زہر جو سینے میں ہے ، اے خس و خاشاکِ نشاط!
باہر آئے نہ کہیں ، آگ لگائے نہ کہیں

سبز جنگل سے گزرتا ہوا ڈرتا ہوں ظفر
پھر کوئی شاخ مُجھے پاس بلائے نہ کہیں

☆

دل کو صدا نہ دوں، مگر اپنے جہان میں
شامل ہے یہ بھی منزلِ غم کے نشان میں

جس کو کبھی بھلا کے بہت خوش ہُوا تھا میں
ابھرتا ہے آج بھی مرے وہم و گمان میں

ظلمات کے شکار کو نکلی تھی زندگی
چلّے پہ چاند رکھ کے لچکتی کمان میں

باہر گلی میں چلتے ہُوئے لوگ تھم گئے
تنہائیوں کا شور تھا خالی مکان میں

چھوڑی ہُوئی زمین کی مہکار کے سوا
سارے مزے ملے مجھے اُونچی اُڑان میں

آنکھوں کی خاکِ خشک بھی سیراب ہو گئی
آواز نے وہ عکس اُتارا ہے کان میں

دیکھا کروں یونہی، کہ یہ منظر اُجاڑ دوں
شب بھر پڑا رہا ہُوں بڑے امتحان میں

میرا اور اُن کا فاصلہ جب مٹ چلا تو اب
دیوارِ عشق آن پڑی درمیان میں

لو دے اُٹھیں پھسلتی ہُوئی اُنگلیاں ظفرؔ
وہ آگ تھی کھلے ہُوئے ریشم کے تھان میں

☆

صہبائے غم سے آج نہ ٹوٹا خمار خوں
ہے کس کے انتظار میں شمعِ شرارِ خوں

ڈوبھر ہُوا ہے خاک سے افلاک کا سفر
جس دن سے دل کے پانو میں ٹوٹا ہے خارِ خوں

پھیلا ہُوا ہے چاروں طرف خارزارِ خوف
اور تن پہ ایک پیرہنِ تار تارِ خوں

پہنچے تو دستیاب ہُوئی اک صدا کی لاش
صبحِ ازل سے گونج رہا تھا حصارِ خوں

کیا ماہتاب تھا کہ ظفرؔ جس کے روبرو
زیر و زبر ہُوا ہے یمِ بے کنارِ خوں

☆

دل کی ویرانی کا منظر اس قدر کالا نہ تھا
فرش پہ مٹی نہ تھی ، دیوار پہ جالا نہ تھا

برف کی بگیا ہو جیسے آسماں کے دشت میں
چاندنی بے آب تھی یا چاند پہ ہالا نہ تھا

میں نہیں تھا صبح کی پہلی ہوا کے دوش پہ
گھاس کی پتی تھی جس کو اوس نے پالا نہ تھا

کچھ پتا چلتا نہیں یہ آسماں ہے یا زمیں
تھا ، مگر اتنا یہ نظارہ تہ و بالا نہ تھا

ایک پل میں طے ہُوا سنسان آنکھوں کا سفر
راہ پتھریلی نہیں تھی ، پانو میں چھالا نہ تھا

رائگاں ہر شاخ پہ میں پھول کی صورت کھِلا
اس بھرے جنگل میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا

شعری طوفاں میں کیا کیا بند باندھے تھے ، مگر
غم تو دریا ہے ظفرؔ ، کوئی ندی نالا نہ تھا

-☆-

عکس کوئی اُتار لوں آئنۂ سراب سے
نقش کوئی نکھار لوں ریزۂ خونِ ناب سے

تیرہ درخت پہ پڑی آبِ رواں کی روشنی
صبح لپٹ لپٹ گئی موجۂ باریاب سے

ریت کی لہر لہر پہ دل کا زواں رواں جلا
بجھ نہ سکی بدن کی پیاس چشمۂ آفتاب سے

کتنے دیے جلا گئی شام کی تند رو ہوا
پھول گرا کتاب سے ، چاند جھڑا نقاب سے

گال سے لگ کے سو گئی درد کی زرد رو کرن
زخم کی آنکھ کھل گئی خارِ خمارِ خواب سے

ریل کے زور شور سے سارا مکاں لرز گیا
اوس الگ نہ ہو سکی کھلتے ہُوئے گلاب سے

راہ میں راکھ ہو گئیں دھوپ کی پتیاں ، ظفرؔ
آنکھ بکھر بکھر گئی اپنی ہی آب و تاب سے

-☆-

کشتی نہیں رہی ، نہ سہی ، بادباں تو ہے

ہیں ، اور آنکھ بھر کے یہ تصویر دیکھ لوں
دل کی خوشی تھی ، ورنہ نظر کا زیاں تو ہے

پہنا تھا پیڑ نے مئی کا پیرہن
یہ امر واقعہ نہ سہی ، داستاں تو ہے

تک شیلف پر گلاب کی ٹہنی ہلا گئی
موجِ ہوا ، کہ سلسلہ رائیگاں تو ہے

دُنیا کو ایک طرفہ تماشا دکھا چلوں
مٹھی میں آج مہلتِ عمرِ رواں تو ہے

گاڑی کے گرد بھاگتے ہیں دور کے درخت
یوں ہو نہ ہو مگر مجھے ایسا گماں تو ہے

زندہ رکھیں گی خاک اڑانے کی لذتیں
صحرائے بےکراں نہ سہی ، آشیاں تو ہے

اندر کی آگ دیکھیے ، روشن ہے یا نہیں
اٹھتا ہوا مکان کے سر سے دھواں تو ہے

مجھ پر ظفر خدا کی زمیں تنگ ہی سہی
خوش ہوں کہ میرے سر پہ کھلا آسماں تو ہے

☆

نہ سورج ، نہ دشت سفر گرم ہے
سفر کرنے والے کا سر گرم ہے

کوئی راہ جاتی نہیں اس طرف
لہو رنگ محفل جدھر گرم ہے

مناظر سبھی برف میں دب گئے
فقط ایک زخمِ نظر گرم ہے

جو دیکھی تھی پربت پہ جلتی ہوئی
اسی آگ سے سارا گھر گرم ہے

جسے چھو کے گزری تھی کالی کرن
ابھی تک وہ شاخِ شجر گرم ہے

کسی زہر سے آنکھ روشن کروں
ہرا ہے یہ سبزہ ، مگر گرم ہے

کسے چوم کر آئی ہے صبح دم
ہوا کا بدن کس قدر گرم ہے

نہ سایے کی چادر ، نہ چشمے کا شور
کہیں جاؤ ، خاکِ سفر گرم ہے

تغزل کا بازار ٹھنڈا ہوا
کوئی اور ہی دوپہر گرم ہے

☆

لپٹے دلوں میں وا [illegible] زخمِ سفر نہیں
کیا کیا مکاں ہیں جن میں ہوا کا گزر نہیں

اُترو تو کوئی کھینچ کے لے جائے تہ بہ تہ
دیکھو تو سطحِ آب پہ کوئی بھنور نہیں

تنہا پھر آج گھورتے ہوئے بن کے دشت میں
کیا ڈھونڈتا پھرا ہوں ، مجھے کچھ خبر نہیں

جس کی تلاش میں مرے ذرّے بکھر گئے
وہ آفتابِ تازہ کسی بام پر نہیں

لیتا ہوں اپنی خاک کی گہرائیاں ابھی
پہنائیٔ فلک مرے پیشِ نظر نہیں

کچھ کہہ سکو تو گوش بر آواز ہیں درخت
ان جنگلوں میں مرگِ صدا کا خطر نہیں

سوئے ہوؤں کو نیند کا جھونکا جگا گیا
یہ کیا بلا ہے ، شامِ قیامت اگر نہیں

خود راستہ بدل کے نکل جایئے ، کہ اب
ان پتھروں پہ اپنی نوا کارگر نہیں

کچھ تو بتاؤ ، دل کی زمیں سخت ہے ظفر
یا پھر یہاں کی آب و ہوا میں اثر نہیں

☆

[illegible] سفر بھی تھا
کچھ یہی منظر ہماری راہ کا منظر بھی تھا

خندقوں میں چھپ کے بیٹھے سورماؤں کے لیے
فکرِ دشمن ہی نہ تھی ، اک دوسرے کا ڈر بھی تھا

سایے کا سبزہ ہُوا پامال سب کے سامنے
بادلوں کے پیچھے پیچھے دھوپ کا لشکر بھی تھا

پتّی پتّی کر کے بکھرایا ہے مجھ کو خاک پر
اس طرح جیسے ہوا کے ہاتھ میں خنجر بھی تھا

تھرتھراتی پانو میں تاریک مٹی ہی نہ تھی
روشنی کا بوجھ میرے کانپتے سر پر بھی تھا

بھوک کے ٹیلے پہ میرے پیٹ میں گولی لگی
رہتی آنکھوں میں برپا پیاس کا محشر بھی تھا

سب کو اپنے ساتھ لایا تھا ، کہ میرے واسطے
بند کمرے میں کھلا اوہام کا دفتر بھی تھا

آرزو کی شخصیت میں سادگی بھی تھی بہت
خوشنما ، اُجلی جبیں پر زخم کا زیور بھی تھا

عمر بھر دیکھا کیے اندر کے ہنگامے ، ظفر
آج کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کوئی باہر بھی تھا

☆

لاتی ہے یہاں لذتِ آزار مجھے
جہاں پانی نہ ملے آج وہاں مار مجھے

دھوپ ظالم ہی سہی، جسم توانا ہے ابھی
یاد آئے گا کبھی سایۂ اشجار مجھے

سال ہا سال سے خاموش تھے گہرے پانی
اب نظر آئے ہیں آواز کے آثار مجھے

باغ کی قبر پہ روتے ہوئے دیکھا تھا جسے
نظر آیا وہی سایۂ سرِ دیوار مجھے

گر کے صد پارہ ہوا ابر میں اٹکا ہوا چاند
سر پہ چادر سی نظر آئی شبِ تار مجھے

سانس میں تھا کسی جلتے ہوئے جنگل کا دھواں
سیرِ گلزار دکھاتے رہے بے کار مجھے

رات کے دشت میں ٹوٹی تھی ہوا کی زنجیر
صبح محسوس ہوئی ریت کی جھنکار مجھے

وہی جامہ، کہ مرے تن پہ نہ ٹھیک آتا تھا
وہی انعام ملا عاقبتِ کار مجھے

جب سے دیکھا ہے ظفرؔ خوابِ شبستانِ خیال
بسترِ خاک پہ سونا ہوا دشوار مجھے

☆

بہت سے ہیں ستم، دورِ آسماں جو ہوا
مزہ اسی نے دیا، رنجِ ناگہاں جو ہوا

بھری ہوئی تھی فضا سرد، زرد کہرے سے
سمندروں کے سفر پر کوئی رواں جو ہوا

وہ عکس ڈھونڈنے آیا ہوں نہر کے پل پر
کہ موج موج پہ لکھا تھا، بے کراں جو ہوا

سفید، سُرخ، سیہ، سانولا، سلیٹی، سبز
ہزار رنگ میں چمکے گا، درمیاں جو ہوا

زباں کا ذائقہ بدلے تو کچھ نظر آئے
ہوا ہی پھانک رہا ہوں، مگر دھواں جو ہوا

رہوں کہاں جو خس و خاک سے گریز کروں
یہی مکاں جو ہوا، گوشۂ اماں جو ہوا

یہ جشن اور کسی دن پہ اب اُٹھا رکھیے
کہ سدِّ راہ تماشا غبارِ جاں جو ہوا

بری قضا ہے مرے اختیار میں، لیکن
میں خوش نہیں ہوں، ترے زہر کا زیاں جو ہوا

ہمت کے، روزنِ در سے میں دیکھتا تھا، ظفرؔ
ذرا سی بات پہ ہنگامہ کل یہاں جو ہوا

☆

یہ جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں نے اپنے لیے الگ بنائی ہے تو اس لیے کہ بعض وقت اپنا سر پھوڑنے کے لیے دُور و نزدیک پتھر تک نہیں ملتا۔ ضمناً، میں نے کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور اکثر ناکام رہا ہوں۔ میری اُلجھن رُوحانی بھی ہے اور سیاسی بھی، جسے میں نے اپنی ذات کے حوالے سے حل کرنا چاہا، اور یہ ذات بجائے خُود ایک بھرا پُرا چیستان نکلی۔

سات سال کا یہ سفر، اپنی صعوبتوں کے ساتھ، دلچسپ بھی تھا۔ سر پر دھوپ کی چادر اور تلووں کے نیچے ریت کے بگولے۔ پوری اور ادھوری محبتوں کے جھاڑ جھنکاڑ بھی تا دیر ساتھ رہے۔ اُدھر اپنا جغرافیہ گردِ سفر سے اٹا پڑا تھا۔ جھاڑ پھونک کے بعد بھی فرق صرف اتنا پڑا کہ وہ دھول اب آنکھوں میں تھی۔ دھندلکے اور دھندلاہٹیں۔ یہی ابر آلود تصویریں، یہی اُلجھے سیدھے مناظر میں نے ہواؤں پر لکھے ہوئے دیکھے ہیں اور آپ کو دکھانے چلا ہوں۔

ظفر اقبال

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشاے نیرنگِ صورت سلامت
(غالب)

عادل منصوری کے نام

پیش لفظ

میر و غالب کے تناظر میں اردو شاعری کا مجموعی اسلوب فیض کے منتقل لہجے کی تمیز کے بعد جس منفرد، توانا اور خود مختار تجرید میں متشکل ہوا ہے، اس کا وہ مقام کہ جس سے نہ صرف ہم عصر تخلیق کا تخمینہ لگایا جا سکے، بلکہ ادبی وراثت اور ورثہ کی قدر و منزلت کا بھی از سر نو تعین کیا جا سکے، ظفر اقبال سے شروع ہوتی، نکلتی، ایک دوسرے کو کاٹتی اور آپس میں ور آویزاں لکیروں سے بننے والے گرد و پیش اور رقبہ میں پابند ہے۔ صاحب عہد کی یہی شناخت ہے۔ صاحب عہد اپنا معیار قائم کرتے ہوئے معاصرین کی درجہ بندی کا اصول بھی بنتا ہے۔ صاحب عہد کے حوالے سے زندہ حال کی تخلیقی قوتوں کو راہیں اور حدیں میسر آتی ہیں: بے شمار شمار کے ذیل میں آتا ہے کہ معیار فالتو اور زائد کی چھانٹی کرتا ہے، اچھے کو بُرے سے ممیز کر کے اپنے عمل کی خوبی سے دوسروں کے ارادوں کو استقامت بخشتا ہے، دعووں، بہانوں اور حیلہ سازیوں کی بدولت بظاہر پھیلی ہوئی مگر فی الاصل کم عیار شخصیتوں کو سکیڑتا ہے، ناحق کی بلند قامتی چھینتا ہے۔ صاحب عہد کی مرکزیت سے موجودگی اور امکان کے درمیانی فاصلے کو نصف قطر، معیاروں کا معیار، بنیادی رنگ اور شرط اول کا رتبہ حاصل ہوتا ہے کہ دائرے کا ہر قطعہ فاصلے کی اس اکائی سے مربوط ہوئے بغیر عصر کی معنویت کی کڑیوں میں نہیں آتا، محض عضو معطل رہتا ہے۔ صاحب عہد کا ماقبل اور مابعد اس کے زندہ حال کی روشنی میں یوں متغیر آشنا ہوتا ہے کہ باقیات الصالحات کے نئے خدوخال ابھرتے ہیں، چاہے اور پوجے گئے طاق نسیاں کی زینت بنتے ہیں، چھپا ہوا ظاہر ہوتا ہے، آنے والا دن زندہ حال کے متعین نقش کا کوئی خط، کنارا اور رنگ اپنی تجلیوں میں شامل کرتا ہے۔

وہ تعینات کہ جن کا منبع و مخرج اپنی مخصوص ہیئت میں ظفر اقبال سے مشتق ہے، مشتمل بر تجرید، زبان اور مزاج ہیں۔ بایں ہمہ ان عناصر کے ذریعے آدمی کا جو نقشہ مرتب ہوتا ہے، اس کی حدیں کچھ یوں ہیں کہ تجرید جو ایک سطح پر ٹھوس واقعات و حادثات میں مشترک شکل و صورت کو گرفت میں لینے کے مصداق ہے، اور دوسری سطح پر غیر مجرد، رقیق القلبی سے مملو اور کچی وارداتوں کی تردید و تکذیب ہے، اپنے عمل سے ترتیب کی ناہمواری کو واضح کرنے کے لیے اعتقادات، اطوار اور جذبات کے متناقض ٹکڑوں کو ابھار کر سامنے لاتی ہے، موجودگی کی نقشہ کشی میں شرکت اور علیحدگی کا ملا جلا کردار بنتی ہے، تا آں کہ مزاج کا واضح رنگ زبان و بیان کو تغیر آشنا کرتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج تک کس بے دردی سے زبان و بیان کو شریک تجربہ بننے سے محروم رکھا گیا ہے! یہ مفروضہ ابھی تک نافذ ہے کہ زبان خیالات و جذبات کو بیان کرنے کا محض ایک وسیلہ ہے۔ ہر چند کہ ہماری شعری روایت کو استحکام دینے والے اس مفروضے کی پابندی کو ملحوظ نظر رکھتے رہے ہیں، اب یہ ازبس ضروری ہے کہ زبان و بیان کو خیالات و جذبات کی تکلیفاً جنم بھومی قرار دیا جائے اور محض وسیلے کا مفروضہ ترک کر کے زبان و بیان اور تجربے کو بہ طور اکائی تسلیم کیا جائے۔ ظفر اقبال کی تجرید اور مزاج نے زبان و بیان کو تغیر و تبدل کی اساسی اکائی سے روشناس کروایا ہے: ٹھوس زبان کو تجرید آمیز پہناوا دینے کے ساتھ ساتھ اسما و صفات کی حد فاصل توڑ دی ہے، الفاظ کی بندش کا اصول بدل دیا ہے: اب الفاظ محض مقبول عوامی رشتوں میں نہیں بندھتے، فنکار کی قدرت اور ارادے سے کہ سراسر انفرادی ہے، آپس میں جڑتے ہیں!

زبان ذریعہ اظہار کے فتراک میں کئی کارہائے نمایاں سرانجام دیتی ہے۔ فکری نشو و نما میں زبان کا یہ وظیفہ الاخذ و افادیت کا حامل ہے۔ منضبط فکر کے لیے منضبط ذریعہ اظہار کی موجودگی بے حد ضروری ہے۔ زبان کے استعمال میں جتنی استقامت ہو، فکر اتنا ہی واضح اور صحیح ہوتا ہے۔ ایک سطح پر تو صحیح فکر اور صحیح زبان کا ایک دوسرے کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر فکر اور زبان کی استقامت کی یہ سطح دریافت ہو جائے تو بیشتر بر خود غلط معیارات کہ دُرست اور نادُرست کی جدولیں بناتے ہیں، معدوم ہو جائیں، صحیح اور غلط کا اندازہ فکر اور زبان کی استقامت پر انحصار کرے۔ اس انتہائی مقام کا حصول بہت ہی مشکل بات ہے۔ جو چیز بغایت اہم ہے، وہ فکر اور زبان کی استقامت ہے کہ خارجی معروضی عوامل کو ترتیب کے سلسلے میں فوقیت دیتی ہے۔ فکر اور زبان کی استقامت کے خطوط زمان و مکان کے ایمپریکل تعینات سے نچ لیتے ہیں۔ زبان بہ طور ذریعہ اظہار اس مقام کو پانے کی منزل میں ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر ملحوظِ نظر رہنا چاہیے کہ زبان و فکر کی یہ استقامت خارجی معروضی عوامل کے عمل سے قدم اٹھاتی ہے، از خود آگے نہیں بڑھتی: محاورات و ضرب الامثال سمیت الفاظ کی ترتیب، جُملے کی ساخت اور پیراگراف کی تشکیل میں خارج اور معروض کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے، خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خارجی معروضی عوامل تمام مراحل پر اپنا فیصلہ صادر کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ مطلوبہ بیان معرضِ وجود میں آ جاتا ہے۔ زبان و فکر کی استقامت میں روایتی اُسلوب دخل اندازی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ جُملے اور پیراگراف بسا اوقات اعتقادی مفروضوں کے زیرِ سطح عمل سے وہ کچھ نہیں کر پاتے جو خارجی معروضی عوامل کا بنیادی تقاضا ہوتا ہے۔ مر جانے کو، مثال کے طور پر، روایتی اُسلوب دارِ فانی سے کوچ قرار دے تو جاتا ہے کہ ایک مفروضہ اس دُنیا کے مٹ جانے کا ہے جو یہ بھی فرض کرتا ہے کہ کوئی دائم قائم جہان کہیں اور ہے، مرنے کے بعد کوئی صُورت ایسی بھی ہے جو سفر کے قابل رہتی ہے، منتقل موت نہیں ہوتی۔ زندگی کے مکان سے روانگی کے بعد کی مکانیت موت کی منزل ہے۔ وقت کہ انسانی تحرّک اور تنفّس سے تجربے اور ادراک میں آتا ہے، منہا ہونے کے باوجود موجود ہے: بروز کی صُورت میں، چھنتا ہُوا! یہ اعتقادی مفروضے موت کے طبیعی عمل کو جس طور بیان کرتے ہیں، زمان و مکان کی ایک شکل اُن میں دکھائی دیتی ہے۔ زمان و مکان کی یہ شکل یا اس کے برعکس زمان و مکان کے جدید تصوّرات پر مبنی شکل زبان کو گرفت میں لیے رہتی ہے، گرامر کا دباؤ اس پر مستزاد ہے۔ زمان و مکان، گرامر اور مفروضے من مانی کارروائی کی راہیں مسدود کیے رہتے ہیں۔ جب تک زبان ذریعہ اظہار کے فرائض ادا کرتی رہے گی، یہ پابندیاں اور دُشواریاں پیدا اور حل ہوتی رہیں گی۔

زبان محض ذریعہ اظہار نہیں، خیالات و جذبات کی تشکیلی جنم بھومی بھی ہے۔ ادب میں زبان کا پورا وجود بروئے کار آتا ہے۔ زبان اکائی اکائی لفظوں سے جُملوں میں، فرد فرد جُملوں سے پیراگرافوں میں اور پیراگرافوں کے اتحاد سے مُتشکل مضمون بنتی ہے تو فکر کے رشتے سے، شعر کے حوالے سے نہیں کہ شعر بذاتہ وہ اکائی ہے جس کی ٹوٹ پھوٹ میں پیراگراف، فقرے اور الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں، ان کے اتحادِ محض سے شعر یُوں نہیں بنتا کہ لفظوں، فقروں اور پیراگرافوں کا اکٹھ فکر، گرامر اور مُروّجہ جذباتی اُسلوب کے تحت ہو سکتا ہے، طریقِ شعر کے ذریعے نہیں۔ اگر ہم اپنی توجہ زبان پر مرکوز کرتے ہوئے منضبط فکر کا جائزہ لیں تو سب سے اہم رُکن جو اپنی وحدت کا اثبات کرتا ہے، وہ جُملہ ہے۔ سادہ جُملے میں فاعل مفعول اور فعل کی ترتیب بہُت متعیّن اور واضح ہے۔ شاعری میں منضبط ترتیب کو پہلے بھی کئی بار توڑا جا چکا ہے۔ فاعل مفعول اور فعل کے گرامر کے لحاظ سے متعیّن مقامات سے انحراف اولاً جزوی رہا ہے اور ثانیاً اس ترتیبی سکیم کا کوئی حصّہ کبھی غائب نہیں ہُوا۔ اب دیکھیے تو بہ طور اُسلوب، مثلاً ان مصرعوں میں، گمنام کا سبز ہے نہ پیلا، خیالا سا مزے کا موجود، گھاس کے گھنگھور میں رس کی بھری انجیر تھی، جسم کے بے حد و بے انداز میں چاروں طرف، شہد کی تہ میں طلب تھی۔ نمک میں تاخیر تھی۔ مزے کا موجود اور شہد کی تہ وغیرہ، کس کس غیاب و حضور کی خبر دیتے ہیں! صاحبِ عہد کی شناخت کے لیے من جُملہ دیگر شواہد کے ایک شہادت اس کی قوّتِ اختراع ہے۔ مثلاً عقل میں افتور، سفید اگلاب، کہ لاموجود کو وجود بخشتی ہے اور زبان و بیان کی مخفی مناسبتوں کو موجود کے رُتبے سے خلقِ جدید اور حشر کی ٹھنڈی ہوئی حالت ارزانی کرتی ہے۔ اختراع کے تواتر کی داستان پہ بہ پہ رقم ہوتی ہے کہ سیاق و سباق کی برطرفی میں اسماء افعال منقلب ہوتے ہیں، جُملے کی ترتیبی سکیم میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اُردو شاعری میں ترتیبی سکیم میں جو جو تغیرات ہوئے اُن کا رکھی رشتہ مستقیم جُملے سے ہمیشہ برقرار رہا۔ ظفر اقبال کے یہاں ترتیبی سکیم کئی مقامات پر علی الاعلان مستقیم جُملے کی تردید کرتی ہے۔ الفاظ کے جھرمٹ کہ جن میں فاعل مفعول فعل کے تعیّنات یکسر غائب ہیں، بتدریج اُمڈتے چلے آتے ہیں۔ مختلف الفاظ ایک دُوسرے سے فکر، گرامر اور جذباتی اُسلوب سے نہیں بندھتے، بلکہ الفاظ کی مخفی مناسبتیں چہ بلحاظِ معنی اور چہ بلحاظِ صوت و آہنگ وہ رشتے مُہیا کرتی ہیں جن پر اُن کے جھرمٹ بننے کا دار و مدار ہے۔ الفاظ کے جھرمٹ کی کشش اس امر میں ہے کہ زبان اعصابی آسودگی کا ذریعہ ہے جس کی صُورت اعصابی ضروریات کے مطابق یُوں بدلی ہے کہ منتقل کی جو شکل پہلے موجود تھی، اُس کا ارتحال بجزو بجزو جیاں و نامُتشکل پر اس طرح منتج ہُوا ہے کہ احتیاج کا رقبہ مختصر مگر ہیجانی کیفیات کا حامل ہوتے ہوئے جس قسم کا تقاضا کرتا ہے، اُس کی تشفی تجربے کی مختلف الانواع مملکتوں کے انمل بے جوڑ لخت لخت کنایے یکجا ہو کر مُہیا کرتے ہیں۔ الفاظ کے جھرمٹ جستہ جستہ کناروں کو ایک دُوسرے کے قریب لا کر انتہائی اختصار و ایجاز سے وہ کچھ معرضِ وجود میں لاتے ہیں جس کا حصول بے شمار جُملوں اور پیراگرافوں کی حقیقی اکٹھ یا اکائی اتحاد سے شاید ہی ممکن ہو کہ شعری سطور، چاہے روایتی ہی کیوں نہ ہوں، جب اپنے

عمل میں اوّلاً سیدھی سادی معنویت، ثانیاً سیدھی سادی معنویت سے متعلق حسنِ طلب اور تلاش
استلاف کے پھیلاو کو متحد کرتی ہیں تو ان سطور کا مرکزی حوالہ منتخب لفظ یا فریز کی صورت میں
اس سہ گانہ عمل کا وارث ہو کر، ایسے ہی دیگر ورتا کی معیت میں، سطور با سطور کو مثلک بدر کر
کے اُن کے خزائن اور اقتدار کو لیے ہوئے جب سر یرِ آرائے تاثیر ہوتا ہے تو جلاوطن سطور
اپنے ورتا کے اردگرد اپنے آثار چھوڑ جاتی ہیں جس سے ورتا کے ذاتی جاہ و جلال کا تال میل
بھرپور تلازماتی عمل کا آغاز کرتا ہے:

لٹکے ہوئے فضا میں شفق دُھند آئنے
جھکے ہوئے صدا میں سیہ بام ہر طرف
آبِ صفا کی تہ میں چتر پیش کہکشی
سطحِ سیہ پہ نقش نوی عام ہر طرف
آنکھوں میں سانولا ہے زمیں زنگ زرق برق
سر میں ہے سبز موج فلک فام ہر طرف
ہنستا رہا وہ دُھوپ ثمر شاخ کاٹ کر
چپّا رہا سیاہ میں کہرام ہر طرف

-☆-

عکس میں اُفتادگی تھی نقش میں ناسُور تھا
شہر خواب آہنگ منظر موت کا مسطور تھا
سبز کوٹ افسوں نیلی چھائی تھی چاراں طرف
ہمہمہ ہنجار ہیکل ہاو ہُو سے دُور تھا

-☆-

تصویر ترنگ برق بارش
عکسی، نقشی ہر آئنے میں
بیل سنگ ثبات سنسناہٹ
آہنگ اُسار ٹوٹتے میں
جلتی ہوئی سی بجھے ہوئے پہ

جلتی ہوں سی رُکے ہوئے میں
مینہ مرگ بجامعت مہورت
مندرج لہو کے لاگے میں
زنگیں نجز ہوں ہوا کا
ٹوٹا رت رقص رہتے میں

-☆-

الفاظ کے تحرمت اثبات کے توقّعاتی منطقوں میں معتد بہ تغیّر و تبدّل کا موجب بنتے
ہیں۔ ہر جملہ کسی نہ کسی امر کا براہِ راست یا بالواسطہ اثبات کرتا ہے۔ مثلاً، زید ایک مرد ہے،
میں زید کے مرد ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس جملے کی ایک مخصوص ساخت ہے۔ اس
مخصوص ساخت کے ہر جملے سے جو اثبات ہوگا، اُس کا ایک منطقہ ہے جو اثبات کا توقّعاتی
منطقہ ہے۔ جملے کی مخصوص ساخت اور توقّعاتی منطقے کا آپس میں گہرا تعلّق ہے۔ اس تعلّق کی
دریافت، درستی اور حقیقت خارجی دُنیا کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس مخصوص ساخت
کے جملے اور اثبات کے توقّعاتی منطقے میں اُس وقت فوراً گڑبڑ ہو جاتی ہے، جب ہم یہ کہتے
ہیں کہ زید ایک پہاڑ ہے۔ کیوں کہ اس جملے کی مخصوص ساخت عین مین پہلے جملے کی ساخت
سے ملتی جُلتی ہے، لیکن اثبات کا توقّعاتی منطقہ ٹھیک سے نہیں بیٹھتا کہ خارجی دُنیا زید کے
پہاڑ ہونے کو قائم نہیں کرتی۔ زید کے پہاڑ ہونے کو قائم کرنے کے لیے استعارے کا سہارا
لیتے ہی اثبات کی توقّعات کو جو دھچکا لگتا تھا، وہ بحال ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے تحرمت اثبات
کے توقّعاتی منطقوں کو تعدُّد کا نشانہ بناتے ہیں کہ اوّلاً جملے کی مخصوص ساخت کی تقلیل اور ثانیاً
خارجی حوالوں کا مکمّل اخراج کہ سوائے محض لسانی مناسبتوں کے کسی چیز کا نشان نہیں رہنے
دیتا۔ اس صورتِ حال سے جزبز ہونے کے بجائے توقّعاتی اثبات سے کنارہ کش ہو کر
استعاراتی اُسلوب کی نیرنگیوں سے آشنائی پیدا کرنی چاہیے کہ الفاظ کے تحرمت لائیٹ موتیف
در لائیٹ موتیف جو کومپلکس مُرتّب کرتے ہیں اُس سے بہرہ ور ہونے کے لیے عمدہ ترین
صلاحیتیں درکار ہیں۔ جو معتقدِ ثریا کو پہچان نہیں سکتے اُنھیں فلک منظر کو انتشار قرار دینے سے
پہلے اپنی آنکھ پر شبہ کی نظر ڈال لینی چاہیے!

تجریہ تعقّل کا وظیفہ ہے۔ مختلف اشیا کو شعور کے دائرے میں لا کر ان کی قدرِ مشترک،

کہ نوع کہلاتی ہے، دریافت کرتے ہوئے تجرید کا ظہور ہوتا ہے۔ تجرید نوع کی جنسی شناخت ہے۔ محسوسات کی تعقلاتی ہیئتی شناخت کو بروئے کار لانا کچھ اتنا دشوار ہے کہ زندگی کرنے کی طریقت بھی عام حالات میں سازگار ثابت نہیں ہوتی۔ تعقلاتی ہیئتی شناخت کے اہل، وہ جو تجرید کے ہفت خواں طے کر سکتے ہوں، اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ محسوسات کی تعقلاتی ہیئتی شناخت کو شعری واردات میں ضم کرنے والوں کو شمار کرنے کے لیے تو اُنگلیوں کی ضرورت بھی نہیں کہ یہ صاحبِ عہد ہی کا مقدور ہے کہ وہ اساطیری منہاج کو قائم کر کے دیو مالائی تصوّر اُستوار کرے۔ درج ذیل شعری واردات سے:

لہو کی سرسبز تیرگی ہے کہ رنگ اُڑتے لباس کا ہے
سمجھ میں آئے کہاں کہ منظر حواس کے آس پاس کا ہے
مزے کی مٹھی میں قید سی ہے یہ خوشہ چیں نرم گرم لڑکی
سڑک کے دونوں طرف کٹی ہوئی فصل میں دودھ پیاس کا ہے
گُل مُنہ کی دبیز خوش بُو میں چُور ہیں بام و در ہوا کے
جو ہے تو اک گوشہ سیہ میں خُمار خالی گلاس کا ہے
عجیب تھا اس ہرے بھرے کھیت سے گزرنے کا تجربہ بھی
مگر یہ ہر عضو کی زباں پر جو ذائقہ زرد گھاس کا ہے
یہیں پہ رُک کر اندھیری آنکھیں اُتار کر جیب میں اُڑس لو
کہ اس گھنے وہم کے عقب میں سفید جنگل کپاس کا ہے
کہاں گیا ظفر اس کے تازہ تر جسم کے جال سے نکل کر
سفید بیڈ شیٹ پر پڑا یہ بوسہ اسی بدحواس کا ہے

محسوسات کی تعقلاتی ہیئت شناخت کیجیے! لہو کی سرسبز تیرگی۔ اس ٹکڑے سے کئی بے نام اندھی کیفیات جنم لیتی ہیں۔ خوشہ چیں نرم گرم لڑکی اُن بے نام کیفیات کا بہاؤ متعیّن کرتی ہے۔ گُل مُنہ، فصل میں دودھ پیاس کا، ہرے بھرے کھیت سے گزرنے کا تجربہ، لہو کی سرسبز تیرگی کو پھیلاتا ہے۔ گُل مُنہ باطنی اشارے کے طور پر اُبھرتا ہے: اس باطنی اشارے کا معروضی سیاق و سباق گوشہ سیاہ، سیہ نوشی کے اتصال کے پہلو بہ پہلو بعد از ہنگام نا و نوش کی کیفیات کو خالی گلاس سے مواصلت دیتا ہے، خُمار اور خالی گلاس میں جو چھپا ہوا رہا ہے اُسے بھی پیش

گزرنے کے بدن کا ایک مخصوص حالت سے باہر آئے ہوئے، خالی ہوتے ہوئے کو تھا، خالی گلاس کے مادّی اور نیم علامتی رنگ سے متّحد ہے۔ خالی گلاس مادّی تعیّن کو پھلانگ کر نیم علامتی ہو گیا ہے کہ اسی سے منسلک ہرے بھرے کھیت سے گزرنے کا تجربہ ہے جو کہ بعد کی، ایک کیفیت کے ختم ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حالت ہے جس میں مبہائی، اصل سے کم، گھٹی ہوئی، یادوں میں زندہ کیفیت ہے۔ یہ ایک ذائقہ ہے، زبان کا نہیں، ہر عضو کی زبان کا، تمام وجود کا، زرد گھاس سے۔ یہ محسوساتی مقام اب ایک تغیّر سے آشنا ہوتا ہے، اندھیری آنکھیں اُتار کر جیب میں اُڑس لو کہ گھنے وہم کے عقب میں سفید جنگل کپاس کا ہے۔ سفید جنگل کپاس کا، کس کی طرف اشارہ ہے، متعیّن نہیں کیا گیا۔ وہ سیہ کیفیت جو سرسبز تیرگی، گُل مُنہ اور اندھیری آنکھوں کی صفتِ مشترک، تاریکی، سے پیدا ہوئی ہے، اُسے وہم کی تاریکی سے مماثل کر کے تمام محسوساتی کائنات کا بہاؤ بدل دیا گیا ہے۔ نرم گرم خوشہ چیں لڑکی، کٹی ہوئی فصل، ہرے بھرے کھیت، زرد گھاس، سفید جنگل کا ذخیرۂ الفاظ بار بار باہر کے منظر نامے کو اُجاگر کرتا ہے۔ آخری شعر میں سفید بیڈ شیٹ اس بیرونی منظر کو پس منظر میں لے جاتی ہے۔ چناں چہ ابتدا کی سیاہی آخر آخر سفیدی میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ سیاہ رنگوں میں سفید رنگ کی شمولیت مسلسل ہے: دودھ، سفید جنگل، کپاس، سفید بیڈ شیٹ۔ شروع میں سفیدی بہت معمولی سی ہے۔ آخری اشعار میں سفید جنگل، کپاس، سفید بیڈ شیٹ کے ذریعے سفیدی کا پے بہ پے تذکرہ سیاہی پر چھا جاتا ہے۔ جس کیفیت کا بنیادی طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، اس میں مزے کی جنسی کیفیت اور سیہ نوشی کی یکجائی ہے۔ یہ مجتمع حقیقت وہم کے حوالے سے منقلب کی گئی ہے۔ پھر اُسے درونِ خانہ بیڈ شیٹ سے ملوّث کیا گیا ہے۔ سفید بیڈ شیٹ پر پڑا ہوا بوسہ محض ایک صورتِ حال نہیں پیش کرتا۔ اس کے معانی بہت وسیع ہیں۔ سیاہی کی کیفیات کی تکمیل کے بعد اندھیری آنکھیں اُتار کر جیب میں اُڑس لینے کو کہا گیا ہے کیوں کہ اندھیری آنکھوں کی بصارت گنوانا اس لیے ضروری ہے کہ گھنے وہم کے عقب میں سفید جنگل کپاس کا ہے۔ کپاس کا سفید جنگل اندھیری آنکھوں کی بصارت سے نہیں جانا جا سکتا۔ سفیدی کی خلائی کیفیت تک پہنچنے کے لیے ان وسائل سے کنارہ کشی لازمی ہے۔ کنارہ کش ہوتے ہی منظر بدلتا ہے۔ سفید بیڈ شیٹ پر پڑے ہوئے بوسے کا امیج ظاہر ہوتا ہے۔ یہ امیج سفید کپاس کے جنگل کا کنایہ ہے۔ سفیدی کے منظر کو بجائی ہوش و حواس پا لینا ممکن نہیں، یہاں تو بدحواسی ہو

لی۔ بدحواسی کی یہ حالت اس امیجری کے تلازماتی سفر کو روحانی تجربہ بناتی ہے۔ کئی مصرعوں کا آہنگ کہ بظاہر اکھڑا ہوا نظر آتا ہے، بدحواسی پر ڈھالا گیا ہے۔ آہنگ اور داخلی کیفیت کے ساتھ ساتھ سیاہی سفیدی میں تبدیل ہوتی ہے۔ آمنا سامنا کہ سفیدی کی تحصیل کے مترادف ہے، جس بصارت کو تیاگ کر میسّر آیا ہے۔ بدحواسی غیر متوقع صورت سے دوچار ہونے کی ایک ایسی شکل ہے جو پرانی تشکیل کو مسمار کر کے نئی تشکیل کی راہیں کھولتی ہے! اس ضمن میں جنس کا استعارہ ظفر اقبال کے یہاں منطقی ہو گیا ہے۔

جنس کا موضوع اب شدید ردِعمل پیدا نہیں کرتا کہ زندگی کے اس عنصر کا مسلسل اظہار تمام راہیں روک چکا ہے۔ اس ضمن میں قاری اور نقاد بہت اُلجھتے رہے ہیں۔ انھیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ جنس کا برملا تذکرہ فحاشی اور بے راہ روی کے ذیل میں کیوں نہیں آتا؟ وہ خود کو، اپنے اپنے طور پر، یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتے تھے کہ اظہار کا یہ عمل ناپختہ ذہنوں کی خرابی کا باعث ہے کہ اس میں جذباتی انگیخت کی جو جو شکلی اور جسمی صورتیں ہیں وہ تہذیبی روابط کو، کہ درحقیقت جنس کی ناآسودگی کے غیر صحت مندانہ اخفا و انکار پر مبنی ہوتے ہُوئے قدغن کی ایسی ایسی فصیلیں کھڑی کرتے تھے کہ ایک ذرا سے شگاف کا امکان لاتعداد مفروضوں کو قائم کر کے ہذیانی نفرت و تضحیک کا طوفاں برپا کرتا تھا، ملحوظ نہ رکھنے سے اخلاق کی دائرہ در دائرہ قدروں سے ماخوذ استحصال و غارت گری کی پردہ پوشی کے ذریعے گھُٹتی یا نا گھُٹتی کی حدیں باندھنے والے حفظِ مراتب کے ان ضابطوں کی جو تقویم احسن کے قرار واقعی معتمد ٹھیر سکتے ہوں، بیخ کنی کرتے ہیں کہ تشخیص سے شروع ہو کر اصلاح تک لے جانے والا اشارہ، کہ خود ببوید نہ کہ عطار بوید، جس حد تک بلیغ ہو اسی قدر بُرائی کی تصویروں کے حاشیے شوخ اور اچھائی کے مرقعوں کے رنگ ماند پڑ جاتے ہیں، تا آں کہ معصیت کے آثار پر متخیلہ کی آنچ سہاگے کا کام کر کے بالغ نظری، کہ طفلِ ناداں کو لذتِ جماع سے آشنا کرنے کا درجہ رکھتی ہے، حاصل نہیں ہونے دیتی۔ ادب میں اس سوءِ ظن کی گنجائش یوں بھی نہیں کہ اوامر و نواہی کی یہ صورت کلاسیک نام کی چیز میں کبھی بار نہیں پا سکی۔ بار بار کی یاددہانی آڑے آئی، قاری اور نقاد تسلیم کر گئے کہ جنس ادب کے موضوعات میں شامل ہے۔ اس سے حقیقتوں کی رونمائی ہوتی ہے، گھٹن سے نجات ملتی ہے، اصلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ جنس موضوع کے طور پر تسلیم ہو کر منزل ٹھیری تو قاری اور نقاد بھی ٹھیر گئے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ انحطاط کی نشاندہی کرتا ہو، سماجی ناہمواری کا تذکرہ مقصود ہو، اچھائی بُرائی کی تمیز مطلوب ہو، انفرادی نفسیاتی اُلجھنوں کی کھوج پیشِ نظر ہو، جنس شکلیں بدلتی آ براجمان ہوتی ہے۔ اب فحاشی اور بے راہ روی کی تہمت تو نہیں لگتی لیکن جنس کا ذکر قدروں سے تین طور پر ملوث دکھائی دیتا ہے۔ جنس چاہے موضوع ہو چاہے ذریعۂ اظہار، سماجی حوالے صفِ اول میں جگہ پاتے ہیں۔ جنس کا موضوع اور صیغہ ابھی تک اخلاقیات سے مامون نہیں ہُوا۔ اب اشد ضروری ہے کہ جنس کا موضوع اور صیغہ ادبی سیاق و سباق میں قائم ہو۔ ظفر اقبال کے یہاں جنس کا موضوع اور صیغہ اکثر و بیشتر ادبی سیاق و سباق میں قائم ہُوا ہے، پھر بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں:

بتی جلا کے دیکھ لے، سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیان میرے نیچے ہے، شلوار اس طرف

☆

نم نشیں تھی سُرمئی سلوٹ کی سنگ آمیز سطح
ایک فٹ کے فاصلے پر دو سفید اگلاب تھے

☆

پیڑ کے پتے ہوں حیرت ہوا میں جیلہ ہو
گھاس کے گھنگھور میں رس کی بھری انجیر تھی

☆

الف ایل اسرار خشم شوبی
عکساں رقصاں تھو تھو پ

ایسی مثالوں سے قطع نظر ظفر اقبال کی شاعری میں جنس ادبی سیاق و سباق میں نظر آتی ہے کہ اخلاقی قدروں سے ملوث نہیں۔ ادب میں ایک سطح ایسی بھی ہے جہاں اخلاق اور غیر اخلاق کے سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ادب کی تہذیبی حیثیت میں اس سطح کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اپنی نظر میں یہ بات مستحسن نہیں! اشیا ادب کی مملکت میں جب پورے حقوقِ شہریت حاصل کر لیتی ہیں تو ان کے وطنوں کے حوالے موقوف ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ادب کی سرزمین میں نشوونما پاتی ہیں جہاں پچھلے علاقوں کے اخلاقی لاحقے پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ لہو کی سرسبز تیرگی والی واردات اور درج ذیل شعری واردات میں جنس کا ادبی سیاق و

سانی مشترک ہونے کے علاوہ صوتی ساتی عقلائی ہیئت بھی ایک جیسی ہے:

میدان تھے جہاں وہاں ننگے جنگل ہُوئے
بے جسم و جاں جڑیں کسی ڈر کے ڈھل ہُوئے
جنگل میں جاگنے لگی خُشبوئی خواب کی
جھاڑاں گُلاب تھی گئے، کیکر صندل ہُوئے
سایے سے، آٹھ کے جسم کی جنت سے، جا بجا
زنجیر زمہریں میں کالے کُنڈل ہُوئے
آنکھوں کے آنگنوں میں اُڑا چندر کا غُبار
ذرّات زرد زرگری مَلکھ منڈل ہُوئے
لوہے کی لاٹھ بن کے اُڑے عُمر بھر تو ہم
جب ٹوٹنے لگے تو سرِھوں کی گندل ہُوئے
پتّوں کی پیرہن پہ ٹین عکس کی، ظفر
جھلکار یُوں پڑی کہ جنگل میں منگل ہُوئے

قوافی کے تیور چونکانے والے ہیں، ثابت و سالم نون کو نون غنہ میں بدل کر قافیہ سہ حرفی کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک عجیب لوچکنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ تمام کے تمام قوافی پر فنکار نے اپنی تخلیقی مُہر ثبت کر دی ہے۔ ہر قافیہ پہلے بھی موجُود تھا، چار حرفی لفظ کی صُورت میں، موجُودہ حالت میں نہیں، یہ حالت تو ظفر اقبال نے پیدا کی ہے۔ سہ حرفی جنگل وغیرہ شاعر کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ مزید برآں "جھاڑاں گُلاب تھی گئے" میں دو زبانوں کی لذّت جس طرح شیر و شکر ہوئی ہے اس کا رنگ خاص الخاص ہے۔ پھر زرگری مَلکھ منڈل میں اضافت کی تمکنت دیدنی ہے۔ مطلعے کا مصرع ثانی خالص لسانی تشکیل ہے۔ بے جسم و جاں جڑیں کسی ڈر کے ڈھل ہُوئے! ذہن کے حلاوں میں یہ لسانی تشکیل پھیلتی تو ہے لیکن متشددانہ گرفت، کہ معنی کے حتمی استخراج کی ضامن ہو سکے، حاصل نہیں ہوتی، لذّت اور ذائقے کے مطلقے اسیر نہیں ہوتے۔ ڈر، وہم، خوف اور خواب کی سرحدیں کئی مقامات پر مل جاتی ہیں۔ بے جسم و جاں جڑوں اور خواب کی خشبوئی میں بوجہ غیر مرئیت ایک اتحادِ داخلی ہے۔ بے جسم و جاں جڑیں ڈر کے ڈھل ہیں تو خواب کی خشبوئی کہ جس سے جھاڑاں گُلاب اور کیکر صندل ہو

گئے ہیں، اس بنجر زمین کو جہاں جھاڑ اور کیکر ہیں کہ ان کے ڈھل ہیں، ڈر کے ڈھلوں کے متوازی رکھ کر گُلاب اور صندل بناتی ہے۔ ڈر، خوش بُو سے منسلک ہو جاتا ہے، خوش بُو میں منقلب ہو جاتا ہے۔ پتناں چہ اُسی خوف اور خواب کی صفات سے مثلث ہو جاتا ہے۔ میدان کہ جہاں ننگے جنگل نہیں، منزہ کیفیت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ منزہ لیکن خالی، بے رنگ، بے بُو۔ جسم کی جنت سے پہلے جھاڑ ہیں: کتاب مقدس کی جنت، آدم و حوّا کا مسکن، اور سایے۔ کالے کُنڈل تلازماتی طور پر اوّلیں گناہ کے محرّک، سانپ کو ذہن میں لاتا ہے۔ سایے کالے کُنڈل ہو کر مجسّم تھا اور ہم میں دھنسے ہُوئے جسموں میں ایک عنصر ٹھوس جسمیت رکھتا ہے اور دوسرا عنصر ایک صفت محض ہے۔ یہ مرکب ایک داخلی کیفیت کا معروضی استعارہ ہے۔ یہاں سے غزل کا بہاؤ داخلی ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ چندر کا غبار آنکھوں کے آنگنوں میں اُڑتا ہے تو خبر ہوتی ہے کہ آنگن ایک چار دیواری رکھتا ہے، کھلا ہونے کے ساتھ ساتھ اندرونی کمروں کی بند حالت کو لیے ہُوئے داخل خارج کے بین بین صُورت پیدا کرتا ہے۔ ذرّات زرد، چندر کا غبار، زرگری مَلکھ منڈل میں ایک قدر مشترک رنگ ہے۔ دُوسری قدر مشترک ذرّات اور غبار میں جسمانی حالت کی ہے۔ پھر یہ کیفیت اُس صُورت کے بالکل برعکس ہے جو میدان سے متعلق ہے۔ ٹھوس، اپنی حالت میں قائم۔ ذرّات اور غبار اپنی جامد حالت پر قائم نہیں۔ یہ تو ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت سے اپنا وجُود پاتے ہیں۔ چندر کے غبار اور ذرّات زرد کی یہ حالت اپنے اندر ٹوٹنے کا جو اشارہ رکھتی ہے وہ اگلی سطروں میں واضح ہو جاتا ہے: ٹوٹنے لگے تو سرِھوں کی گندل ہوئے! یہ ٹوٹنا کیسا ہے؟ ارادے اور پامردی سے لوہے کی لاٹھ بن کر عمر بھر کی ثابت قدمی کے بعد جب ٹوٹنے پہ آئے تو کتنے نازک نکلے! سرِھوں کی گندل نباتاتی خانوادے سے مستعار ہے۔ یہیں سے پتّوں کا، نباتات کا حوالہ پھر سے آن موجُود ہوتا ہے۔ اس غزل میں جمادات اور نباتات کے ایک دُوسرے سے جنم لیتے اور ایک دُوسرے میں مدغم ہوتے استعارے بکثرت موجُود ہیں۔ آنکھوں کے آنگنوں میں چندر کا غبار اب ٹین عکس کی صُورت جلوہ گر ہوا ہے، جس کی جھلکار پڑنے سے جنگل میں منگل ہُوئے۔ پھر پتّوں کے پیرہن میں جو اشارہ مخفی ہے اُس کا ایک رشتہ وہ بھی ہے جس کی جانب جسم کی جنت کشاں کشاں لیے جاتی ہے۔ ڈر سے روشنی تک کا ایک سفر طے ہو گیا۔ اس سفر کے دوران میں ذات کی شکست و ریخت بھی ہوتی ہے!

محسوسات کی ان ہر دو عقلائی ہیئتوں کے تقابل سے ہمیں جس چیز کی آگہی ملتی ہے، وہ خیر کا اشتراک ہے۔ محسوسات کی وہ ثابت و سالم شکل جس کی طرف یہ ہر دو تعقلاتی ہیئتیں اشارہ کرتی ہیں۔ محسوسات کی ثابت و سالم شکل کے کئی پہلو ہیں۔ ہر پہلو میں کچھ تو وہ ہے جو دیگر پہلوؤں میں بھی موجود ہے اور کچھ وہ ہے جو مختلف ہے۔ یہ کہ جو مختلف ہے ہر پہلو میں نئی آن بان سے ظاہر ہوتا ہے۔ مختلف کے ہر پہلو سے پیدا ہونے والے زاویے اُس سے کہ مشترک ہے، مل کر ثابت و سالم شکل کی افزائش کرتے ہیں۔ محسوسات کی اس بنیادی شکل کو جس کے بے شمار پہلو بکھرے پڑے ہیں، ظفر اقبال نے گرفت میں لیا ہوا ہے: مشترک جلوے نظر آ گئے، اب مختلف کی تلاش آپ کے ذمے ہے۔ اپنی ذمہ داری پوری کیجیے، پھر دیکھیے اساطیری مہاج پردۂ زنگاری کے پیچھے سے کس طور جلوہ فگن ہے!

افتخار جالب

10 جنوری 1965ء

لاہور

بہتی ہوئی چاروں طرف آواز پگھل کر
کیا رہ گیا دیکھو مرا انداز پگھل کر
ناچار ظفر گرمیِ گفتار کے ہاتھوں
کچھ اور ہوئے جاتے ہیں الفاظ پگھل کر

-☆-

سب سمجھتے ہیں کہ جس سے ملتا جلتا رنگ ہے
لاکھ تُو کہتا پھرے میرا تو اپنا رنگ ہے

کل یہی منظر گھرا تھا کپکپاتی دُھند میں
آج اس تصویر میں جو ہے تماشا رنگ ہے

سبز میں گہرا گلابی ۔ زرد میں کالا سیاہ
دیکھ! آنکھیں بند کر کے دیکھ! کیسا رنگ ہے

کِھل کے مُرجھا بھی گیا ہلکی ہوا کا سرد پھول
کِس قدر خوش بُو ہے اب بھی اور کتنا رنگ ہے

پتھروں کی اوٹ سے اُبھرا سُلگتا سُرخ چاند
جھیل میں پانی نہیں سارے کا سارا رنگ ہے

جیسے اس خاموش جنگل میں اُگ آیا ہوں ابھی
سنسناتا جسم ہے مٹی میں جلتا رنگ ہے

خون کا شعلہ اگر دامن پہ بکھراؤں نہ میں
کِس طرح مجھ پر کھلے یہ آگ ہے یا رنگ ہے

ہاتھ آنکھوں پر رکھے گھر سے نکلتا ہوں ظفر
کیا بتاؤں کوچہ و بازار کا کیا رنگ ہے

☆

ویراں تھی رات چاند کا پتھر سیاہ تھا
یا پردۂ نگاہ سراسر سیاہ تھا

ٹوٹے ہُوئے مکاں کی ادا دیکھتا کوئی
سرسبز تھی منڈیر ۔ کبوتر سیاہ تھا

میں ڈوبتا جزیرہ تھا موجوں کی مار پر
چاروں طرف ہوا کا سمندر سیاہ تھا

نشہ چڑھا تو روشنیاں سی دکھائی دیں
حیران ہوں کہ موت کا ساغر سیاہ تھا

وہ خواب تھا کہ واہمہ بس اتنا یاد ہے
باہر سفید و سُرخ تھا اندر سیاہ تھا

چمکا کہیں نہ ریت کا ذرّہ بھی رات بھر
صحرائے انتظار برابر سیاہ تھا

اس طرح بادلوں کی چھتیں چھائی تھیں ظفر
سہمی ہُوئی زمین کا منظر سیاہ تھا

☆

اور بھی ہیں قفس کئی دورِ شبِ ملال سے
پانو نکالیے کبھی سلسلۂ سوال سے

سیلِ ہوا کے ساتھ ساتھ زرد لہو کی لہر تھی
کون سی مے چھلک گئی کس کے خُمِ خیال سے

دھند کھلی ہوئی نہ تھی سروِ رواں کے آس پاس
چہرہ گھرا ہوا نہ تھا شرم خُمارِ شال سے

آنکھ میں تیرتی رہی تنگ دہن تنگ آرزو
آئنہ کانپتا رہا مُعجزۂ مُحال سے

رات وہی ہے ارجمند، ذات وہی ہے سربلند
لمحۂ جاں گزر گیا جسم کے ماہ و سال سے

سر پہ رہے گی ساتھ ساتھ وہم کی نرم گرم دھوپ
دامنِ خارزار تک سبزۂ پایمال سے

خلعتِ خاک سے ظفر میرے بدن کی آرزو
کاش اسے بچا سکوں شعلۂ برشگال سے

-☆-

میں بھی شریکِ مرگ ہوں، مر میرے سامنے
میری صدا کے پھول، بکھر میرے سامنے

آخر وہ آرزو میرے سر پہ سوار تھی
لائے تھے جس کو خاک بہ سر میرے سامنے

کہتے نہیں ہیں اُس کا سخن میرے آس پاس
دیتے نہیں ہیں اُس کی خبر میرے سامنے

آگے بڑھوں تو زرد گھٹا میرے روبرو
پیچھے مُڑوں تو گردِ سفر میرے سامنے

میں خودکشی کے خون کی آندھی ہوں ان دنوں
اُڑتی ہوئی ہوا سے نہ ڈر میرے سامنے

آنکھوں میں راکھ ڈال کے نکلا ہوں سیر کو
شاخوں پہ ناچتے ہیں شرر میرے سامنے

طاری ہے اک سکوت ظفر خاک و خشت پر
جاری ہے بادلوں کا سفر میرے سامنے

-☆-

جسم جو چاہتا ہے اُس سے جُدا لگتی ہو
بہری ہو مگر آنکھوں کو صدا لگتی ہو

سر پہ آ جائے تو بھر جائے دُھواں سانسوں میں
دُور سے دیکھتے رہیے تو گھٹا لگتی ہو

پھڑپھڑاتا ہو یہ شاخ میں اُلجھا ہُوا چاند
چاندنی عکس کوئی اُڑتا ہُوا لگتی ہو

چشمہ چشم رواں ہو کہ مٹے پیاس کا نقش
روزن زخم کُھلا ہو کہ ہوا لگتی ہو

ایسی آواز خلاؤں میں اُڑائی جائے
جو لبوں تک ہی رہے اور رسا لگتی ہو

ایسی تلوار اندھیرے میں چلائی جائے
کہ بُجھا چاہتے ہوں اور بُجھا لگتی ہو

-☆-

جسم کے ریگ زار میں شام و سحر صدا کروں
منزلِ جاں تو دُور ہے طے یہی فاصلا کروں

یہ جو رواں ہیں چار سُو اٹتے دُھویں کے آدمی
کس لیے چوب سبز کو آگ سے آشنا کروں

قید کرے تو آپ ہے قید ہے تو آپ ہے
میں کسے روکتا پھروں اور کسے رہا کروں

رات رُکی ہے آن کر زرد سفید گھاس پہ
لاکھ سخن ہے درمیاں کس سے کسے جُدا کروں

شاخ ہلی تو ڈر گیا ، دُھوپ کِھلی تو مر گیا
کاش کبھی تو جیتے جی صبح کا سامنا کروں

-☆-

کہاں کی آگ تھی کیا جانے اور دھواں کیسا
بدل گیا تھا ظفرؔ رنگ آسماں کیسا

اُڑا غبار نہ موجود نقشِ پا ہے کوئی
گزر گیا ہے اِدھر سے یہ کارواں کیسا

دیا ہے تیغِ تغافل کا وار اگر خالی
تو شاخِ دل پہ ہے یہ زخم کا نشاں کیسا

دہکتی ریت کا دروازہ وا ہے کس کے لیے
کنارِ دشت پہ آباد ہے مکاں کیسا

قضا کی فوج میں یہ جنگ ہو رہی ہے کہاں
ہوا کی موج میں یہ رنگ ہے رواں کیسا

وہ روشنی ہے کہ منظر ہے ایک سا ہر سُو
مجھے خبر نہیں کچھ، کون ہے کہاں کیسا

☆

غزل کا شور ہے اندر پُرانا
بہت گونجے گا یہ پیکر پُرانا

بدن پر ہے وہی مٹی کا ملبوس
نظر میں ہے وہی منظر پُرانا

وہی ہے حسرتِ منزل دلوں میں
وہی ہے راہ کا پتھر پُرانا

پڑھی جاتی نہیں خواہش کی تحریر
ہُوا احساس کا دفتر پُرانا

لُٹا رختِ سفر دشتِ ہوس میں
بغل میں رہ گیا بستر پُرانا

کبھی اُمید سے آزاد ہوں گے
کبھی بدلیں گے یہ محور پُرانا

ظفرؔ دل سے نکل تو جائیں گے ہم
بہت یاد آئے گا یہ گھر پُرانا

☆

نظر نواز تو ہیں بحر و بر ہمارے لیے
وہاں جہاں ہی کسی ہال و پر ہمارے لیے

کہیں فضا میں بسایا ہے عکسِ تاب کا شہر
کہیں ہوا میں بنایا ہے گھر ہمارے لیے

یہ برگ تازہ نہیں لوحِ سبز تھی جس پر
لکھی ہوئی تھی نئی اک خبر ہمارے لیے

ہماری موج بُکہ نے بہا دیے ورنہ
ہزار نقش بنے خاک پر ہمارے لیے

پڑے ہوئے تھے خس و خار کی طرح لیکن
اُٹھا نہ سنگِ سیہ سے شرر ہمارے لیے

کوئی برستا رہا قہر کی گھٹا بن کر
کوئی ترستا رہا عمر بھر ہمارے لیے

کنارِ دشت پہ دیوار سا کھڑا ہے ابھی
بلائے خوابِ سفر کا خطر ہمارے لیے

کیا ہلاک ہمیں دشمنوں نے رستے میں
سجے ہوئے تھے یہاں بام و در ہمارے لیے

غزل میں نا نکلتے ہیں وصل و ہجر کے مضمون
کہ رہ گیا ہے یہی اک ہنر ہمارے لیے

-☆-

دریائے تند موج کو صحرا بتائیے
سیدھا بھی ہو سوال تو اُلٹا بتائیے

جیسا بھی ہے وہ سامنے سب کے ہے کس لیے
ایسا بتائیے ، اُسے ویسا بتائیے

کیوں چھوڑ کر گیا تھا وہ ، کیوں پھر سے آ گیا
آگے بتا بھی سکتے تھے ، اب کیا بتائیے

محفل کی رونقیں ہوں کہ بازار کا ہجوم
یہ دل جہاں بھی ہو اِسے تنہا بتائیے

یا قتل کیجیے اُسے اپنے ہی نام پر
یا اجنبی کو شہر کا رستا بتائیے

جس کی کبھی جھلک بھی نہ دیکھی ہو عمر بھر
تُو ہی بتا ظفرؔ اُسے کیسا بتائیے

-☆-

بکھر بکھر گئے الفاظ سے ادا نہ ہُوئے
یہ زمزمے جو کسی درد کی دوا نہ ہُوئے

سفر میں گوش بر آواز تھا ہر اک ذرّہ
کھلا تھا سامنے صحرا ہمیں صدا نہ ہُوئے

نئی ہوا میں مہک ہے پُرانے پتّوں کی
جو خاک ہو گئے، پر شاخ سے جُدا نہ ہُوئے

ہوا کے ساتھ کئی اشک سے اُڑے تو کسی
کسی تو ریتلی مٹّی کا آب و دانہ ہُوئے

غزل میں تھے بہُت آزادہ رو ظفرؔ لیکن
تلازمات کی زنجیر سے رہا نہ ہُوئے

-☆-

خالی خولی غُبار نِکلا
اِس خاک سے جو سوار نِکلا

آیا جب دُوسرا کِنارہ
دریا دریا کے پار نِکلا

مستی نہیں آنکھ میں طلب ہے
نشّے کی جگہ خُمار نِکلا

تلوار کی تیز دھار تھا جو
آخر کو خاکسار نِکلا

کندھے پہ اُٹھائے ہی پھِرا گھر
گھر سے جو ایک بار نِکلا

-☆-

مقبولِ عوام ہو گیا مَیں
گویا کہ تمام ہو گیا مَیں

احساس کی آگ سے گزر کر
کچھ اور بھی خام ہو گیا مَیں

دیوارِ ہوا پہ لکھ گیا وہ
یوں نقشِ دوام ہو گیا مَیں

پتھر کے پانو دھو رہا تھا
پانی کا پیام ہو گیا مَیں

اُڑتا ہُوا عکس دیکھتے ہی
پھیلا ہُوا دام ہو گیا مَیں

☆

گنگ ہے خاکسترِ خوں بوتا پھرتا ہوں مَیں
خواب کے موتی ہیں جن کو روتا پھرتا ہوں مَیں

میری سنگ اُفتادہ آنکھوں میں نہیں بچتا یہ رنگ
جامِ شامِ زرد میں کچھ گھولتا پھرتا ہوں مَیں

شہر سارا سو رہا ہے نیند کی گرمی میں گم
بند دروازے ہوا کے کھولتا پھرتا ہوں مَیں

کیا ملا مجھ کو پہن کر تجھ کو اے نازک بدن
ڈھیلا ڈھالا پیرہن ہوں، جھولتا پھرتا ہوں مَیں

سرسرا کر کیوں فضا میں جم نہیں جاتا ظفرؔ
ڈور قائم ہے تو پھر کیوں ڈولتا پھرتا ہوں مَیں

☆

تصویرِ باغ و منظرِ دریا اُلٹ گیا
بیٹھے بٹھائے طاقِ تماشا اُلٹ گیا

ہم بھی گئے تھے گرمیِ بازار دیکھنے
وہ بھیڑ تھی کہ چوک میں تانگا اُلٹ گیا

کیسا ہمیں ستائے رکھا چشمکوں کے ساتھ
کی ہم نے چھیڑ چھاڑ تو کیسا اُلٹ گیا

کام آ سکا یہاں نہ دلوں کا دھواں بھی کچھ
آخر بساطِ رنگ وہ تنہا اُلٹ گیا

چلنے لگے تو وہم کے جھکڑ تھے چار سُو
پایا نشانِ راہ تو صحرا اُلٹ گیا

جیسے گئے تھے موت کی محفل سے لوٹ آئے
ہاتھوں میں آ کے زہر کا پیالا اُلٹ گیا

کیوں اتنی جلد سانس ہوا کی اُکھڑ گئی
کیوں راستے میں طشتِ تمنّا اُلٹ گیا

جنات وہ اُٹھے ہیں کہ رُوئے زمین پر
انساں کے اقتدار کا تختہ اُلٹ گیا

نقادِ کہنہ پر اثرِ شعرِ نو ہے یہ
پڑھ کر غزل غریب کا بھیجا اُلٹ گیا

☆

گیا شورِ شبخونِ غم بھی گیا
کھلا آرزو کا علَم بھی گیا

ہر اِک مسندِ خاص خالی ہوئی
خدا تو گیا تھا صنم بھی گیا

بدن جنگلوں کی صدا سو گئی
رمِ شعلہ دم قدم بھی گیا

فضاؤں کے منظر تو کیا دیکھتے
ہواؤں کا احساسِ کم بھی گیا

کوئی اور نقشہ جمائے کہ اب
تغزّل کا طوفان تھم بھی گیا

☆

اُلٹے پلٹے ہنڈے دیتے رہے دُہائیاں
آپس میں لڑتی رہیں پیلی زرد اکائیاں

مُنہ پر مَل کر سو رہے کالی کیچڑ زندگی
جیسے یُوں ڈھل جائیں گی ہونے کی رُسوائیاں

گر کر ٹھنڈا ہو گیا جلتا ہاتھ فقیر کا
جیبوں ہی میں رہ گئیں سب کی نیک کمائیاں

پھرتا ہُوں بازار میں، رُک جاؤں، لیتا چلوں
اُس کی خاطر بریزیئر اپنے لیے دوائیاں

گھر والی کے واسطے بچی نہ پیالی چائے کی
مُنّے چلتے آن کر کھا گئے کیک مٹھائیاں

ننگا الف درخت ہُوں ہنگاموں کی دُھوپ میں
سوکھ سُلگ کر جھڑ گئیں ہری بھری تنہائیاں

کیا قدموں میں کھڑی تھیں عکس اُتار پُجارنیں
کیا پتھر کا دیوتا لیتا تھا انگڑائیاں

چلتا پھرتا گود میں نیلا گولا اُون کا
گرم گُلابی اُنگلیاں، گہری سبز سلائیاں

ذرّے میں صحرا ظفرؔ جاگا گہری نیند سے
بادل بن کر چھا گئیں مٹی کی گہرائیاں

☆

کیسی ہار تھی کیسی جیت اور کیا جھکی پہ ستا
تند ہوا کی لہر اُڑا کر لے گئی پتا پتا

تن بھی ننگا من بھی ننگا سُورج بھی ہے سخت
دُھوپ کی چادر دے کر کوئی لے گیا کپڑا لتا

آسمان پہ چڑھی ہُوئی بادل برسات پتنگ
اور سڑک پہ پڑا ہُوا چپّل کا جلتا پتا

مَیں کنکر تھا کس نے مُجھے چلایا زور سے اتنے
آن کی آن میں کیسا بکھرا زرد بھڑوں کا چھتا

لیس تھی ساری فوج تغزل کے سب ہتھیاروں سے
جس کے مقابل لڑنے والا تنہا اور نہتا

ختم ہُوا پٹرول تو آخر رُکی شعر کی گاڑی
ٹنکی میں یہ ایک قافیہ باقی تھا البتہ

☆

شاعر وہی شاعروں میں اچھا
کہا جائے جو شاعری کو کچّا

جاری ہے رگوں میں خون بن کر
اک جھوٹ سفید اور سچّا

بوئے ہوئے دُکھ اُٹھا اُٹھا کر
دچکا تھا کبھی سو اب ہے دچّا

کرتے رہے اپنے آپ کو قتل
دیتے رہے دوسروں کو پچّا

وردیں تھیں لگی ہوئی میاں کو
بچّہ جن کر کھڑی تھی زچّہ

آدم نہ سمیٹتا یہ جھنجھٹ
ہوتا اگر آدمی کا بچّہ

پانی بھر بہہ گیا کناروں
پھر جسم سے بھر گیا چوبچّہ

اوپر نیچے ڈھوڈو موڈو
مچتا رہا دیر تک دھچّہ

مطلع میں ظفر کو روکتا کون
اچھا کو جو باندھ لیتے اچّا

☆

بد رنگ ہے زمیں ابھی کالا ہے آسماں
آنکھیں پگھل سکیں تو اُجالا ہے آسماں

خاموش ہے فضا کہیں بے ہوش ہے ہوا
گویا سروں پہ ٹوٹنے والا ہے آسماں

ہے پانو میں پڑی ہوئی زنجیر یہ زمیں
سر میں کھبا ہوا کوئی بھالا ہے آسماں

پانی میں عکس کانپتا ہے دور دور تک
جیسے کسی نے خاک پہ ڈالا ہے آسماں

دن کو وہی دھوئیں کے بگولے ہیں جابجا
راتوں کو دیکھیے تو نرالا ہے آسماں

مَیں نے کہ دیکھ دیکھ کے جلتا ہوں اب ظفر
اپنی ہی پستیوں سے اُچھالا ہے آسماں

☆

سنسناتی ہوئی فضا کے سوا
کچھ نہیں ہے کہیں ہوا کے سوا

بحر سنسان ہے گُہر کے بغیر
دشت ویراں ہے نقشِ پا کے سوا

دھوپ ہی دھوپ ہے جدھر دیکھو
سر میں چھت چھانولی گھٹا کے سوا

پس دیوار کچھ نہیں باقی
نوحہ نقشِ نارسا کے سوا

ہے یہ صحرا مرا گواہ کہ میں
اور کچھ بھی نہیں صدا کے سوا

چارۂ چشم اور کیا ہو ظفر
عشرتِ عکسِ جابجا کے سوا

☆

ذرّوں کا اختیار نہیں تھا ہواؤں پر
عمریں گزر گئیں وہی دھندلا ہے گاؤں پر

اس کو بھلا کہوں کہ بُرا کوئی نام دوں
ساری گزر بسر ہے اسی دھوپ چھاؤں پر

بیٹھا ہوں اپنی آنکھ کی پتلی میں اور کبھی
پھیلا تھا آسماں کی طرح ان خلاؤں پر

کیا صبح تھی کہ دل کا صدف کانپتا رہا
سُونے سمندروں کی سسکتی صداؤں پر

ہے کس کا نقش رات کے پتھر پہ جابجا
تھی کس کی مُہر روشنیوں کی رداؤں پر

سو کر اُٹھے تو شہر کا نقشہ ہی اور تھا
چھائی ہوئی تھی موت کی مستی فضاؤں پر

منزل کی موج تھی کہ سروں سے گزر گئی
راہوں کا رنگ ہے کہ چمکتا ہے پاؤں پر

☆

جس کی فضا آفتاب ، جس کی ہوا آفتاب
آج اُسی دشت میں سرد ہُوا آفتاب

اُس کا سفر اور ہے ، راہ گزر اور ہے
تیرگی دل گُجا ، اور کُجا آفتاب

سات سمندر مرے سر میں ٹھہرتے رہے
سات فلک تھے مگر کوئی نہ تھا آفتاب

آنکھ میں ہے ابر سا ابر ، ہے میں ہے آنکھ سی
یعنی کُھلا آفتاب ، یعنی چھپا آفتاب

دھوپ کا چکّر بھی وہ ، راہ کا پتھر بھی وہ
سارے سفر میں مرے ساتھ رہا آفتاب

موجِ مُراد اُس سے ہے ، سارا فساد اُس سے ہے
دُکھ کی دوا آفتاب ، سُکھ کی سزا آفتاب

رات کے جنگل میں تھا اتنا اندھیرا ظفرؔ
پانو کا چھالا جو تھا ، مُجھ کو لگا آفتاب

☆

ویسی ہی شام ہے وہی نقشہ ہے بام کا
ہو گا کوئی تو عکس یہاں میرے کام کا

گلیوں کا نام پُوچھتا پھرتا ہُوں شہر میں
جیسے مَیں رہنے والا نہیں اس مقام کا

چھائی ہُوئی ہے رات گھٹا گھور ہر طرف
گھر جاؤں کس طرح کہ مَیں بُھولا ہُوں شام کا

میرے بدن کا حِصّہ نہ تھا کوئی میرے ساتھ
یا کھو گیا تھا حرف کوئی میرے نام کا

سُورج کے ساتھ سو رہُوں کپڑے اُتار کر
مطلب یہی ہے دُھوپ کے پیلے پیام کا

ہے پُر بہار کانچ کی پیالی پہ آج تک
جو نقش رہ گیا تھا لبِ لالہ فام کا

آگے بھی وہ تھا ، پیچھے بھی وہ ، درمیاں تھا مَیں
میرا اور اُس کا فرق رہا ایک گام کا

ٹوٹا پڑا ہے آئنہ سا جابجا ظفرؔ
پھاٹک کے پاس جس جگہ پودا ہے بام کا

☆

سورج دریا میں بہہ رہا تھا
میں دُور سے چھپ کے دیکھتا تھا

پیڑوں پہ ہُوئی تھی برف باری
پتھر کا پہاڑ بچ رہا تھا

بادل کی سیاہ سرزمیں پہ
تنکی کا درخت سا اُگا تھا

مچھلی باہر گئی ہُوئی تھی
پانی کا مکان بے صدا تھا

افراتفری مچی ہُوئی تھی
خُوش بُو کا چراغ بُجھ گیا تھا

دھڑکی تھی رات کی خموشی
تانگا دروازے پہ رُکا تھا

اندھی تھیں انتظار آنکھیں
ساون میں ہر طرف ہرا تھا

سر میں تلوار سی چلی تھی
سینے پہ پھول سا کھلا تھا

دیدار کا نامہ بر کبوتر
آنکھوں کے گھر مرا پڑا تھا

-☆-

اُڑی چاند چلمن چمک چار سُو
تماشا لگا دُور تک چار سُو

وہی رات دن آمنے سامنے
وہی جنگلوں کی مہک چار سُو

وہی خامشی درمیاں درمیاں
وہی پایلوں کی چھنک چار سُو

وہ آیا نہ گزرا یہاں سے، مگر
دلوں میں ہے کیسی دھمک چار سُو

ہلاتی رہے گی ہوا ہر گھڑی
پھڑاتا رہے گا فلک چار سُو

سُنو گے اب اُس کی صدا ہر طرف
نہ دیکھو گے اُس کی جھلک چار سُو

فضاؤں میں ٹوٹا ہے وہ آئنہ
رہے گی ہمیشہ کھنک چار سُو

دہک جایئے دل کے اندر ظفرؔ
کہ ہے بجلیوں کی لپک چار سُو

-☆-

دھوکا ہُوا تھا آبِ رواں پر سراب کا
رختِ سفر ہے اک وہی لمحہ عذاب کا

آنکھوں میں خاک ڈھلتی گزری تھی جو کبھی
دیوانہ ہے یہ شہر اُسی آب و تاب کا

اُبھری نہیں ہے لاش کبھی ڈوب کر یہاں
بدلا نہیں ہے رُخ کبھی دریائے خواب کا

گزرا تھا زرد زرد خلاؤں سے ایک بار
اک تیر سنسناتا ہُوا عکسِ ناب کا

دل سے سیاہ صفحوں کی تحریر مٹ گئی
آنکھوں میں بُجھ گیا کوئی منظر کتاب کا

چلتی ہُوئی ہوا پہ ہوا تشنگی کی لہر
لکھے گی مُرغ شاخ پہ نشہ شراب کا

پتھر ہے وہ کہ راہ سے ہٹتا نہیں کہیں
کہنے کو ایک پھول ہے کالے گلاب کا

صحرائے مرگ سے مجھے دے کے صدا ظفر
مُدّت سے منتظر ہے وہ میرے جواب کا

☆

شعلے شفق شرار وہ دیوارِ سنگ پر
میں دنگ رہ گیا تھا لہو کی ترنگ پر

دل پر خوشی کا بوجھ پڑا اس طرح کہ ہو
بادل گھِرا ہُوا کوئی صحرائے تنگ پر

جیسے چڑھا ہُوا ہو صدا پر غلاف سا
تہ سی جمی ہُوئی ہو کوئی جیسے رنگ پر

پانی پہ تیرتا پھرا پتے کی طرح میں
بارش ہُوئی وہ رات کو دل کی اُمنگ پر

سونے کے سات کیل گڑے تھے نگاہ میں
ریشم کا ایک ڈھیر پڑا تھا پلنگ پر

سر میں کھلا ہی تھا کوئی غمگین در ظفر
ہلکی ہوا کے پھول کھلے انگ انگ پر

☆

دھندلا گیا نشانِ سفر بھی نگاہ میں
خود سے جدا ہوا ہوں کچھ اس طرح راہ میں

ناگاہ میرے سر پہ وہ دیوار گر پڑی
بیٹھا تھا ایک عمر سے جس کی پناہ میں

نیچے زمیں ہے نہ مرے سر پہ آسماں
مجھ کو ڈرائے رکھتے ہیں ایسے ہی واہمے

تاریک جسم توڑ کے نکلا تو رات بھر
میں ڈوبتا اُبھرتا پھرا موجِ ماہ میں

اک ڈھول سی بجی ہوئی آنکھوں کے آس پاس
اک رنگ سا اُڑا ہوا دل کے نواح میں

اک حرف سا کھدا ہوا رُوئے زمیں پہ
اک شکل سی بنی ہوئی ابرِ سیاہ میں

سوئی ہوئی قضا ہے سمٹ تیغ تُو بہ تُو
روئی ہوئی ہوا بھی ہے عکسِ گناہ میں

میں ہوں یہاں نہ وہ ہے مرے پاس اس گھڑی
بھیگی ہوئی صدا ہے فقط خواب گاہ میں

ہونے لگا اثر بھی اُسی روز سے ظفر
جس روز سے ہوس کی ملاوٹ ہے آہ میں

☆

بجلی گری ہے کل کسی اُجڑے مکان پر
رونے لگوں کہ ہنس پڑوں اس داستان پر

وہ قہر تھا کہ رات کا پتھر پگھل پڑا
کیا آتشیں گلاب کھلا آسمان پر

اک نقش سا نکھرتا رہے گا نگاہ میں
اک حرف سا لرزتا رہے گا زبان پر

اپنے لیے ہی آنکھ کا پردہ ہوں رات دن
میں ورنہ آشکار ہوں سارے جہان پر

شیر آ کے چیر پھاڑ گیا مجھ کو خواب میں
دم بھر کو میری آنکھ لگی تھی مچان پر

پیاسی ہے رُوح، جسم شرابور ہے تو کیا
بیکار مینہ برستا رہا سائبان پر

چلی ہوا میں خون کا ذرہ اُڑا ہی تھا
پاگل ہوا یہ شہر ذرا سے نشان پر

خالی پڑی ہیں بید کی بیمار کرسیاں
خوں خواب دھوپ دھند برستی ہے لان پر

کس تازہ معرکے پہ گیا آج پھر ظفر
تلوار طاق میں ہے نہ گھوڑا ہے تھان پر

☆

بکھری ہوئی فلک پہ فلک شام ہے کوئی
آنکھوں میں شعلہ ہوسِ خام ہے کوئی

ملتے ہیں زاویے تو لرزتا ہوں میں بھی ساتھ
آبِ رواں پہ عکسِ در و بام ہے کوئی

اتنے ہجوم میں کسے ڈستا ہے دیکھیے
سبزے پہ سرسراتا ہوا نام ہے کوئی

تلوار ایسے اُس کے بدن میں اُتار دی
جیسے کہ آدمی نہیں وہ نیام ہے کوئی

اس طرح خوابِ خاک میں اُلجھا ہوں اے ظفر
گویا زمیں کا ذرہ نہیں دام ہے کوئی

-☆-

آنکھوں میں رُکا حسن کا ہنگام سفر میں
منزل سے بہت دور ہوئی شام سفر میں

آگے ہے وہی وہم کا تاریک تماشا
دیتی تھیں ہوائیں یہی پیغام سفر میں

اُس ریت کا ہر ذرہ اُڑا لے گئی آندھی
آتا تھا نظر دشت کا انجام سفر میں

بیٹھا ہوں وہیں پر کہ چلا تھا میں جہاں سے
صد پارہ ہوا ہوں اسی بے نام سفر میں

سامانِ سفر بھی ہے مُسافر ہی نہیں وہ
ساتھ اُس کے بھلا کیا ہے مرا کام سفر میں

-☆-

پھوٹا اداس جسم سے موسم بہار کا
موجِ ہوا پہ پھول کھلا انتظار کا

ایسے ہے جیسے آنکھ کی پتلی کے وسط میں
نقشہ بنا ہوا ہو کسی خواب زار کا

ابرِ خزاں ہے چھاؤ چھتر میرے آر پار
نشہ مرے وجود میں ہے نوکِ خار کا

آنکھیں اٹی ہوئی کسی ساحل کی ریت سے
منظر کھلا ہوا کسی دریا کے پار کا

عادلؔ کو بھی بلائیں مرمت کے واسطے
پتھر اکھڑ گیا ہے غزل کے مزار کا

☆

در ہے کوئی وجود کے اندر کھلا ہوا
یہ راز وہ ہے جو نہیں مجھ پر کھلا ہوا

اوپر گھری ہوئی کسی چپ کی گھٹائیں سی
نیچے کسی صدا کا سمندر کھلا ہوا

آ تو بھی دیکھ، تاب تماشا تجھے بھی تھی
بندر بندھا ہوا ہے، مچھندر کھلا ہوا

تیغِ طلب ہے خاک کے اندر کھنچی ہوئی
خونِ خدا ہے زخم سے باہر کھلا ہوا

تھک کر گری سرابِ سفر آرزو ظفرؔ
ہر سُرخ ریگِ موج تھی بستر کھلا ہوا

☆

رات کا زہر بجھاتے رہے بینائی میں
چھپ کے بیٹھی رہی تصویر تماشائی میں

برف کا شہر ہُوا چشم زدن میں برباد
دھوپ کی لہر تھی اُبھی ہُوئی انگڑائی میں

لوگ ہی آن کے یکجا مُجھے کرتے ہیں کہ مَیں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہُوں تنہائی میں

سطح کا نقش کِسی کو نظر آتا کیسے
دیکھا دیکھی سب اُترتے گئے گہرائی میں

آسماں پھیلے ہوئے دام کی صُورت ہے ظفر
عکس اُترتے ہیں پگھلتی ہُوئی پہنائی میں

☆

سکوتِ زرد میں اک سُرخ سی صدا ہو کر
مُجھے دکھائی دیا زہر کیا سے کیا ہو کر

رواں رہا میرے سینے پہ رات کا دریا
گھرا تھا سر پہ سیہ آسماں گھنا ہو کر

سفید سانپ کہ لیٹا ہُوا تھا جنگل میں
چمک گیا مری آنکھوں میں راستا ہو کر

سفر سزا تھی چمک موسموں کی مجبوری
سیاہ گھاس پہ چلنا برہنہ پا ہو کر

ہوس حصار ہوا کر گئی مُجھے یک سُو
مَیں مجتمع ہُوں ظفر ٹوٹتا ہُوا ہو کر

☆

بھر جاتا ہے تاریک دُھواں تنگ مکاں میں
شِدّت نہیں اگلی سی وہ اب شعلۂ جاں میں

پھر جا کے گروں گا میں نشانے سے بہت دُور
اُس نے مُجھے پھر کھینچ کے رکھا ہے کماں میں

پھرتا ہے لہُو لفظ مری نوکِ زباں پہ
آتی ہے بدن بات مرے وہم و گُماں میں

گلیوں میں بھٹکنا مری تقدیر ہے ورنہ
اس شہر کا نقشہ ہے اسی دل کے نشاں میں

دیکھا تھا ظفرؔ جس کو ابھی نہر کے پُل پہ
روشن ہے وہی شمع کتابوں کی دُکاں میں

☆

بے کار دل دھڑکتا ہے دُنیا کوئی نہیں
آنکھیں ترس گئی ہیں ، تماشا کوئی نہیں

کون آ کے توڑ پھوڑ گیا ہے ہر ایک شے
مَیں نے تو اپنی آنکھ سے دیکھا کوئی نہیں

سُوکھا ہے اپنا خون سمندر بھی دیر سے
اور ڈوبنے کو شہر میں دریا کوئی نہیں

سر پر کسی کے، ہاتھ کسی کا نہیں یہاں
بندہ کوئی نہیں ہے کہ مولا کوئی نہیں

سُورج ڈھلا ہے گرد اُڑاتا ہُوا ظفرؔ
سارے فلک پہ ابر کا ٹکڑا کوئی نہیں

☆

پھر آئی ہوا ڈوبی ہوئی رات کے رس میں
بکھرے گا نظر نقش بھی تصویرِ ہوس میں

ہٹ سا کوئی سایے کا دھواں دھار سڑک پر
پلٹا ہوا اک ہاتھ سا جاتی ہوئی بس میں

کس شے کی طلب لائی ہے دریا کے کنارے
اسرار ہے کیا چڑھتی ہوئی موج کے مس میں

دھندلی ہے مرے چہرے کی تحریر ابھی سے
مِٹ جاؤں گا کچھ اور بھی دو چار برس میں

تا صبح دمکتی رہی سونا سی مری لاش
کس زہر کی زردی تھی ظفرؔ نیشِ نفس میں

☆

آنکھ بھی وا ہوئی سورج بھی سفر سے آیا
ذرّہ زرد نہ صحرائے ہنر سے آیا

کون تھا جس کا یہاں جی نہ لگا جنگل میں
کون تھا جو کسی گنجان شہر سے آیا

کبھی احوال کے اندازے لگاتے رہے خود
پوچھ لیتا کوئی اس سے بھی جو گھر سے آیا

ختم ہوتا کہیں ساحل پہ ہی پانی کا سفر
لوٹ جائے گا اُدھر کو ہی جدھر سے آیا

جاگ کر بھاگ پڑے تھے یونہی بے سمت ظفرؔ
اب کھڑے سوچیے آوازہ کدھر سے آیا

☆

خبر نہیں سفرِ خاک میں کہاں ہوں میں
کہیں اندھیرے اُجالے کے درمیاں ہوں میں

پڑا ہوں کب سے گزرگاہِ باد و باراں پر
مِٹا ہُوا سا کسی نقش کا نشاں ہوں میں

لگی تھی آگ بہت دور میرے منظر سے
سو بُجھ چکی مگر اب تک دھواں ہوں میں

نہ گرد ہے نہ گلستاں نہ خواب ہیں نہ خُدا
کوئی نہیں ہے ، اسی وہم کا گُماں ہوں میں

ہوں اپنے آپ سے ٹکرا کے پارہ پارہ ظفر
بکھر گیا ہوں فضا میں ، جہاں تہاں ہوں میں

☆

اور بھی ڈر تھا کوئی خوفِ خداؤں بغیر
پیاس بدن کی بجھی آبِ فناؤں بغیر

گوہرِ اختر ملا بحرِ فلک سے مجھے
دستِ دعاؤں بغیر نقشِ نواؤں بغیر

سر میں اُڑی جابجا گرم گناہوں کی گرد
پھول کھلا زخم کا سنگِ سزاؤں بغیر

مجھ سے اُلجھنے لگا منظرِ خوں اس طرح
خواب سے جاگا ہوں میں صبحِ صداؤں بغیر

شور مچاتی ہوئی آندھیاں اندر ظفر
لرزشِ برگِ خزاں ہر کھ ہواؤں بغیر

☆

میں لڑکھڑاتا پھرا باغ کے برابر میں
کھلی ہوئی تھی کوئی شے ہوا کے ساغر میں

وہی پہاڑ وہی ندیاں وہی دریا
بھرا تھا رنگ زمیں آسماں کے منظر میں

مرے بدن سے گزر کر پہنچ سکی ہے وہاں
یہ تھرتھری کہ چمکتی ہے چشمِ اختر میں

پکار ٹوٹتے ہتھیار موت کی یلغار
لگی ہوئی ہو کوئی لام جس طرح سر میں

چمک چمک کے بُجھا چاند کا چراغ ظفرؔ
اُٹھی نہ لہر کوئی ساتویں سمندر میں

☆☆

ٹوٹتے پتّوں کا موسم ہر طرف چھایا ہُوا
چاند مُرجھایا ہُوا سا ، پھول گہنایا ہُوا

کون سے عکسِ عجب کا منتظر ہوں صبح سے
راہ پر بیٹھا ہوں آئینہ ہے چمکایا ہُوا

آگ جنگل میں لگی ہے سات دریاؤں کے پار
اور کوئی شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہُوا

ہیں زباں پر زرد زہریلی ہوا کے ذائقے
دشت میں رکھا مجھے ذرّے کو ترسایا ہُوا

آسماں پر تو ازل سے خاک اُڑتی ہے ظفرؔ
کون سا بادل ہے یہ آنکھوں میں لہرایا ہُوا

☆☆

عکسِ ادا ہی اور ہے نقشِ نوا ہی اور ہے
میری نگاہ کا ہے فرق یا وہ بلا ہی اور ہے

سبز و سیاہ خاک پر سایہ جلا جلا ہے کیوں
پوچھئے کس سے جائیے سر پہ گھٹا ہی اور ہے

خواب ہو یا سراب ہو میرے لیے نیا نہیں
اے نمِ چشمِ شیشہ رنگ یہ تو فضا ہی اور ہے

مر بھی گئے تو کیا ہُوا مر کے جیے تو پھر بھی کیا
سر سے گزر گئی ہے جو موجِ فنا ہی اور ہے

مُفت ہُوا بپا ظفر اتنا فساد شہر میں
میں نے کہا کچھ اور تھا سب نے سُنا ہی اور ہے

-☆-

یہ اُڑتے ہُوئے رنگ ہیں یا سنگ ہوا میں
کس بات پہ ذرّوں کی ہُوئی جنگ ہوا میں

تختی سا چمک جاتا ہے آنکھوں کے اُفق پر
سوئے ہُوئے دریا کا ہرا رنگ ہوا میں

شاخوں سے بہُت دُور شگوفوں کے بہُت پاس
یہ ٹوٹتا بنتا ہُوا آہنگ ہوا میں

بکھرا ہے کسی عکس کا ارژنگ زمیں پر
بکھرا ہے کسی نقش کا نیرنگ ہوا میں

دھندلا گئی تصویرِ فلک برگِ خزاں پر
آئینۂ شبنم کو لگا زنگ ہوا میں

اس دوزخِ دل میں تو اُتر جائے گا پھر بھی
کچھ سیکھ سُلگنے کا ابھی ڈھنگ ہوا میں

-☆-

گزر گیا ہے نظر سے کوئی سراب ایسا
کہ دشت دور میں ڈھندلکا ہے خواب آب ایسا

خمارِ مرگ سے ہے اب یہ کیفیت کہ کبھی
پیا ہے زہر تو نشہ چڑھا شراب ایسا

خزاں کی شام تھی یا عکس تو بہار کوئی
کہ ابر شاخ ہوا پر کھلا گلاب ایسا

چھپی ہوئی سی چٹانیں لکھے ہوئے سے درخت
کھلا تھا سامنے منظر کوئی کتاب ایسا

بکھیر دی ہیں ظفرؔ کرچیاں تمازت کی
فضا میں توڑ کے آئینہ آفتاب ایسا

☆

دیکھوں وہی تماشا رت کی روانیوں میں
کالا کنول کھلا ہو رت رقص پانیوں میں

چھائی گھٹا فلک پر برسی سیہ سڑک پر
گم تھا پہاڑ اپنی آتش فشانیوں میں

پتا سا اڑ گیا جو بادِ فنا کی رو پر
پہلا ہے نام اُس کا اِس گھر کے بانیوں میں

سونے سیہ کھنڈر میں محصور ہو گیا وہ
مشہور تھا کبھی جو سب لامکانیوں میں

سو بھی ظفرؔ ہوا ہوں مٹی کے ساتھ مٹی
باقی تھا ایک میں ہی اُس کی نشانیوں میں

☆

خالی خلا ہے اور ہوا میں رکھا ہے کیا
تُو خود کہیں نہیں ہے کسے ڈھونڈتا ہے کیا

کچھ مرگ منزلوں پہ پڑے پر شکستہ خواب
اس سے زیادہ اور سفر کی سزا ہے کیا

دروازے میں بجھی ہوئی دیوار سی ہے کیوں
چھت پر چمک دمکتا ہوا فرش سا ہے کیا

کس کو خبر کہ پانو کے نیچے زمیں ہے کون
کس کو پتا کہ سر پہ گرجتی گھٹا ہے کیا

کیا ہوں ظفر اندھیرے اُجالے کی جنگ میں
دن سا مرے وجود میں یہ ڈوبتا ہے کیا

☆

نمِ نگاہ تھی کیا شے سمِ سراب ہے کیا
وہ زرق برق تھی کیسی یہ آب وتاب ہے کیا

میں اس کو دیکھ رہا تھا کہ اس سے پوچھتا تھا
کھلی کتاب ہے کس کی بڑا گلاب ہے کیا

فضا میں اڑتا ہوا رنگ رہگزار ہے کیوں
ہوا میں کھلتا ہوا عکسِ آفتاب ہے کیا

ہوئے ہیں گم وہ مناظر کہیں بدن میں ہی
جو یوں نہیں ہے تو سر میں خمارِ خواب ہے کیا

یہ ابر ہے نہ ہی آندھی ہے میرے سر پہ ظفر
مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ عذاب ہے کیا

☆

سفر میں ساتھ سُلگتا رہا نشاں اُس کا
جو وہم ہے تو بس اپنا ہے یا گماں اُس کا

جو آگ خاک سیہ کر گئی بیاباں کو
یہ ابر ہے کہ اُمڈتا ہُوا دھواں اُس کا

ہوا کے ساتھ نہ اُڑ جائے جسم کی چادر
سنبھالیے کہ بنا لیں گے بادباں اُس کا

زمیں کا ذائقہ لکھا ہے اپنی قسمت میں
چلے چلو کہ نہیں بحر بے کراں اُس کا

ظفر پُران پتھر سا وہ نقش آنکھوں سے
لُڑھک گیا سو پتا پُوچھیے کہاں اُس کا

☆

صدا کے سانپ کو سب سامنے عصا کر کے
دکھا بھی سکتا ہوں دریا میں راستا کر کے

بدن میں خون کا اک ذرہ بھی نہیں باقی
نچڑ گیا ہوں سمندر کا سامنا کر کے

کندن کنار ہے صحرا تو ہو مجھے کیا کام
میں اپنی خاک کو روتا ہوں کیمیا کر کے

ہے ریشہ ریشہ مرا سبز تیرگی کا ثمر
کبھی تو دیکھ مجھے شاخ سے جدا کر کے

وہاں سے آگے کوئی سمت ہے نہ بھید ظفر
جہاں سے گر کے اُٹھا ہوں خدا خدا کر کے

☆

مرنے پہ ہو چلے سبھی تیار کس لیے
کھولا ہے کس نے موت کا اسرار کس لیے

اندر کا تیز و تند اندھیرا ہی تھا بہت
سر پر تنی کھڑی ہے شبِ تار کس لیے

دولت بھی خود تھے چور بھی خود، رات بھی وہ خود
کرتا ہے کون کس کو خبردار کس لیے

آنکھیں تو تھیں سزا کے سفر پر گئی ہوئی
بکھرے پڑے تھے حُسن کے آثار کس لیے

کس کے لیے ہری ہوئی ہر شاخ جسم کی
بے موسما کھلا ہے یہ گلزار کس لیے

بے عکس بارودا کے دھندلکوں میں اے ظفر
اُڑتے ہیں آفتاب کے انوار کس لیے

-☆-

رنگوں کا تمنائی نہ سودائی ہوں رس کا
نشہ ہے مرے خوں میں ابھی موت کے مس کا

بیٹھا ہوں کسی اور صدا کے لیے ورنہ
گزرا ہے مرے سر سے بھی آوازہ جرس کا

ہے روح کا شب شور تلاطم تو بڑی چیز
یہ جسم کا جوہڑ ہی نہیں ہے مرے بس کا

بہتا ہوا پتا تھا کوئی موج رواں پر
چڑھتا ہوا سر میں کوئی دریا تھا ہوس کا

نکلا ہوں نیا ہو کے سمندر کے سفر پر
پیشانی سے ہر داغ دُھلا پچھلے برس کا

اس طرح ظفر سب کو ہوا قید کرے گی
دے گا نہ دکھائی کہیں دروازہ قفس کا

-☆-

آثارِ آب ، سیلِ صدا ، رنجِ رائگاں
کیا کیا ہوا کی رو پہ لرزتا ہے بادباں

پانی پہ کانپتا ہے کوئی پارہ پارہ عکس
پتھر کو چاٹتا ہے کوئی نقش بے نشاں

جیسے گھٹا سیاہ بکھرتا ہو عرش پر
گرتی رہیں زمیں پہ اندھیرے کی پتیاں

کس دشتِ بے کنار سے گزرا ہوں اے خدا
سارے بدن میں ریت کی لہریں سی ہیں رواں

اب میں نہیں تو میرے ہوا سب سفر میں ہیں
سنتا ہوں ابر سے دل دریا کی داستاں

موجِ ہوس اُبھر کے وہیں رہ گئی ظفر
دیوار دوستی تھی مرے اُس کے درمیاں

☆

میں یوں تو ہنس دیا تھا سفر کے سوال پر
دل کانپتا تھا خوف کے خالی خیال پر

کیسی کسی ہوئی تھی کماں آب و رنگ کی
کیا عکس پڑ رہا تھا چمک دار ڈھال پر

تکمے کھلے ہوئے کسی کالی قمیص کے
بوٹے بنے ہوئے کسی شب شرم شال پر

بجھتی ہوئی شفق تھی وہی سبز آنکھ میں
جلتا ہوا دیا تھا وہی زرد گال پر

گویا ابھی وہ خاک کی خوشبو میں مست ہے
گویا پڑی نہیں ہے نظر اس کی جال پر

خود بھی وہ خوب چوکس و چالاک ہے ظفر
مدت سے آپ کی ہے نظر جس کے مال پر

☆

صدائے سنگ بھی تھی رنگِ رہ گزار بھی تھا
خلیجِ خوں میں کسی خواب کا خمار بھی تھا

چمک اٹھی تھیں فضائیں ہوا کے خنجر سے
جو میں نے دیکھا تو جنگل کے آر پار بھی تھا

پٹی پڑی تھی زمیں زرد بھولی رُت سے
کہ راستے میں تمنا کا مرگ زار بھی تھا

بندھا وہ زورِ زمستاں کہ جم گئی ہر شے
وگرنہ برف کے بُت میں کہیں شرار بھی تھا

گرے ہیں ٹوٹ کے اپنی کمان کے سب تیر
کہ اُس کے چاروں طرف حُسن کا حصار بھی تھا

نظر میں تھا کوئی نیرنگ بھی ظفر اُس دن
وہ مَسِ آب حقیقت میں بے کنار بھی تھا

☆

جنوں بھی سر میں ہے اُس بحر سے گزرنے کا
یہی نہیں کہ ارادہ ہو ڈوب مرنے کا

نکل پڑا تو میں چلتا گیا یونہی بے سمت
نہ تھا جواز کوئی راہ میں ٹھہرنے کا

مہک اٹھی کوئی تصویر سبز پتوں کی
چمک گیا کہیں پانی ہوا کے بھرنے کا

کھلا ہوا کسی منزل مہار صحرا میں
میں منتظر ہوں صدا کی طرح بکھرنے کا

ہے اُس کے لمس کا آنکھوں میں ذائقہ تو ظفر
چکھو مزہ بھی کبھی اُس سے بات کرنے کا

☆

کچھ اتنی دُور سے دی وہم نے صدا مجھ کو
کہ مُڑ کے ایک نظر دیکھنا پڑا مجھ کو

وہ روشنی ہے سفر میں کہ سُوجھتا نہیں کچھ
سیاہی دل کی دکھاتی ہے راستا مجھ کو

برس گیا ہوں سمندر کی لہر پہ ورنہ
کہاں کہاں لیے پھرتی رہی گھٹا مجھ کو

نہ شاخ ہوں نہ شجر جانے کس لیے شب بھر
خزاں کے خواب دکھاتی رہی ہوا مجھ کو

ظفرؔ لہو میں ہیں لفظوں کے جوڑ توڑ عجب
چھپے ہوئے نے ہے ظاہر کیا ہوا مجھ کو

-☆-

موت مداح مری موت پہ مائل میں بھی
کیا بکھرا ہوں سفرِ سنگ سے غافل میں بھی

کچھ ٹھہرتا نہیں یلغار ہوا کے آگے
تھا خزاں کے خس و خاشاک میں شامل میں بھی

کوئی بھی سبز سمندر کی صدا پر نہ اُٹھا
دیکھتا تھا یہ تماشا سرِ ساحل میں بھی

آئنہ عکسِ رُخِ رنگ سے خالی ہے کہ ہوں
سات پردوں کے سوا آٹھواں حائل میں بھی

سامنا کرتے ہی اُس تازہ حقیقت کا ظفرؔ
ایسے لگتا ہے کہ ہو جاؤں گا باطل میں بھی

-☆-

عکس اُڑتے ہیں عجب آتشِ آواز کے ساتھ
نقش بکھریں گے نظر کے پَرِ پرواز کے ساتھ

وحشت کی آنکھ میں یہ پیاس چمکتی ہی رہی
کہ اُڑے سبز کبوتر بھی کبھی باز کے ساتھ

جو دکھائی بھی نہ دے اور سُنائی بھی نہ دے
ہے کڑی وہ بھی مرے سلسلہ ساز کے ساتھ

رہ گئی دل میں کسی صبحِ گریباں کی جھلک
روشنی چلتی ہے رُک رُک کے بڑے راز کے ساتھ

موسموں سے بہُت آگے نکل آیا ہُوں ظفر
کھِل کے مُرجھاؤں گا میں اب نئے انداز کے ساتھ

☆

زردی ٹھنڈی ہُوئی تھی جہاں نقشِ ناب میں
منظر عجیب تھا وہی تصویرِ خواب میں

کیا دھوپ تھی کہ آنکھ ٹھہرتی نہ تھی کہیں
تھا کِس کا عکس آئینۂ آفتاب میں

ایسے ہے جیسے مَیں ہی نہیں شوق کا شکار
ہے مُبتلا فلک بھی زمیں کے عذاب میں

مَیں چُوم چُوم کر اُسے پاگل ہُوا تھا کیوں
موتی سا کیا وہ لفظ جڑا تھا کتاب میں

ہیں چھتنے دائرے نئی ٹی شرٹ پر ظفر
سُوراخ اُسی قدر ہیں پُرانی جُراب میں

☆

لہو کی سر سبز تیرگی ہے کہ رنگ اُڑتے لباس کا ہے
سمجھ میں آئے کہاں کہ منظر حواس کے آس پاس کا ہے

مزے کی مٹھی میں قیدی سی ہے یہ خوشہ چیں نرم گرم لڑکی
سڑک کے دونوں طرف کٹی ہوئی فصل میں دُودھ پیاس کا ہے

گلِ گنہ کی دبیز خوش بُو میں چُور ہیں بام و در ہوا کے
جو ہے تو اِک گوشہ سے میں خُمار خالی گلاس کا ہے

عجیب تھا اُس ہرے بھرے کھیت سے گزرنے کا تجربہ بھی
مگر یہ ہر عضو کی زُباں پر جو ذائقہ زرد گھاس کا ہے

کہیں پہ رُک کر اندھیری آنکھیں اُتار کر جیب میں اُڑس لو
کہ اس گھنے وہم کے عقب میں سفید جنگل کپاس کا ہے

کہاں گیا ظفرؔ اُس کے تازہ تر جسم کے جال سے نکل کر
سفید بیڈ شیٹ پر پڑا یہ بوسہ اُسی بدحواس کا ہے

-☆-

جیسا خُمار خواب نے چاہا بھی آئے گا
اب زودِ رنج ہُوا ہے تو اچھا بھی آئے گا

محراب و در گزر گئے اندھی ہواؤں کے
بیٹھے رہو کہ طاق تماشا بھی آئے گا

ظاہر بھرا کیے تو یہاں فکر ہے کیسے
کھو جایئے تو ڈھونڈنے والا بھی آئے گا

جو سب کیے کرائے پہ پانی ہی پھیر دے
اے چشمِ منتظر! کوئی ایسا بھی آئے گا

مانا یہ ریت زہر نہیں خاک ہے مگر
بے دل نہ ہو کہ راہ میں دریا بھی آئے گا

ہنگامہ گرم ہے تو مزہ یہ بھی لے ظفرؔ
تُو دیکھ تو سہی کبھی تنہا بھی آئے گا

-☆-

کیا کیا گلاب کھلتے ہیں اندر کی دھوپ میں
آ دیکھ مل کے مجھ کو دسمبر کی دھوپ میں

بکھرے گا راز رنگ کھلے آسمان پر
بکھرے گا ناز نقش برابر کی دھوپ میں

کالے کشور عکس ہوس ہڑھ ہواؤں کے
آئے تنہا کے عرصۂ محشر کی دھوپ میں

اوجھل رہے وہ رویہ مناظر نگاہ سے
رفتار تیز تر تھی سکوٹر کی دھوپ میں

پتا سا وہ بھی کانپ گیا وصل وہم سے
جلنے لگا تھا میں بھی کسی ڈر کی دھوپ میں

کیا کیا سراب دیکھتا ہوں دور سے ظفر
میں باردا کے مہر منوّر کی دھوپ میں

☆

فضا میں اُڑتے شرار دیکھو دھویں کی تاریک دھار دیکھو
رواں دواں برف کے بیاباں میں آتشِ انتظار دیکھو

کہیں وہی دھند سی دھنکویں کہیں چمک چاندنی جھلکویں
ذرا نظر کا نکھار دیکھو ، ذرا خبر کا خمار دیکھو

انھیں کناروں انھیں حصاروں میں گوہرِ خاک بے نشاں ہے
سفر کا سورج ڈھلے تو پہلے بدن میں اُڑتا غبار دیکھو

رچی ہوئی سرد زرد شاخوں میں سنسناہٹ ہرے لہو کی
بچی ہوئی باغ باردا میں گلِ خزاں کی بہار دیکھو

کبھی ملے گا تو اُس کو پلو میں گے نرم ہاتھوں پہ، اور کہیں گے
کہ ہم تو فرزند ہیں تمھارے ذرا ہمیں آر پار دیکھو

ہوا کے اندھے کنویں میں گر کر ظفر بچے گے تو دیکھ لیں گے
ابھی تو یہ دور داں تماشا کھڑے سرِ رہگزار دیکھو

☆

پکڑا گیا میں ذوق تماشا کے زور میں
ہوتا ہے یُوں بھی فرق ظفرؔ چور چور میں

آیا تھا گھر سے ایک جھلک دیکھنے تری
میں کھو کے رہ گیا ترے بچّوں کے شور میں

زنجیر سی بنی ہوئی بالوں کے اُس طرف
تصویر سی تنی ہوئی آنکھوں کی اور میں

اک راز تھا چمکتے ہوئے سُرخ رنگ کا
سنگین کارنس پہ دھرے سبز مور میں

گزروں گا اُس کے جسم کے جنگل سے کس طرح
آتش بھری ہوئی ہے مری پور پور میں

بکھرے ہوؤں کو موتیوں کی طرح اے ظفرؔ
کس نے پرو دیا ہے کسی ڈر کی ڈور میں

☆

جھونکا یہ تر و تازہ تبھی جان میں آیا
اتنا سا جو رخنہ مرے ایمان میں آیا

آگے تھی وہی ریت مرے زرد بدن کی
میں شہر سے نکلا تو بیابان میں آیا

آئینہ آواز میں چمکا کوئی منظر
تصویر سا اک شور مرے کان میں آیا

اندر سے نیا ہو کے نکلتا ہُوا جیسے
سایے سے جُدا ہو کے وہ دالان میں آیا

دیکھا تو بیا میں اُسے حیران سا ہو کر
جب جا ہی چکا تب مری پہچان میں آیا

بے کار ہی جلتا ہوں ظفرؔ ورنہ مُجھے کیا
خورشید اگر اُس کے گریبان میں آیا

☆

دوبدو آ کر لڑے گا جس گھڑی جائیں گے ہم
دُور کی ان دھمکیوں سے کِس طرح مانیں گے ہم

ریت پر پھیلائی ہے دل کے لہو کی سبز بُوند
کڑکڑاتی دھوپ میں چادر بھی تانیں گے ہم

خاک سی اُڑتی ہوئی انکار کے جھونکے میں تھی
اب نہا دھو کر ہی اپنی شکل پہچانیں گے ہم

دشمنی ہے شہر بھر سے، کُند ہے خنجر کی دھار
موت ہی وہ سنگ ہے جس پر اسے سانیں گے ہم

ہے نظر کے رُوبرو پیلے پہاڑوں کی چمک
اُس طرف ہو لیں تو اپنی خاک بھی چھانیں گے ہم

چور ہے سینے کے اندر، شور ہے باہر ظفرؔ
دیکھیے کب تک یہاں کِس کِس کو گردانیں گے ہم

☆

کِس لیے راہ میں رُکنے لگی رفتار مری
آنکھ پڑتی ہے یہ کِس عکس پہ ہر بار مری

وہ دفینہ ہوں کہ مستور ہوں سب سے اب تک
توڑتا ہی نہیں آ کر کوئی دیوار مری

اُس طرف زنگِ زمستاں کہ تری تاک میں ہے
اِس طرف بُجھتی ہوئی آتشِ اظہار مری

زہر بھی کل نہ ملے گا تُجھے مرنے کے لیے
قتل ہو لے کہ ابھی تیز ہے تلوار مری

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

ہر طرف ٹوٹی ہوئی برف کے ٹکڑے تھے ظفرؔ
یاد ہو گی اُسے کُہسار پہ یلغار مری

☆

خواہشِ خانماں تو ہے، کاہشِ کارواں تو ہے
طولِ سفر کی موج میں قطعِ سفر نہاں تو ہے

آنکھ میں نقش ہو نہ ہو اخترِ شام کی جھلک
برگِ ہوائے سرو سا سر میں مرے رواں تو ہے

جسم کے راستوں پہ ہے گردِ گناہ کی چمک
سنگِ سزا کی جستجو راحتِ رائگاں تو ہے

خوابِ خمارِ خاک سے جاگ پڑوں گا ایک دن
بحر یہ بے کراں تو ہے زہر یہ بے اماں تو ہے

اُس کے لیے نیا نہیں گرم دلوں کا بچپنا
اور وہ کچھ بھی ہو مگر مادرِ مہرباں تو ہے

دیکھ نہیں سکا اگر اُس کو سُنا ہی دے ظفرؔ
رُکتی ہوئی نظر کے ساتھ چلتی ہوئی زباں تو ہے

☆

صدائے سنگ سے تھا یا ہوا کے ہاتھ سے تھا
فسادِ سبز کسی تازہ واردات سے تھا

جھلک دکھا کے جو پھر کھو گیا لہو بہ لہو
ذرا ہوا تمیں اُسی عکسِ بے ثبات سے تھا

کہیں فضا میں فروزاں تھا خوابِ خون کا نقش
جو تھا بھی تو یہی ربط کائنات سے تھا

بکھر گیا تھا گُلِ خاک ہر طرف جیسے
یہ سانحہ بھی سفر کے تنازعات سے تھا

اُٹھا کے لے ہی گئے دن کی روشنی میں اُسے
مجھے یہ وہم جو سچ پوچھیے تو رات سے تھا

وہ اور کچھ بھی سہی عشق تو نہیں تھا ظفرؔ
جو سلسلہ سا مجھے اُس کی زرد ذات سے تھا

☆

اُڑتی ہوئی آواز کے ارماں کی طرح تھا
وہ نقش کہ ہٹ کر بھی نمایاں کی طرح تھا

سُورج میں نہایا ہُوا ذرّہ تھا ہر اک شخص
کہتے ہیں کبھی شہر بیاباں کی طرح تھا

چنگھاڑتی چلاتی ہُوئی سبز ہوا میں
اک راز اُترتے ہُوئے طوفاں کی طرح تھا

موسم کے مضافات پہ برسا ہے وہی ابر
جو سر میں مرے دُود پریشاں کی طرح تھا

تھیں چاروں طرف دُھوپ کی دُشوار فصیلیں
یُوں میرے لیے دشت بھی زنداں کی طرح تھا

آنکھوں کی چمک تھی کہ بکھرتے ہُوئے پتّے
کُچھ خواب خزاں مطلعِ مژگاں کی طرح تھا

عُریاں کے عقب زار کو جاتا ہُوا جنگل
مُشکل تو بہت تھا مگر آساں کی طرح تھا

آئینہ آشوب میں دُھندلایا ہُوا عکس
عنواں کی طرح تھا، کبھی امکاں کی طرح تھا

روشن تھا ظفرؔ وسط میں مہتاب مُلاقات
مَیں چاروں طرف ہالہ ہجراں کی طرح تھا

☆

چٹلی پڑی ہے دُھوپ نہ صحرا ہی زرد ہے
سُنسان کے سفر کا سراپا ہی زرد ہے

بدلے ہیں آب و خاک نے کیسے ہی پیرہن
یہ عکس آسماں ہے کہ ویسا ہی زرد ہے

بکھرا ہُوا ہے خوابِ خزاں دل کے آس پاس
خُود تو ہرا بھرا ہُوں تمنّا ہی زرد ہے

آنکھوں میں شور و شر ہے بدن کے بسنت کا
مَیں وہ ہُوں جس نے حُسن کو دیکھا ہی زرد ہے

اُٹھے اب اس نواح سے کس طرح موجِ سبز
بہتا ہُوا یہ خاک کا دریا ہی زرد ہے

چہروں کی دُھند بُجھنے لگی چار سُو ظفرؔ
رنگِ ہوائے شام کُچھ ایسا ہی زرد ہے

☆

عکس تھرتھراتا ہے آسمان پیالے میں
گرد سا چمکتا ہوں یوں ہوا کے ہالے میں

ساتھ ہیں مرے اب بھی گونجتی گھنی گلیاں
کیا مزہ ملا اُس کو شہر سے نکالے میں

کیوں اُلجھ پڑیں باہم رنگلی لکیریں سی
راز ہے فلک جیسا نقش کے نرالے میں

میں نکل سکوں کیسے، میں پہنچ سکوں کیوں کر
سبز کے اندھیرے سے زرد کے اُجالے میں

رہ گئے کہاں کیسے آفتاب آنکھوں کے
دُھند ہے لہو ایسی کُسن کے حوالے میں

اے ظفرؔ کبھی اُس کا سامنا تو کر، مورکھ!
جان کی حرارت بھی ہو گی جسم والے میں

-☆-

میدان تھے جہاں وہاں جنگلے جنگل ہوئے
بے جسم و جاں جڑیں کسی ڈر کے ڈھل ہوئے

جنگل میں جاگنے کی تشبیہ خواب کی
جھاڑاں گلاب تھی گئے کیکر صندل ہوئے

سائے سے اُٹھ کے جسم کی جنت سے جابجا
زنجیر زمہریر میں کالے کنڈل ہوئے

آنکھوں کے آنگنوں میں اُڑا چندر کا غبار
ذرّات زرد زرگری مکھ منڈل ہوئے

لوہے کی لاٹھ بن کے اڑے عمر بھر تو ہم
اب ٹوٹنے لگے تو سرہوں کی گندل ہوئے

پتوں کے پیرہن پہ نیّن عکس کی ظفرؔ
جھلکار یوں پڑی کہ جنگل میں منگل ہوئے

-☆-

صدا بھی سانس میں اُلجھے بدن بھی ڈر کے رہے
مگر وہ زندہ زہر اپنا کام کر کے رہے

لہو میں لوٹ کے لہرائی بھی نہیں تھی ابھی
فلک فضا میں تماشے بھی تیغ تر کے رہے

ہمارے سر میں بھی سکھ منزلوں کی خاک اُڑی
ہمارے پاؤں میں بھی سلسلے سفر کے رہے

یہ لازمی ہے کہ تجھ کو وہی خوش آئے گا
جو تیرے ساتھ تری سطح پر اُتر کے رہے

جو تھا تو صرف ہمارے لیے یہ جامہ جاں
اگر سمٹ کے رہے ہم اگر پسر کے رہے

ارے یہ دُھند بھرا راستا تو ہے اپنا
چلو نہ گھر کے رہے ہم نہ در بدر کے رہے

جو ایک آن میں سر سے گزر گئی تھی کبھی
بھنور نظر میں اسی موج معتبر کے رہے

وہ روکتے ہی رہے اور خواب خاکوں میں
ہم آندھیوں کے اندھیرے کا رنگ بھر کے رہے

ظفرؔ، مذاق ہے یہ روز کا کہ مجبوری
وہ آ کے جمع کرے اور تُو بکھر کے رہے

☆

مجھے قہر تھا میں برستا رہا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستا رہا

ہرے ہمہوں کی حدوں پر کہیں
ہوا کا ہیولیٰ امڈتا رہا

وہ اپنے میاں کی وفادار تھی
مگر دل اسی پر ہوستا رہا

پُرانا شہر میری یلغار سے
اُجڑتا رہا یعنی بستا رہا

معانی کے ملبے سے نکلا تو میں
گرامر کی دلدل میں دھنستا رہا

ظفرؔ رات کا راستا ختم ہے ختم
مجھے سانپ کی طرح ڈستا رہا

☆

نوا میں بکھرا ہُوا راز رہگزر ہی نہ ہو
ہوا میں بکھرا ہُوا سا وہ رنگ در ہی نہ ہو

مَیں مر رہا ہُوں وہ مہتاب سبز ہے سر پر
مَیں ڈر رہا ہُوں یہ مُہلت بھی مختصر ہی نہ ہو

ابھی مَیں ثابت و سالم ابھی بُریدہ بدن
کہیں لہُو میں چھپا خاک کا خنجر ہی نہ ہو

ہیں میرے چاروں طرف گھومتے گھُرتے مکاں
وہ جس میں ڈوب کے اُبھرا تھا یہ بھنور ہی نہ ہو

مزہ تو جب ہے کہ اُس چشم سبز کو اب تک
مرے خمار خزاں خواب کی خبر ہی نہ ہو

صدا بھی خاک میں گڑ جائے بے نشاں بے نقش
پڑے جو ضرب تو آہن پہ کچھ اثر ہی نہ ہو

نہ رویئے کہ جہاں سر پہ ہاتھ ہو اُس کا
نہ سویئے کہ جہاں خواب کا خطر ہی نہ ہو

نکل تو جایئے کالی ہوا کے زنداں سے
مگر سروں پہ کھُلا آسماں اگر ہی نہ ہو

زمیں کو سہم سفر سے نکالیے تو ظفر
مگر نہ یُوں کہ اسے آسماں کا ڈر ہی نہ ہو

☆

نوا کے زیر و زبر توجہ نوا ہی تو ہے
خلا کے جس بھی طرف دیکھیے خلا ہی تو ہے

لرز گئی ہے جو آنکھوں کے آئنوں میں کہیں
کٹے پھٹے ہُوئے اندر کی انتہا ہی تو ہے

کہ مَیں ظفر ہی تو ہُوں وہم ہو تو ہو اُس کو
مرے لبوں پہ لکھا تھا وہ ماجرا ہی تو ہے

مَیں اُس کو ہاتھ لگانے کی موت مر جاتا
مُجھے یہ تھا کہ ابھی ساتھ چل رہا ہی تو ہے

ہوا کا ٹوٹا ہُوا عکس کانپتا ہے ابھی
جہاں سے برگ تماشا گزر گیا ہی تو ہے

صدا کے موڑ سے آگے ہے خشت وخوں کی چمک
مَیں چُپ رہُوں کہ پلٹ جاؤں راستا ہی تو ہے

سم سیاہ سے ہے جسم آج بھی سرسبز
غم نگاہ نے اس کو بچا دیا ہی تو ہے

ملے گی خاک تو آنکھوں میں ڈالنے کے لیے
اُتر نہ جائیں یہیں ، ساحل سزا ہی تو ہے

ابھی سے برف کی بُنیاد ہل رہی ہے ظفر
سفید گھاس کے گھر سے دھواں اُٹھا ہی تو ہے

☆

دھندلا گئی ہوا پسِ دیوار اُس طرف
بکھرا ہو جیسے برف کا بے کار اُس طرف

دریا نے زرد سانس لیا جس نواح میں
برسی ہوئی گھٹا ہے دھنک دھار اُس طرف

ٹوٹا ہے دوپہر کا کنارہ پھر ایک بار
پھر جمع ہیں خبر کے خریدار اُس طرف

موجِ بلا اڑی ہوئی دریا کے درمیاں
فوجِ فنا کھڑی ہوئی تیار اُس طرف

سویا ہوں میں تو نم ہوئی انوارِ فصلِ خاک
کھویا ہوں میں تو کھل گئے بازار اُس طرف

بتی جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیان میرے پیچھے ہے شلوار اُس طرف

جس سمت گردِ بادِ گنہ کا ہے شور و شر
جاتا ہے سب کو عاقبتِ کار اُس طرف

دھندلے بدن میں شام ہوئی تھی جہاں ظفر
اُڑتے ہیں آفتاب کے آثار اُس طرف

☆

بے عکس ہے درخت وہی شام ہر طرف
ٹوٹا ہوا پڑا تھا مرا نام ہر طرف

لٹکے ہوئے ہوا میں شفق دھند آئنے
بھٹکے ہوئے صدا میں سیہ بام ہر طرف

آبِ صفا کی تہ میں پتھر پیش گھنگی
سطحِ سیہ پہ نقشِ نوی عام ہر طرف

آنکھوں میں سانولا ہے زمیں زنگ زرق برق
سر میں ہے سبز موج فلک فام ہر طرف

ہنستا رہا وہ دھوپ ثمر شاخ کاٹ کر
چھپتا رہا سیاہ میں گمرام ہر طرف

رکھتے نہ تھے قدم کہ سفر سامنا نہ ہو
پھیلا ہوا تھا خواب خبر دام ہر طرف

حائل ہے پھر تباہ کی تصویر سُو بہ سُو
زائل ہے پھر پناہ کا پیغام ہر طرف

ایسا بھنور ہے زیر و زبر کچھ خبر نہیں
آغاز ہر طرف ہے کہ انجام ہر طرف

بے ثمر ہے ٹوٹتے ہوئے نشے کی نے ظفر
خالی پڑا ہے جسم کا ہر جام ہر طرف

☆

عکس میں افتادگی تھی نقش میں ناسُور تھا
عُمر خواب آہنگ منظر موت کا مسطور تھا

دو دھڑوں کے درمیاں جب گانو میں گولی چلی
آنگناں میں سُنسنی تھی بیریاں پہ بُور تھا

سبز کوٹ افسوں نشیلی چھائی تھی چاراں طرف
ہمہمہ نجار ہیکل ہاوہُو سے دُور تھا

سنگ ریزے بکھرے پڑے تھے سنگ صُورت کی جگہ
یعنی اُس منظر پہ پہلا وار ہی بھرپُور تھا

انتظار آنکھوں میں اُکھڑے ہی نہیں الفاظ عکس
ویسے اُس فہرست میں اُس کا بھی نام ضرُور تھا

حرف کی زنجیر زرد آزار تھی میرے لیے
مَیں الف کی آرزو میں شین سے مجبور تھا

پانچ نمبر کے مکاں میں تین تصویراں کی ماں
یہ حوالہ داستاں در داستاں مذکور تھا

سرسراتی سی ہوس جنجال کالی روشنی
ریشلے راہواں پہ اُس کا تنگ تھا یا نُور تھا

سیدھے سیدھے شعر کہتے، سب کو خوش آتے ظفر
کیا کِیا جائے کہ اپنی عقل میں افتور تھا

-☆-

شہد کی تہ میں طلب تھی تنگ میں تاخیر تھی
تلخی تسکیں تعاقب تیز کی تصویر تھی

مَیں ہٹانے کے لیے پہنچا تو اُس کے بھائی کے
بال تھے بکھرے ہُوئے پھُوٹی ہُوئی نکسیر تھی

کھینچ ہی لائی مُجھے آخر ہرے کے ہرگ سے
پانو میں زرفام زندہ زرد کی زنجیر تھی

قہر تھا کالی کسیلی بھُوک سے مرتا بدن
آنکھ سے اندھا تھا مَیں بستر پہ ٹیڑھی کھیر تھی

ڈوڈھ کی دیوار سی بے کار سی اور وسط میں
سانولی سی درز تھی لیکن گریباں گیر تھی

پیڑ کے پتّے ہوس حیرت ہوا میں حیلہ جُو
گھاس کے گھنگھور میں رس کی بھری انجیر تھی

اوّلیں لغزش تو اُس نے ٹال دی ہنس کر مگر
درگزرتا کس طرح یہ تیسری تقصیر تھی

ظلم کے ظاہر میں زنگ اوزار تھا کالا قلم
بطن کے برباد پہ پگھلی ہُوئی تحریر تھی

جسم تھا ملبُوس جیسا جنگ سے پہلے ظفر
جیت کر جانے لگی تو اک لہو کی لیر تھی

-☆-

انکار خندق ہے راستے میں
دیوار بدن ہے دیکھنے میں

تصویر ترنگ برق بارش
عکس نقشی ہر آئنے میں

بسل سنگ ثبات سنسناہٹ
آہنگ اسرار ٹوٹنے میں

جلتی ہوئی سی جے ہوئے پہ
چلتی ہوئی سی رُکے ہوئے میں

مینہ مرگ مجامعت مہورت
مُندرج لہو کے لائحے میں

زنگیں تجنجر ہوس ہوا کا
ٹوٹا رُت رقص رچنے میں

گمنام کا سبز ہے نہ چلا
ماتھے پہ لکھے ہوئے پتے میں

اُس نام سفر الف سے آغاز
کرتا ہوا ختم ہو گا رے میں

شکھ سانپ کی طرح تھا ظفر کیا
سر سر کرتا ہرے بھرے میں

☆

ساحلوں سونے سیہ تھے پانیوں پایاب تھے
دُور کے دریا بظاہر سبزی سیلاب تھے

آسماں انکار تھا رازوں کا ربط رائیگاں
زرد سے زرداب تھے یا سُرخ سے سُرخاب تھے

جسم کے بے حد و بے انداز میں چاراں طرف
بحر سے اُٹھتی تھی آندھی گرد میں گرداب تھے

تیرگی تعبیر تھی خالی خزاں خرمن ہوا
پیڑ پر پتے نہ تھے پیلے نکیلے خواب تھے

بات کیا چلتی اندھیرا تھا بہت الفاظ میں
پُوچھتے کس رنگ اُس کے عکس ہی برفاب تھے

نم نشیں تھی سُرمئی سلوٹ کی سنگ آمیز سطح
ایک فٹ کے فاصلے پر دو سفید اگلاب تھے

انگ انگیا سے ابھی اُبھرا نہ تھا مرگ آفتاب
زندگی ذرّے بکھرنے کے لیے بے تاب تھے

سالِ نو کی تہنیت بھیجی تو ہے اُس کو مگر
ساتھ کچھ پائے پُرانے دن بھی رنج رکاب تھے

اے ظفر وہ یار تھا کیسا کہ اُس کے نین نقش
خون میں شامل تھے آنکھوں کے لیے نایاب تھے

☆

گرجا گھنگھور گو بہ گو پہ
برسا منہ زور آرزو پہ

گڑبڑ تجسیم سامنا سا
ارژنگ آثار ڈوبڈو پہ

غیلا سا مزے کا موکھو
بکھرا ہوا تنگ ہوبہو پہ

ڈودھوں جگمگ سیاہ کاری
سانچوں سر سر چہار سو پہ

الف ایل اصرار خشم خوبی
عکساں رقصاں تھو تھو پہ

تلکن تنبیہ ریگ تختی
تحریر ترنگ تو بہ تو پہ

ان بھول ادیکھ انگ آفت
نازل ناگاہ ناز تو پہ

چھب چھانو نوا نئی نویلی
رکھ روپ روائیں ہاوہو پہ

رٹنا پچھنا ہٹنا بھٹنا
ہے ختم ظفر میاں مٹھو پہ

-☆-

اندھا دُھند انداز اندرے اندر
طلب تیرگی کا نگونا سُندر

جڑا آرزو نے بڑے جوکھموں
عبارت نئی میں پُرانا پتھر

بدن بُند جب تک چمکتی رہی
مسہری سے باہر نہ نکلا پھر

ڈبل ڈیکریں سی پس و پیش تھیں
نہ جانے گئی کس طرف سے نکر

چکھا سبز رو نے زہر ذائقہ
گرا ڈودھیا میں اندھیرا کنکر

میں اُس کیفیت تو نہیں جانتا
مجھے تیسری بار آیا صبر

ہیئت خون میں سنسناتا پھرا
چکا چوند چونچال کالا گفر

کوئی اور شے ہے مرے آر پار
ہوا ہے نہ پتوں کا چیلا چکر

سدا شر سفر سال سانسوں میں ہے
ظفر کون سی آندھیوں کا عطر

-☆-

چمک چمکارنے شب شیرنے کے
مزے محکم الف انجیرنے کے

لہو لہلوٹ سیاہی چھلیویں چھب
کڈھب کاغذ طلب تحریرنے کے

سبز ورخت سُرخ سُکھ سیب ، جھلمل
چڑھن چکھ چیرنے کشمیرنے کے

مہورت ماجرا منظر مناظر
جسم دیواروں تصویرنے کے

مہک مُکھ مانگ مس مت مرگ موسم
تنک تقصیرنے زنجیرنے کے

گرج گڑ گڑ گھٹا بن باس بجلی
جھپٹ جھٹ پٹ جھلس تحریرنے کے

اندھیر اندر بکھر بے نام بُنگل
بکھر نقشے تڑپ تشہیرنے کے

سڑک سل سلسلے سنگیں ونگیں
پھٹر چھل چھاوڑے رنگیرنے کے

ظفر گھرچن کھڑک تر مال جیار
لپک لم لیٹ گس کفگیرنے کے

☆

راکھ سراب سیہ جنگلاں میں پیاسا نام نشاں کا
پھرتا تھا اک واہ ورولا گِچی بِکّی تھاں کا

دن درگاہوں لکھیا لیکھ ہوا کے نیلے ورقاں
رت کرت چمک چانن میں فرق زمیں اسماں کا

جن ریتاں پر دھوپ دھڑکتی کپڑے لاہ کرنا چے
پلے باندھ ٹرے سفراں کو چھلڑ سنگھنی چھاں کا

جھڑتی رت کا زہر نگیلا سانجھ سرے میں رڑکے
زرد ہوا سنسان خدا بت نقشہ شہر گراں کا

ہم اُس کے وہ ہور کسے کا بِکّی مُکّھ ڈوری
اپنا دل اپنا مذہب کیا جھگڑا چون چناں کا

سنکھ سرے بجے دن راتیں دم زنجیر پُرانی
بوہے کھول کے بیٹھے ظفرا نانک ناتھ جہاں کا

☆

دلدار درمیاں دلدارنے کا
تلع تنہا الف انکارنے کا

ولادت چھین ویراں تربتر ٹے
رعونت راستہ گلکارنے کا

کرم عمن چپ چھر ز نوک نشتر
کندن کچ کارواں تیارنے کا

جبر مشکل بنا آساں عقوبت
مساوی بے عدد زنہارنے کا

کمٹ مکھ موڑ بے باطن ہوا بڑھ
عرق آغوش کھل ادبارنے کا

شکل مت شام شک درماندگی دل
گرد گھل بیل سوار اخبارنے کا

جلن بجھ جان جوکھم خانماں خاک
زہر ذرہ فلک سیارنے کا

سرج سونا فلک فانوس ملبوس
کرن کاتنا زمیں زرتارنے کا

معنوں کر کینوں زر زمینوں
سبق سردارنے سرکارنے کا

کرن کرچی شرک شیشہ ابر شو
جھپک جھولن پلک پندارنے کا

سراپا سربسر تسلیم تردید
کفر کلفت کلف دستارنے کا

کمر ڈھو بوجھ بوجھل موت مٹی
پکڑ بے گر جکڑ بیگارنے کا

شرروں شعبدہ صد آگ تقسیم
مرگ پارہ لٹک لہکارنے کا

ادھرواں در ادھرواں برق بادل
دھنکویں دھند بھر بھر پھوارنے کا

صدف صف ریت رقص ارژنگ آہنگ
تماشا تیرہواں صد پارنے کا

گزرواں گیٹ نُڑ کالج کہن پیڑ
نکلواں نازنیں نظارنے کا

لہر للکار لکھ لُٹ گُمبر کشتی
ورس دریا سہم شکھ پارنے کا

اندر چشم آسماں اُفتاد زن ذات
مرد پچھ ماورا ستارنے کا

کڑی کڑیل اوکھ اندام اگھ سکھ
سفر شکھ سلسلہ جھنکارنے کا

چتر چورنگ پُچپ اندر اباہر
طلسم اقرارنے آزارنے کا

سبک سڑ کھال کولاہٹ دھواں دھوڑ
عبث عشرت عذاب انگارنے کا

تمنا طائفہ تصویر تپچھٹ
محبت مسخرا دربارنے کا

لہر للکار لک لشکن لرزواں
دمک ہونگن غمبر گفتارنے کا

جبر جولاں جرت جنجال جلوہ
عشق عیّار عالم عارنے کا

پشم پاکول من مانی ملائم
کھدر کھب کھرودا بازارنے کا

نرم نیرنگیاں نیرنگ چھب چھید
نقش ڈکھ ڈوروواں دیدارنے کا

اُتروں رنگ رسوں دھم دھمک دھوپ
بکھرواں بن ثمر اشارنے کا

تھنز لیراں لنگار اَن گھنز حل ہول
چنکواں گولواں پکارنے کا

چنکویں چھانو دھوپ آشوب اگ بُوند
بدی بادل عجیب آثارنے کا

نرم سبزہ گرم گل شادماں شاخ
چمن چکھ چوتھلا تکرارنے کا

قُفل شکنی کفر شکنی برابر
چتر پکھ راستہ ہموارنے کا

لجاجت لجلجی لیچی لجیلی
گریباں گیرنا درکارنے کا

کھڑے کھیتاں رڑے ریتاں تناظر
سُنو سُورج سراب اطوارنے کا

فرق فقدان دونویں آگ عورت
جسم چادر تماشا نارنے کا

کھڑک کھڑکا دھڑک دھڑکا ابر پل
مزہ مدھم پریشاں پیارنے کا

سفر سینتیسواں اس پیش پکار
سمندر سامنے مجھ یارنے کا

پہنچ پہنچے ٹھک تھوڑی ہوس ہاتھ
ترس تحریرنا بیکارنے کا

فزوں تر فاصلہ راتوں براتوں
اُلٹ پلٹا اثر اصرارنے کا

مچل موجاں رکاوٹ نہر دودھی
طلب تیشہ پتھر پکارنے کا

تعلّق تازگی بُھولن قبولن
اودریا درمیاں اپنارنے کا

سفر سو شہر خواب ارواح تعبیر
جنگل جذبہ بدن بیدارنے کا

چتر چاتر چشم منسر بہانہ
وڑوں دروازنے عیارنے کا

اُمید اُفتادگی فُرقت فریبی
چپڑویں چپ انداز اقرارنے کا

مرض مجبوروں مختاروں مکھ
چھپاواں چھل عشق عطارنے کا

اڑن بوسہ مڑن جھی ، مجوں جان
اندھیر آنگن الف انوارنے کا

مُدلواں مسخرا مسجد شکن مست
تلذذ تجربہ مینارنے کا

برس بجلی بسنت ارژنگ رنگ ڈھنگ
مزہ ملبوس تن تیوہارنے کا

جتن جنجال جڑ گہری گمبھری
سنہری سیب عیش انبارنے کا

زنا زنگار جیتا جاگتا جس
بدن بستر ہوس نہجارنے کا

وصل ونجار وہی بھیڑیا بھوک
نبیل نزدیکنے خونخوارنے کا

کڑک بجلی بھڑک شعلہ دھڑک دھوپ
بدن بادل اُمڈ گھبارنے کا

اصل زر آنچ آتش شود در شود
گل آغوش گہ بیوہارنے کا

لکڑویں لاگ بن ایندھن چمن چوک
گل اندر گل اُگوں فوارنے کا

تک تنبیہ تروپے توڑ لپ لاگ
جسم جنگاہ جٹ گلنارنے کا

سیہ سنگیت سنگیں سن گھنا گھاس
ہوس جھنکارنے ملہارنے کا

اگن انگار نجھ بھڑکن اپستاں
کلپ کندن کلیجہ ٹھارنے کا

عناں گیراندنی کسویں زنا زین
اُمیداں شو بہ شو رہوارنے کا

سُرخویں نیل گروا گرد چک چھد
قلم زانو زخم اشارنے کا

شہد شدگار چُپ چنگار لب لمس
تھروان نم نمس گنجارنے کا

چمن وادی گلو گل واکھ دیوار
دمن درہ . دخل دشوارنے کا

کدورت کار کج کجاو خو خشت
اسر سودا محل معمارنے کا

عقوبت اژدھا کچھ کھال کھڑتال
سرک سکھ ریگ ریشم غارنے کا

کھلن کھوج آسن اندام آبگینہ
لہو باغ آرزو تاتارنے کا

چھلک چھپٹ آگنی عریاں عمارت
تخت ست سانولا مسمارنے کا

اڑی اڑیل اُٹھک بیٹھک سڑک بیچ
اٹھک آتارنے اسوارنے کا

دبک دوزخ مہک جنت زبر زیر
تضاد اندوہ شب شلوارنے کا

دھنک دھندلائیں آگے اپیچھے
قتل قالین کٹ تلوارنے کا

بھنور بھونچال اندھ اندھیر سُنتے
چندر چپ چمک منجدھارنے کا

دیا دکھتا لیا چُپ چور لت پت
خلش خاک آئنہ بیوپارنے کا

دھکویں دھاندلی اُوپر اینچے
دکواں درد استغفارنے کا

شبو شب گُلبہ رانی آب پاشی
فصل پھولا پھلکواں کیارنے کا

چلکویں چیز چڑھ چوگان چونکھ
کرن قاؤ برگ ہشیارنے کا

پدلویں برف دیواری پگھلویں
وصل ویہڑا نفس نچکارنے کا

حُسن قلعہ ہوس محصور مفتوح
تقاضا تر پہ سالارنے کا

فتح فرمان جاری چار کھونٹوں
قفل قید ارزنی کفارنے کا

تبر تقصیر اوّل آرزو رکھ
ہرا ہریالیا سنگسارنے کا

رقصواں رانگلا چکیں سر پھول
چھنک چھینٹا مہک معیارنے کا

زہر زار آسماں گہرا جنگل سبز
جھلک جھیل آئنہ لشکارنے کا

سرو سر بے ہوا بے نو گھمر گھاس
چھبن پچھل پُھولنے گھلوارنے کا

تپش نکووں تماشا توجو تنگ
برقی بوندوں خس خارنے کا

برسویں رُوپ رسویں خواب خوشبو
ڈلک ڈالی سبز مہکارنے کا

سمٹواں سوگ سرکنڈوں در اندر
مسرت کوئلہ چنگارنے کا

سبز سیکھ آہٹوں رنگ روپچی رو
زرد زنگیں ہنر سنسارنے کا

بدن بُت باردا مُستقبل امکان
شفاف آنکھوں عکس جھاکارنے کا

نچڑویں نیند جل تھل جلد جم جام
جرس جھونکا برس بیدارنے کا

صبر سرسام گردش گات عشق گیر
ٹھنک ٹھنڈکارنے سُر دھارنے کا

ٹھرک ٹھنڈک ٹھرک ٹھوکیں چھنک چھنک
مجبوراں عطر تک نسوارے کا

ٹکرواں عُندگی مُعلوم مُصرواں
عدالت آئینہ زنگارے کا

سنگ ساڑ آبلنا اُن سُن اچنبھا
ٹھر نازیب تنگ اخبارے کا

اندر افراتفر ہنچوں بروت
ہست ساماں اُلٹ گھر بارے کا

مُشکل پیروی انجان ایجاد
نگن معتقد عجب اشعارے کا

کلرفل کریش لینڈنگ آب انداز
تعب تخلیق رم رفتارے کا

عزیزاں عُنقی افتور دستور
اہمت حوصلہ درکارے کا

لفظ لولاک آفت آفرینش
ضرر سُونتک ستر اظہارے کا

بخ پائی پُرانی پنچھیش
پیخ چندن اسیدھ اکارے کا

طرز طوفاں اکیل احساس راوی
چمن پیلا کرب کردارے کا

زباں زادوں جلن موقع مُناسب
فلک اشگاف ہاہاکارے کا

جلقل تنقیص ہنگامہ ہدف حال
جگر جلوہ علمبردارے کا

تلاش انعام تن تصدیق تیرہ
اسرگراں ذلیل و خوارے کا

گھڑی گھنگھور جپ جادو خُدائی
متن مجبورے نکھارے کا

ظفر بے انت بڑباتاں بھنگو
بطن بے کارے بے چارے کا

☆

اجل خواب آئنہ آغاز عکس اندام دریاواں
چنچل چتر آرزو طوفاں عبث انجام دریاواں

زمستاں ذائقوں زندہ تماشا توڑ تابندہ
بری بندھ باتورا ٹھنڈکا پگھل پیغام دریاواں

سمجھ گر سامنا مٹ موج زرد اوجھل چشم چلمن
اکھڑواں نقش جھلمل جھاڑ جھرمٹ فام دریاواں

لبر سبزہ سر سر سر چھلک چھڑکاو چھل چھپ چھند
مہک مچھلی پھسلویں پھیلویں گل دام دریاواں

نکھوں مجبورنا بر بر سکھوں سیندورنا جل تھل
تمنا تہ بہ تہ تنہا ہوس ہنگام دریاواں

عرم گرداب گہرلی اُمس آزار بند انجول
ست جگوئیں ساحل کفر گمرام دریاواں

اچھل مچھلی غزہ گھلی زمن رس راستوں رکویں
مگرمچھ ماجرا مدھ بھیڑ شبنم شام دریاواں

بطن بدہاس بوجھل تولیا تصویر تر کچھواں
اتر سیلاب پل پایاب ات آرام دریاواں

ظفر عریاں ازل افتور دکھ دستور دستاویز
بدن بسرام صحراواں نظر نیلام دریاواں

☆

دیوار درز ڈوبڈو ارژنگ اژدواں
سرسبز بکھر سطح انیرنگ نظرواں

شب شور تماشوں عطر امکان صدا سر
پل چھن تہ و بالا عجب آہنگ عصرواں

رت رات ستاروں اُفق اندوہ کناروں
من موج ہوا دوش اُفورنگ نشرواں

جز جنس حرف حرز فنا فرق لپٹ لاگ
تج تول دھش دائرہ پاسنگ پتھرواں

سکھ سانجھ صنم تیج سنگ سانس طلب تج
بجھ باندھ لرز لاکھ چپ چنگ چترواں

پت پیرہنوں پردہ پری پیکروں پیاس
چت چشمہ چھلک چاند اُنس انگ اُبھرواں

مکھ بھر دمک ڈودھ چشم چاک زلف زور
رت ران رسوں رقص نقش تنگ تھرواں

رک ریت گھڑی رنج ہوس ہول سیہ سوگ
تج سار سروں سانجھ تخت سنگ سفرواں

تن توڑ نقب ناز خبر خام طفل ترش
جم جوڑ کفر قفل قلم زنگ ظفرواں

☆

تن طغیانی تہ بہ تہ نیند نوا چپ چانگی
لہر اتھر کناروں در دیوار اُلانگی

سانپ سُرخ سلوار یا ریگ رپٹ رنگ روشنوں
اڑ انکار الف ادا ریت روا نم نانگی

لکھ لٹ لاٹ لتا کسی چکھ چٹ چاٹ چٹاکسی
ست نجوگ سہاولا ٹ کھٹ رت جٹ جانگی

نالی نقش نویلی خون خرید گلاب گن
چھانٹ نُھری چھنکار چھٹ مُرغی مُو مُو بانگی

تھک تھرتھی تھل تھرتھرک تھال تھپک تھن تھوتھنا
تھور تھڑی تھم تھانی تھپ تھیلی تھک تھانگی

رت رفتار اُبھر عکس نت بیدار کلر بکس
ہرگ ہوا اسفید سر پت پگڈنڈی رانگی

پاکھر پنج پڑاو پل خواب خراب خمار خس
ڈر ڈنڈاس اُکاس اڑ بج بندھن بج سانگی

زرد پکڑ زر ذائقے ہونجھ ہسن ہر ہرجگی
ڈکھ دامن دریاولا سُکھ سبزی سُکھ مانگی

موج مہورت مُو بہ مُو فوج فتورت گو بگو
زوج ضرورت مُو بہ مُو بانجھ بدن ظفرانگی

☆

پتھر پکار پانچھ چھاک سانولی
گھونگھٹ گھٹاؤں گھاس چندن چاک سانولی

موسم مہار سوگ ثمر عکس رقص راز
پت پردہ شاخ شرم جھلک جھاک سانولی

گھل گھیل نقش ناز گرم گن گرہ گداز
بت بند مرگ مند سخن ساک سانولی

چکھ چوم چاٹ چوس نمک ذائقہ زہر
نم نرم گات گرم طلب تاک سانولی

شب خوں خمار شغل نکھر تنک نیزہ نقش
چوکس چمن چنگیز خبر خاک سانولی

رس رات مست مات سکوں سانجھ خواب خلق
چٹھ چوڑ زرد زور نقب تاک سانولی

پھسلن پھسل نکال نفس نُھوت پھیریاں
پل ہرگ بات برگ اچلاک سانولی

ست سکھ تنگ طراز دنگل داستاں دراز
پہلو پچھم پناہ پتھر پاک سانولی

شلوار شور سانپ سرک بل بساط بندھ
سیلاب سُر صدائیہ ظفراک سانولی

☆

چھتر پیرہن رُت رہا باروا
جنم جستجو جابجا باروا

کمن موت مستور خونخوار خواب
سفر سبز نم نارسا باروا

پھسل پھول کھل کھیل مجھ بات برف
سمت سوگ صحرا صدا باروا

تجل خاک ڈھل دھوپ چھت چھاتولی
ترس بوند چھینٹا گھٹا باروا

زبر زیر مدھ موج خالی خمار
حمائل ہوس بڑھ ہوا باروا

خبر خون خاکہ تنک تبصرہ
سُرخ سرورق جوگیا باروا

خطو خط خشم بے اُتر بے جواب
جنگل زرد پت جھڑ پتا باروا

طرب ظفر تحریر ملبوس موہ
مہک مکھ رتن راستا باروا

درس دور تر تیرگی وصل وہم
ظفر ظلمتوں باروا باروا

☆

مہک ماورا پیچ چادر چندن
ثمر سبز رُکھ راستوں رُت رنگن

الف آرزو آبلہ ارض ات
اگن آنچ بجھ بیچ کالا کندن

سنک سوچ سبزہ گرم گرد گات
لہو لہر ملبوس ٹہنی منگن

زُلف زور چپ چور لب لوٹا
لمس لاٹ تن چاتی مُنہ منگن

دھواں دھند ٹنک شام چنگار چوٹ
اُٹل آئنہ عکس آہٹ اگن

زبر زین زینہ تڑپ تیرگی
جکڑ جنگ نم تنگ بھیتر بھنگن

ڈنگل دائرہ سُر صدا پیچ مزہ
فرش فوت رم رائیگاں کچ کنگن

منگن ہمہ مٹی رواں رقص راز
عرق آبرو گرد گوہر گندہن

ظفر ابر آزاد گل گن ہوا
جسم جان جنجال بستر بندھن

☆

جسے ڈوبنا تھا اُسے تار گیا
وہ دشمن تھا کون اُس کی مت مار گیا

رُکا راہ میں ہتھل پتھر کہیں
بدن آنکھ تک صرف کھڑکار گیا

جنگل جھاڑ جھنکاڑ تن توڑ پھوڑ
الف انگ اسوار تہار گیا

چمک چیچ اُگھڑی گھنا ور گھنا
طلب تیر جد آر توں پار گیا

وہیں ہو گیا ہور کا ہور وہ
جو اندروں نکل کے ذرا باہر گیا

پس و پیش دائم للک لہر بہر
کہ ایہار آیا تو ویہار گیا

مرن مُہلتاں دینے واللار سی
زُلف زندگی ہور اُلجھار گیا

چُرا لے گیا کون معنی نکھن
یہاں نیر آیا نہ اپنار گیا

بزرگاں کو جانا پڑے گا ظفر
جہاں جس طرف باغ پروار گیا

☆

کڑہ کُرلاٹ سُنگھن سنگھنا بڑہ ہُونجھ ہواواں جتھے
بیک سُنسان گرج گوگڑ جھک نین بدل بھس لتھے

اٹ انکار نُخن سنکھنی مٹ موت نقش ورگا ہوں
وچ وِنجار گھر وِنجھلی رچ رل جنگلیں جاہ جتھے

تنک مجبوری زور ضرب تنک ٹکڑے سانجھ سنگلیاں
پھس پھڑکار ڈرن ڈوری اسمان زیناں تھتے

بُھکھ دریا للکار لشک زکھ روہڑ کدھی کم زوری
تن تیلا وچکار ولک ان موج مہار اُٹھتے

اکھ اختر چپ چان چمک کچھ پردے راز رنگلویں
لکھ مضمون گمن مطلب سکھ سڑ دفتر دکھ وتھے

نچ نچ یار مناون مدھ وچ سوہل ظفر ظلماتاں
ہر ہنکار تروڑ ترک بھر بھاگ جاگنس متھے

☆

ات اگنور شفق سونا پایاب ہوا پرچھائیں
جاگے رات رواج حویلی سووے سچا سائیں

گونج گواچ گناہوں در در ساون سدا سکھنا
ٹوٹوٹون بدن پر چھتی شوہ تصویر کتھائیں

وصل ولہیف الف انگیارے تانا تاس تناور
تھر تھر ہونٹھ گداز گزیدہ ہاف حمایل باہیں

میز بشاشت کُرسی کروٹ ہلچل ہینڈی کرافٹ
کار اتر بازار بکھر ہس کھوویں جائیں جائیں

پنچھ پرتیت لنک تلکلی آپی کیمن آچھن
ساتول سانجھ اواکل اک کمک دم دم دور بلائیں

نیک نشے ست رنگے سٹے انڈرویئر عجائب
بوجھل باس عطر انگنائی اندرے دھم دھمائیں

زرد جنگل مدھ کھو کھو ہسن نیچر فصل قرائن
وانے وانے ثمر معصیت خلوت خواب خدائیں

عیب امار شمار لگاوے دکھ دیشیر دساور
فیگر فحش عذاب عداوت گھمسم گھتّے ہوائیں

عکس محاسن لفظ لذائذ دستر خوان بخوبی
بھاشا بھات پکار پکاوے بھکھ بھانبڑ ظلفرائیں

☆

فصیح فراست عزائم بلیغ عنقا میں
کدام خاک اُڈائیم دشت دریا میں

پگھل سویر تماشا مہین کیا ہے پر
وصل وداع خرابی دیز کیا تھا میں

لفظ لپیٹ ہوس پیش کش عجب نوثیق
درشت دائرہ اسلوبیاں مُصفا میں

لہولہانیہ شوحید خاک مشت خراب
فلیک فوج محاذ آرزو مُہیا میں

فلک فراز ہوا دوز گرد چیتاری
عبث غُباریاں کیمن شفاف مولا میں

چمن چراغ گھو گل سفید رُشنائی
گھورے گھاس بلن بار تیرہ تنہا میں

نیز نوحہ نویسند پرت پوچھندو
مرگ مہاریہ ہیوی حواس یکتا میں

سراغ سبز گگل پیچ ووحشیاں دشمن
نقوش لالحہ زگ زیگ بخت جویا میں

الف اُلار تشنگی بدن بروھاں منڈھ
کمر تروڑ الذت غیاب ظفرا میں

☆

یہ کتاب اُردو مستقبل کا خواب نامہ ہے، دھندلا اور اُدھورا۔ مروّج اُردو کے ساتھ اپنی کچھ بن نہیں آئی، چناں چہ شعری تجربے کی حدت میں پگھل کر اس نے یہ صورت اختیار کی ہے۔ جن چشموں سے اس زبان نے ابتدا میں توانائی حاصل کی، اور جو ایک مدّت سے اس پر روک دیے گئے تھے، مَیں نے انھیں پھر سے رواں کر دیا ہے، کچھ لفظوں کا احیا کیا ہے، کچھ وضع کیے ہیں۔ ایسا کرنے میں کچھ اور پردے بھی ہٹے ہیں۔

اُصولاً یہ پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اُردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ پنجابی پیوند مَیں نے خاص طور پر جابجا لگائے ہیں، یہ تازہ خون اُردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دُور کرنے کے لیے ضروری تھا اور کلی شیز کا یہ پہاڑ کاٹنے کے لیے جہاں مَیں نے لفظوں کو نئے جوڑ توڑ سے رُوشناس کیا ہے، وہاں کسی قدر توڑ پھوڑ بھی روا رکھی ہے، اور بے شمار تلوار اُلار لمحوں سے سلامت نکل آیا ہوں۔ اس ڈسٹورشن سے لفظوں کی شخصیت اندر سے بھی بدلی ہے، نئی ساز باز سے لفظوں کے مابین نئے رشتے اُستوار ہوئے ہیں اور ابلاغ کی نئی سطحیں دریافت ہوئی ہیں۔

چھوئی مُوئی کے بجائے زبان کو زندہ متحرک شے گردانتے ہوئے مَیں نے اس کے ساتھ یہ آزادیاں لی ہیں۔ پنکچوایشن یکسر اُڑا دی ہے کہ معانی کو محدود اور پابند کرتی ہے۔ اضافت سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ گرامری گھٹن بھی اب ویسی نہیں رہی۔ اب مَیں سانس لے سکتا ہوں۔

تاہم موجودہ ایڈیشن میں اس لسانی جکڑ بند کو قدرے ڈھیلا کر دیا گیا ہے، کیوں کہ اس کے بیشتر مقاصد حاصل کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً باقی معاملات کو جُوں کا تُوں رکھتے ہوئے جہاں پنجابی کی جگہ اُردو افعال کو بحال کیا ہے وہاں کا، کے، کی کے بجائے الف کے استعمال کو ترک کر دیا گیا ہے۔

ظفر اقبال

ظفر اقبال کی شاعری مجھے بے شمار خصوصیت کی بنا پر پسند ہے۔ ان سب پر گفتگو کسی دوسرے موقع پر کروں گا۔ اس وقت مجھے صرف اس انحراف و بغاوت کا تذکرہ کرنا ہے، جو اس شاعری کو پہلے کی شاعری سے الگ کرتا ہے، اور جس کی بنا پر افکار چالب کا ہم زبان ہو کر میں ظفر اقبال کو صاحب عہد شاعر کہتا ہوں۔ انحراف و بغاوت... لفظ... واقعہ... ذہن

ظفر اقبال کی شاعری میں الفاظ، لسانی اساطیر نہیں، تخلیقی تجربے ہیں۔ یہ کسی نے کہا کہ تخلیقی تجربہ معلوم اور مانوس چیزوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات کسی کے ذہن سے نکل کہ تجربہ معلوم چیزوں کے راستے تبدیل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مانوس چیزوں سے حاصل ہونے والا تجربہ ہماری روزمرہ کو لمحہ کے تیل والی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان چیزوں کو تحصیل بچے ہوتے ہیں اور وہ ہمیں دوبارہ یاد آ جاتی ہیں تو اس میں ہمارے حافظے کا قصور ہے۔ اس حافظے کے تعقل کو تخلیق قبل کیا کہاں کا انصاف ہے؟ اسی طرح معلوم چیزوں کے راستے تبدیل کرنا تخلیقی فنکار کا کام نہیں، مدرسے کے مداری کا وظیفہ ہے۔ تخلیقی تجربہ فنکار کی ذات کا اظہار ہے، جو "موجودات" سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ "اب" عقیدوں اور پکار کا مسئلہ نہیں، بلکہ عرفان ذات کا مسئلہ ہے۔ وہ ذات جس کی تربیت زمین پر جغرافیائی تغیرات کے تحت ہوئی، وہ ذات جو اپنی وراثت میں اسم اور زمین کو جدا نہیں کرتی۔ زمین اور جغرافیائی اثرات جسمانی مزاج کو، جسمانی مزاج پانی میں سانس کی وراثت کو، اور سانس کی وراثت لفظ کو جنم دیتی ہے۔ پھر لفظوں کو عقیدے کا مسئلہ سمجھنا ہو میں تجربہ چھوڑنے کے برابر نہیں تو اور کیا ہے؟

ظفر اقبال کی شاعری میں استعمال ہونے والا لفظ اس زمین کے ساتھ وابستہ ہے جس نے ظفر اقبال کو جنم دیا ہے۔ پنجاب کی مٹی کا پیالہ رہا ہے کہ اسے پانی کا آشوب نصیب نہیں ہوا۔ خواہ وہ پانی کا آشوب حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پیدا ہوا ہو عقیدوں میں بٹنے والے مصلوق اور ہوا میں اڑنے والے بے وزن جسموں کے حق رواں ملی سے۔ پنجاب کی مٹی اپنا حق مانگتی ہے اور اپنے لفظ کو اپنے سے پیدا ہونے والے جسم کو بطور روایت منتقل کرنا چاہتی ہے۔

ظفر اقبال کے ہاں لسانی تشکیلات کو عمل ہماری کلاسیکی تنقید کی اصطلاح "قدرت بیان" سے بہتر طور پر واضح کیا جا سکتا ہے۔ قدرت بیان سے غالباً ان کی مراد یہی تھی کہ شعر میں الفاظ کا تخلیقی عمل معانی اور تجربے کی نئی نئی راہیں دریافت کرتا ہو۔ اگر آنے... آپ کو ظفر اقبال کے اشعار کی لسانی اور صوتی در وبست سے شدید اختلاف ہو گا۔ آپ کہتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے کانوں کو ذوق و جسم لسانی استعارہ کی ترتیب حاصل ہے۔ لیکن کیا زور جسم لسانی استعارے جو ہماری روزمرہ مکانکی زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں، شاعری ہیں۔ آپ کو ظفر اقبال کے مصرعوں میں بچ ادھر کی اجنبی زنجیروں سے گھبراہٹ محسوس ہو گی لیکن اپنے کلاسیکی شاعروں کے ایسے اشعار کہ

وہاں دیکھے کی جلبل پری زاد　　اوے رے اوے رے اوے رے

آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ آپ ان سب باتوں کو چھوڑیں، اچھا شاعر لفظ کے استعمال میں اس بات کا پابند نہیں ہے کہ کون کس طرح بولنا پسند کرتا ہے۔ میں آپ سے ایک سوال بڑے ادب سے کرتا ہوں اور وہ یہ کہ کلاسیکی موسیقی میں بیلے کی ٹیکنیک اور راگوں کے بول سرتم موجود ہیں، ان کے الفاظ کیا بے معنی ہیں؟ اگر وہ الفاظ بے معنی ہیں تو آپ کا سارا ذوق بے معنی ہے۔

آپ کو ظفر اقبال کے اشعار پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ ہو گا کہ وہ دل، راہ رک، بولاں کے، کنگیا، اولاد تو جیسے الفاظ کیوں استعمال ہوتے ہیں، جن کا اردو کی روایتی شاعری میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ تو اس کا جواب دینے کے بجائے میں خود آپ ہی سے ایک سوال کیوں نہ پوچھوں کہ لکھنو والے جگہ کو جاگہ کیوں کہتے ہیں۔ دلی والے لفظوں کو بھاری پن سے کیوں ادا کرتے ہیں۔ ولی کی شاعری میں کہنا کے بجائے بولنا، پاس کے بجائے کنے، زوماں کے بجائے ینگا، کو لمحو کے بجائے گماں، بہت کے بجائے بوت، کی طرح کے بجائے فن کیوں کا استعمال ہوا ہے؟ آگرہ، دلی، دکن اور لکھنو کے ادب میں، مقامی روزمرہ کے استعمال اور اس روزمرہ کے درمیان شدید اختلاف کے باوجود شاعری شاعری رہتی ہے۔ تو ظفر اقبال کے ہاں ویسی گے کے بجائے بولاں کے، یا راہ روکنے والے کے بجائے راہ رک استعمال ہو گا، تو اس سے اردو زبان کس طرح ضعیف ہو گی؟ بہر حال یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ میں تو صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظفر اقبال ان لفظوں کو استعمال کرنے کے باوجود اردو ہی لکھ رہا ہے، اور دلی اور لکھنو کے محاورے کی نقل اتارنے کے بجائے پنجاب کے روزمرہ کو استعمال کر کے زیادہ ادبی دیانتداری کا ثبوت دے رہا ہے۔ اور ابھی تو ظفر اقبال روایت کی گرفت سے بہت کم آزاد ہو سکا ہے۔

علامات کا طوق گلے میں پہنے سے ظفر کو کیا فائدہ ہوا؟ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اچھا ہوتا اگر وہ اس قید سے بھی آزاد ہو جاتا۔ یاروں نے اب آ کے نہیں نکلتا تو پھر اس سے زیادہ کیا کر لیتے۔

تو یہ ایک انفرادی تجربہ ہے جو صرف ظفر اقبال کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے۔ اگر آپ نے اس ایک آدمی کے تجربے کو چیلنج کر دیا تو وہ آپ کی ساری شاعری کو چیلنج کر دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں آپ نے پہلے اس قدر لسانی تجربات کی مصیبتیں گلے ڈال رکھی ہیں اور ان سے اردو زبان میں کوئی غلاظت پیدا نہیں ہوئی تو ایک اور سہی۔ ممکن ہے، یہ بھی اپنی حیثیت منوالے۔ یہ نہیں بھی ہونے سے تو آپ تجربے کو روک سکتے ہیں اور نہ وہ رک سکتا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

چندا، اویس، مریم، شہریار، حسنین اور مومنہ کے نام

ہماری تو میعاد پُوری ہُوئی
زمانہ تمھارا زمانہ ہے اب

(دیوانِ مُردَّف)

کاش سنجیدی کہ بہرِ نقلِ معنی یک قلم
جلوۂ کلک و رقم وارون خواہد شدن
چشم کور آئینہ دعویٰ بہ کف خواہد گرفت
دستِ شل مشاطہ زلفِ سخن خواہد شدن
غالبؔ

رطب و یابس کا شاعر

میرے ایک سابق ادبی رفیق کار افتخار جالب شعری لسانیات کے باب میں خود ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ دُوسروں کو بھی اُلجھا دیتے ہیں۔ مغالطوں کی جدلیات کے اس نقاد نے ظفر اقبال کی شاعری کے بارے میں ایک من مانا مغالطہ پیدا کر کے اُس کی شاعری کی تحسین کا در بند کر دیا ہے۔ ''اب الفاظ محض مقبول عوامی رشتوں میں نہیں بندھتے، فنکار کی قدرت اور ارادے سے کہ سراسر انفرادی ہے، آپس میں جُوتے ہیں'' (دیباچہ: گلافتاب۔ افتخار جالب) نقاد نے شاعر کو گمراہ کیا، شاعر نے گلاب کو اگلاب لکھ کر نقاد کو خوش کیا، لیکن جلد ہی عبرت کا دامن تھاما کہ شاعری میں نیا لسانی شیوہ الف کے اضافے یا 'ی' کے گرانے سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ لفظ اور شے کے تعلق کی دریافت سے وجود اختیار کرتا ہے۔ ظفر اقبال نے لفظ اور شے کا جو ربط دریافت کیا ہے اُس کی بنیاد شخصی بُوالعجبی کے بجائے ایک تہذیبی تناظر سے دُوسرے تہذیبی تناظر کی طرف روانگی کا سفر ہے۔ افتخار جالب اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ظفر اقبال نے الفاظ کو عمومی رشتوں سے انقطاع کے ذریعے اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔ اس عوامی نقاد نے ظفر اقبال کی انفرادیت کو مغالطے کا ایک معیار بنا دیا ہے۔ اُس کے نزدیک فنکار کی انفرادیت الفاظ ''رطب و یابس''، اس دعوے اور مغالطے کی تکذیب ہے۔

'رطب و یابس' ظفر اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ 1970ء میں الہ آباد سے شائع ہُوا۔ اشاعت کا افتخار ایک دوسرے مُلک کو ہُوا۔ جس مُلک کے رطب و یابس کے بارے میں یہ 'رطب و یابس' مرتب کیا گیا اس کے ناشرین دوسرے رطب و یابس کی اشاعت میں مصروف رہے۔ خیر مجموعہ تو شائع ہُوا فی زمانہ یہ بھی ایک غنیمت ہے، بے شک ہماری موقعیت ایک اجتماعی رطب و یابس ہے، جسے ظفر اقبال نے اس طرح مُرتب کیا ہے کہ یہ مجموعہ ہماری معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی بُوقلموں رنگین تصویر بن گیا ہے۔ اس گوڑ کباڑ اور خرافات سے جو تصویر مُرتب ہوئی ہے وہ ہماری ہے جو دیکھنے میں رنگین ہے اور چُھونے میں کھُردری اور بے کیف۔ ظفر اقبال نے ہمیں اپنے آپ کو اتنے قریب سے دکھایا ہے کہ خود اپنا وجود دیکھ کر اتنی گھن آتی ہے کہ کاش یہ شکل کوئی اور نہ دیکھتا۔ 'رطب و یابس' ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو ردِ عمل پیدا کرتا ہے، یہی اُس کی سب سے اہم حقیقت ہے۔ یہ شعری مجموعہ تجربات کی نوعیت اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے 1947ء کے بعد شائع ہونے والے غزلوں کے تمام مجموعوں میں سب سے منفرد ہے۔ آیئے اس مغالطہ نُما بیان کی تائید یا صراحت کے لیے 'رطب و یابس' میں ایک مُسافر کی طرح داخل ہو کر شاعری تعمیر کردہ کائنات کے معنوی اُسلوب کی شناخت کریں۔ ظفر اقبال نے اپنی شعری کائنات خُود تعمیر کی ہے۔ اپنے تجربات کو خود دریافت کیا ہے، اور تجربات کے امتزاج سے معانی کا جو قرینہ مدوّن کیا ہے، وہ اُس کی شخصی کاوش ہے۔ ظفر اقبال ایک جاگتا ہُوا شاعر ہے جو اُردو کلاسیکی غزل کی روایات سے بخوبی آشنا ہے۔ اُسے یہ بھی احساس ہے کہ غزل کا کلاسیکی لسانی اُسلوب فی زمانہ کس حد تک تاثیر اور معنوی تعمیر کا ضامن ہو سکتا ہے۔ 'رطب و یابس' کی غزلیات اُردو غزل کی روایت میں معنوی اور صُوری تجربہ ہیں، اور اس تجربے کے حوالے سے اُس نے نئے تجربات کا ڈول ڈالا ہے۔

'رطب و یابس' میں ظفر اقبال کا، اُردو غزل کی روایت کے بارے میں گہرا شعور جھانکتا ہے، یُوں تو اُردو کے غزل گو شعرا لفظ و معانی کے تعلق کے بارے میں عموماً ایک دو اشعار کا قیلولہ ضرور کرتے ہیں، اور پھر رسماً تنگ نائے غزل کا رونا رو کر اطمینان سے غزل کو تنگ تر بنانے کی مزید کوشش کرتے ہیں، ایسے غزل گو شعرا کے علی الرغم ظفر اقبال نے تنگ نائے کی تنگی کو کچھ اور طریقے سے محسوس کیا ہے:

قافیے کی بندگلیوں کا گداگر کر دیا
اُس نے کیسے کام پر مجھ کو مقرر کر دیا

☆

کنکر پتھر کے قافیوں سے
کرتا ہے ظفر غزل مُرصّع

☆

ہوئے ہے۔ ظفر اقبال کو اپنے تجربات اور زبان سازی پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیتا ہے کہ اُس نے زبان سازی کی ہے یا زبان شکنی! وہ اپنے عصر سے خواجہ سراؤں کی زبان میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا:

سوچے شعر کا نیا کوئی کوڈ
ساتھ چلتا نہیں ہے یہ بھی موڈ

ظفر اقبال مُروّجہ غزل کے اُسلوب سے برگشتہ ہے، اور اُس نے اس برگشتگی کا اظہار بھی انوکھے انداز سے کیا ہے، وہ اس لیے شعر کا نیا دستور العمل تلاش کرتا ہے کہ مُروّجہ اُسلوب غزل اُس کے تجربات کا ساتھ نہیں دیتا۔ چناں چہ وہ ردِعمل کے طور پر غزل کی مُروّجہ لسانی نُرمتوں کی بُری طرح سے توڑ پھوڑ کرتا ہے، اور پھر اُس منفی ردِعمل کی ہنگامیت سے آگے بڑھ کر اپنے تجربات کا لہجہ متعیّن کرتا ہے۔ ظفر اقبال کا روایتی غزل کے خلاف ردِعمل اتنا شدید ہے کہ وہ وسیع تر اظہار کی تمنا میں اس شعری مجموعے کے صفحہ 60 پر، غزل کا رسمی قالب توڑ کر آزاد غزل لکھنے لگتا ہے، جو پیروڈی بھی ہے اور غزل کے نئے تصوّر کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ غزل کا مُروّجہ شعری محاورہ نئی بصارتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ظفر اقبال نے غزل کی صرف و نحو اور اس کے لسانی اُسلوب کو درہم برہم کر دیا ہے، وہ لفظ کی کھوٹی چونّی چلاتا ہے۔ اس 'کھوٹی چونّی' کے عقب میں ہمارے کلاسیکی شعرا کا زبان کی پاکیزگی اور 'ستاریٔ' کا وہ تصوّر ہے، جس نے اُردو غزل کے ذخیرۂ الفاظ کو محدود تر کر دیا ہے۔ 'رطب و یابس' میں ظفر اقبال نے یہ شہادت دی ہے کہ ہر طرح کے الفاظ جزوِ غزل بن سکتے ہیں۔ چناں چہ وہ ہر طرح کے الفاظ کو اظہار و معانی کا صیغہ بناتا ہے۔ ہمارے کے الفاظ میں ظفر اقبال نے الفاظ کی شاعری کی ہے، وہ الفاظ کو تصوّرات کا جامہ پہنا کر لفظ و معانی کی ثنویت کی بدعت سے بچ کر بذاتِ خود الفاظ کو تصوّرات میں تبدیل کرتا ہے جس سے لفظ کی شیئیت اُس کی بنیادی ماہیت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ بعض غزلیات میں اُس نے معانی کی تعمیر کے لیے الفاظ کی اصوات کو استعمال کیا ہے، یعنی لفظ کی صوت کو سیاق و سباق کی بدولت اُس کے وجود پر اس طرح نافذ کیا ہے کہ صوت کے پیچ و خم معانی کا عنوان مُرتّب کرتے ہیں۔ ظفر اقبال قافیہ کو ستر پوشی کہہ کر مُروّجہ غزل گو پر طنز کرتا ہے کہ اس شلوار کو کس کے باندھنا چاہیے۔ ظفر اقبال نے 'رطب و یابس' کی بیشتر غزلیات میں قافیوں کو اس طرح کسا ہے کہ معاصر

جان چھڑواؤ اس غزل سے بھی
لکھو مقطع ظفر نکالو سیھ

☆

مرگِ طبعی سے مرے، دیر کے بیمار تھے لفظ
اور پکڑا گیا میں صرف دوا دینے میں

☆

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

☆

راس آئی ہے سخن کی گرم بازاری مجھے
لفظ کی کھوٹی چونّی کو چلا دیتا ہوں میں

☆

ستر پوشی ہے قافیہ بندی
ہاں ذرا کس کے باندھیے شلوار

☆

کام کتنوں ہی کا تمام ہُوا
جب بھی اوچھا پڑا زبان کا وار

☆

تنہا ہی جشنِ مرگِ معانی منائیں ہم
لیکن حصارِ حرف سے باہر صدا تو آئے

مذکرہ بالا اشعار میں ظفر اقبال کا زبان اور معانی کے بارے میں رویّہ مخصوص ہے۔ یہ ردِعمل کلاسیکی غزل کی کورانہ تقلید کے خلاف ہے۔ وہ اسی تقلید کے خلاف احتجاج کرتا ہے کہ اُسے جبراً قافیوں کی بندگلیوں کی گداگری پر مجبور کیا گیا ہے۔ ظفر اقبال کو شدت سے احساس ہے کہ قافیہ شاعری پر ایک جبر ہے۔ کلاسیکی غزل کے لفظ مرگِ طبعی کو پہنچ چکے ہیں۔ اس جشنِ مرگ پر اگر شرکت کے لیے کوئی اور آمادہ نہیں تو شاعر کی واحد ذات یہ جشن منانے کا تہیہ کیے

غزل کو برہنہ ہو گئے ہیں، چناں چہ وہ مروجہ قافیوں سے انحراف کر کے قافیوں کی اصوات کے ذریعے معانی کی تشکیل کرتا ہے:

دھوپ سے کچھ بچاو رہتا ہے
سر پہ رکھتے ہیں شاعری کا ٹوپ
اب تو رکھی ہے دیکھنے کے لیے
کبھی چلتی بھی تھی ظفرؔ، یہ توپ

☆

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا
بن جائے گا بات کا بتنگا
خیر، آپ بھی بدمعاش ہوں گے
میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

مثال نمبر 1، مثال نمبر 2 میں ٹوپ اور توپ کے قافیے سے شاعر نے ہر دو اشعار کی معنویت کا دارومدار ان دو قوافی پر رکھا ہے۔ دستارِ علم یا فضیلت کو ٹوپ میں منتقل کر کے شاعر نے ٹوپ، دھوپ کے الفاظ کو ایک معنوی رشتے میں پرو دیا ہے۔ پہلے دستارِ فضیلت، تبحرِ علمی کی نشانی تھی۔ اب وہ شاعری کا ٹوپ بن کر دھوپ سے بچاتی ہے۔ اسی طرح مثال نمبر 2 کو مثال نمبر 1 سے ملا کر پڑھا جائے تو ٹوپ اور توپ سے ذہن طوطے کے مداری، بھنگیوں کی توپ اور نہ جانے کس کس سمت میں حرکت کرتا ہے۔ اس طرح سنجیدگی اور مضحکہ سے تجربہ کی جہتیں پھیلنے لگتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مثال نمبر 3، 4 میں دنگا، بتنگا اور لفنگا کے قوافی کے استعمال سے معنویت اصوات سے مرتب ہوتی ہے۔ غزل میں قافیے کے استعمال کی یہ نہج معنوی اعتبار سے تمسخر سے سنجیدگی کا قرینہ پیدا کرتی ہے۔ عموماً ہمارے یہاں الفاظ کی اصوات اُن کے معنوی پیرایے سے باہر رہتی ہیں، لیکن ظفر اقبال نے اصوات کو معانی کا جزو بنا دیا ہے۔ یہ حربہ ظفر اقبال کی شعری انفرادیت میں معقول اہمیت کا حامل ہے۔

ایک طرف ظفر اقبال نے غزل کے لسانی اُسلوب میں ممنوعات کے استعمال سے گھٹن کی فضا کو ختم کیا ہے، دوسری طرف اُس نے غزل کو ایک جذبے کی قید سے نجات دلا کر اسے وسیع تر تخلیقیت کے سپرد کیا ہے، جہاں غزل اور نظم کے فردی امتیازات خود بخود اٹھ جاتے

ہیں۔ اقبال کے بعد کی اُردو غزل موضوعاتی اعتبار سے ڈانواں ڈول نظر آتی ہے۔ اس کی بے بسی کو ظفر اقبال نے ایک طرح کا چیلنج دیا ہے کہ غزل کے ہاتھ پاؤں اتنے بندھے ہوئے نہیں ہیں جتنے باندھ دیے گئے ہیں۔

'رطب و یابس' میں تین طرح کی غزلیات ملتی ہیں، اول وہ غزلیات جن میں جذبۂ عشق کے لوازم کے ذریعے تجربات کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس شیوۂ اظہار میں بھی ظفر اقبال نے اپنی انفرادیت کی حفاظت کی ہے:

کچھ ترے بھائیوں نے مار رکھا
کچھ پڑیں اپنے گھر سے بھی ڈانگیں

☆

میں اتنا بدمعاش نہیں یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ، سویٹر اُتار دے

☆

بدن کا سارا لہو کھنچ کے آ گیا رُخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخرو ہے بہت

☆

اب کے اُس بزم میں کچھ اپنا پتا بھی دینا
پاؤں پر پاؤں جو رکھنا تو دبا بھی دینا

دیکھا آپ نے! ظفر اقبال بھی عاشق ہے مگر تھوڑا سا لچا اور لفنگا۔ مثال نمبر 1 میں بھائیوں کی مار اور اپنے گھر کی ڈانگوں سے شاعر نے آج کل کے عاشق کی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے، جو واقعاتی حقیقت ہوتے ہوئے بھی مضحکہ خیز ہے۔ مثال نمبر 2 میں خواہش اور لذت کا تذکرہ کس بے تکلفی سے براہِ راست انداز میں کیا گیا ہے۔ مثال نمبر 3 میں بوسے کے وقت جذباتی تشنج اور بعد کی خجالت کو ایک حقیقی نفسیاتی کیفیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایسے تجربات کے ادراک کا یہ انداز ایک مخصوص زندہ زمانی تناظر سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ شاعر اپنے تجربات کو غیر حاضر تمدنی پس منظر سے اخذ کرنے کے بجائے اپنے عہد کی زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس نوعیت کی غزلیات میں بے تکلفی اور گفتگو کے انداز سے یہ واضح

ہوتا ہے کہ نئی غزل کے عناصر کی تشکیل میں ظفر اقبال نے کلاسیکی غزل کے مصنوعی شکوہ سے گریز کیا ہے۔

'رطب و یابس' میں دوسری قسم کی غزلیات کا تعلق شاعر کی نفسیاتی کیفیات سے ہے جو ایک مخصوص سیاسی و تمدنی نظام کی پیدا کردہ ہیں۔ اس نوعیت کی غزلیات میں ظفر اقبال نسبتاً زیادہ تجریدی ہے، اُس نے مُروجہ غزل کے لسانی اُسلوب کی نئی معنوی دلالتیں تلاش کی ہیں:

سفرِ خواب کا صلہ مانگیں
سُوجتے پَیر، کانپتی ٹانگیں

☆

پُرانے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لیے
ہم اپنے سر پہ نیا آسمان بناتے ہیں

☆

سب روشنائی اُڑ گئی شب بھر میں، کیا لکھیں
ڈھکنا کُھلا رہا کہیں دل کی دوات کا

☆

ہُوں مَیں وہ خُوں کہ بہایا ہے مجھے سڑکوں پہ
مَیں ہُوں وہ رنگ کہ چہروں سے اُڑایا ہے مجھے

☆

حواس میں ہیں کہیں خوف کے نشیب و فراز
جو خُود سے بھاگتا ہُوں راہ میں ٹھہرتے ہوئے

خواب کے سفر میں پیروں کا سُوجنا، اپنے لیے نئے ظلم کی تلاش، حواس پر خوف کا نفاذ، وہ کیفیات ہیں جو عدم موافق نظامِ زیست سے تعبیر لیتی ہیں۔ ایسی غزلیات میں جذباتی شدت اور نفسیاتی کیفیات ملتی ہیں جو شخصی کیفیات کے دائرے شکستہ کر کے اپنے معروضی علائق اُس خارج سے منسلک کرتی ہیں جو بطور محرک شاعر کو ردِعمل پر اُکساتا ہے۔

'رطب و یابس' میں غزلیات کی تیسری شق تجربات اور لسانی محاورے کے اعتبار سے ہر دو سے مختلف ہیں، اور جو غایت درجہ تجرباتی ہیں۔ شاعری بنیادی طور پر زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک رویہ ہے۔ شاعر ایک رویے کے تحت ہی رویے کو عریاں کرتا ہے۔ صرف وہی شاعر رویے کی تعمیر کر سکتا ہے، جو انسانی تعلقات، انسانی تاریخ اور بین الانسانی معاملات کے بارے میں کسی قسم کا فکر کرتا ہے۔ جو فرد یا شاعر انسانی معاملات میں اور کائنات کے اسباب و علل کے تناسب میں کسی قسم کا خلل نہ دیکھتا ہو، اُس کے لیے زندگی ایک سپاٹ حقیقت ہے، لیکن جو شاعر ظفر اقبال کی طرح گستاخ اور شریر ہو، اُس کے لیے زندگی تضادات سے بھرپور تلاطم ہے۔

1947ء کے بعد کے اُردو غزل گو شعرا میں ظفر اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے معاصر زندگی کے زیادہ تضادات سب سے زیادہ محسوس کیے ہیں۔ وہ زندگی کے جدلیاتی عمل پر یقین رکھتا ہے۔ اُسے ہر جگہ تضاد نظر آتا ہے، معاصر زندگی کا کوئی شعبہ اُس کے تجربے کی زد سے محفوظ نہیں ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک استحصالی نظام میں شاعر نے عدم مفاہمت کے ذریعے ایک ناگزیر صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ خواہ وہ سلیم و ریاض کا اذیتانہ اور ناشرانہ استحصال ہو یا کسی اور کا استبداد، ظفر اقبال دونوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔ ظفر اقبال جُرأت مند شاعر ہے، وہ زندگی کے عقاید، اقدار اور انسانی تعلقات کے مُسلمات سے منکر ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک اقدار اور رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے، وہ ایک نئی مابعد الطبیعات سے انسانی رشتوں کو ازسرِنو منظم کرتا ہے:

امیدِ فصل ہو بنجر، قدیم بیجوں سے کیا
گھروں کو چھوڑیے اور کھیت میں اُگائیے غلہ

یہ مُسلمات اور عقاید محض شعبدے ہیں جنھوں نے انسان کی اصل حقیقت کو مسخ کر دیا ہے:

شعبدوں کے شور میں انسان سایے رہ گئے
مُعجزوں کی مار نے لکھے کو عمل کر دیا

ظفر اقبال انسان کو وہ چھنا ہوا مقام واپس دلانا چاہتا ہے:

اب تیسری طرف کو بھٹکتا ہے دھیان کیا
منکر ہیں اپنے، اور ہیں کافر خدا کے ہم

☆

خوب اپنی بھی لغزش ہے ظفر
خلق سے بَیر، خدا سے ناراض

اپنا انکار، خدا کی ذات سے انحراف، ایک نظامِ اقدار سے علیحدگی اختیار کرنا ہے کہ وہ نئی حقیقتوں کا متلاشی ہے۔ وہ اسی تلاش میں خلق سے بیر اور خدا سے ناراضی مول لیتا ہے۔ اُسے احساس ہے کہ اقدار کے خلا سے باطن ٹوٹ جاتا ہے:

اور ویران ہوا جاتا ہوں اندر سے ظفر
ربط کچھ ہے تو کسی شہر کی تعمیر کے ساتھ

لیکن شہر کی تعمیر کی خواہش اُسے ویرانی کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ ویرانی محض وقتی نہیں، ایک بدہیئت مُعاشرے کے باطن میں اقدار کے زیر و زبر ہونے کا عمل ہے۔ وہ اسی خلفشار میں نہلزم کی طرف رجوع کرنے کے بجائے تعمیر کا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ دل شکن صورتِ حال میں دُنیا کو تیاگنے یا دیوانگی کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے طنز اور استہزا کے ذریعے مُعاشرتی تضادات کی جدلیات مُرتب کرتا ہے۔ وہ تمام ناموافق حالات کے باوجود زندگی پر اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا ہے، کیوں کہ اُسے شاعر کے منصب اور ذمّے داری کا احساس ہے:

ہوئی معیاد ممبری کی ختم
رہ گئے لال دین سے لالو

☆

جس نے چوری کی تھی سو پچاس پر چھوڑا اُسے
جو سڑک پر جا رہا تھا اُس کو اندر کر دیا

☆

عدالت ہے خلقت کی خود اپنی
خلقت پر کرے کیا کوئی دعویٰ

☆

ہوئی صحت رعایا کی ذرا ٹھیک
پڑے بیمار جب سلطان سنجر

لال دین سے لالو بننا، پچاس روپے لے کر چھوڑ دینا، خلقت کی اپنی عدالت، رعایا کی صحت اور سلطان کی بیماری، ابن الوقتی، ناانصافی اور استبداد کی وہ علامتیں ہیں، جنھیں ہم عملی طور پر بسر کر رہے ہیں۔ ظفر اقبال کی مُسلسل غزلیات میں ایسے تضادات کے ادراک کے ساتھ ساتھ اُس کا رویّہ زیادہ شدید ہوتا جاتا ہے، اور وہ ردِعمل کی زد میں آ کر کہتا ہے:

ہم نے معیار ہی بدل ڈالا
عیب محفوظ کر، ہنر ضائع

عیب کی حفاظت اور ہنر کا ضیاع ایک بہت بڑے اجتماعی المیے کے آثار ہیں جن کی نشاندہی ظفر اقبال نے کی ہے۔ اُس کی اپنے عہد سے گفتگو بڑی بھرپور ہے۔

ظفر اقبال بے حد منفرد شاعر ہے اور اُس نے اپنی انفرادیت کی حفاظت کی ہے۔ اس نے معانی آفرینی کے ذریعے اپنے انفرادی خطوط معاصر غزل گو شعرا سے جداگانہ قائم کیے ہیں۔

اُردو کی کلاسیکی اور مُروجہ غزل میں عموماً عمومی بیانات یا کیفیات کا مُبہم اظہار ملتا ہے، جن کی حیثیت غیر واضح تاثرات کی ہے جو شاعر کے تجربات کے سیاق و سباق کی حدوں کو متعین نہیں کرتے۔ ظفر اقبال نے اپنے مُعاصرین کے برعکس معانی آفرینی کے لیے ایک نظم گو کا رویّہ اختیار کیا ہے۔

اُکھڑے اُکھڑے طریقے سے بات کرنے کے بجائے مربوط اور مُسلسل طرزِ احساس کی بدولت اُس نے غزل میں معنوی تسلسل کے تصوّر کو تقویت دی ہے۔ وہ تجربے کی معنوی اکائی کی تشکیل غزل کی صورت میں کرتا ہے۔ ظفر اقبال مختلف انداز سے معانی آفرینی کرتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف تضادات کو اور حقائق کو ایک دوسرے کے رُوبرو کر کے مضحکہ خیز صورت پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک متوسط طبقے کے فرد کی نگاہ سے دیکھتا ہے جسے بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی باتیں زیادہ اہم معلوم ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال کا رویّہ کسی قدر تشویش ناک بھی ہے۔ صنعتی شہر کی زندگی کے بارے میں اُس کا رویّہ ایک منفصل کے باشندے کا ہے، کیوں کہ وہ شہر میں بھی اپنی انفرادیت کی حفاظت چاہتا ہے۔ آج کل کی زندگی کے مسائل لسّی کے بعد کھٹے ڈکاروں، چھوٹے چھوٹے ممبروں اور اوکاڑے کے امرودوں سے زیادہ اہم ہیں۔ ظفر اقبال کو ابھی صنعتی کلچر سے پیدا شدہ انسانی صورتِ حال میں سے عظیم تر معنویت کا سفر کرنا ہے۔

'رطب و یابس' من حیث المجموعی ایک تر و تازہ اور توانا شعری مجموعہ ہے جو جاندار ادبی ادب کی

توانائی کا حامل ہے، اور جس میں اعلیٰ ادب کے امکانات بھی مُضمر ہیں۔

ظفر اقبال بے حد انفرادی شاعر ہے۔ 1947ء کے بعد کے اُردو غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے ساتھ ساتھ ظفر اقبال نے اپنے تجربات کی حدود اس طرح مُتعیّن کی ہیں کہ ان کی انفرادیت اُس تک مختص نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر اجتہادی شاعر ہے جو نقالی یا روایت کے مسخ تصور کی لکیر پیٹنے کے بجائے اپنے شعور کی بے باکی پر یقین رکھتا ہے۔ اُس نے اپنی انفرادیت کی تشکیل میں غزل کی زبان کو یکسر بدل دیا اور افتخار جالب کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ اُس نے الفاظ کا عوامی رشتہ مُنقطع کر کے زبان سازی کی ہے۔ ظفر اقبال نے اس کے برعکس مقامی لہجوں اور زبان کے عموی معانی کی اس طرح قلب ماہیت کی ہے کہ عموی معانی سیاق و سباق کی بدولت خصوصی اور انفرادی بن گئے ہیں۔ 'رطب و یابس' غزل میں نئی معنویت کی تلاش ہے۔ یہ تلاش محض تجربہ نہیں ہے، ایک مُسلّم قدم ہے۔ 'رطب و یابس' کے حوالے سے جدید اُردو غزل کا ایک واضح تصوّر قائم ہوتا ہے کہ نئی غزل کی تعمیر کے لیے غزل کے تجرباتی اور لسانی اُسلوب سے انحراف کی ضرورت ہے۔ ایک کے بجائے تمام جذبات کے تجربات کو اس میدان میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ غزل کے گھٹے ہوئے علائم و رموز کو آزادی دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے معروضی علائق قائم ہو سکیں۔ نئی غزل میں فکرِ مُسلسل کی ضرورت ہے۔ نئی غزل کے لیے مابعد الطبیعیاتی نظام سے انحراف کی ضرورت ہے۔ ظفر اقبال نے ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ اس حد تک کہا جا سکتا ہے کہ اس شعری مجموعہ کے بغیر جدید غزل کا تصوّر تشنہ رہتا ہے۔ 'رطب و یابس' نئی غزل کا دستور العمل ہے جس کے عناصر غزل کی مُروّجہ روایت سے انحراف اور انکار سے جنم لیتے ہیں۔

انیس ناگی

(مصنف کے مجموعہ مضامین "تصوّرات" سے ماخوذ)

کاوش سجیدی کہ بہرِ قتلِ معنی یک قلم
جلوۂ کِلکِ و رقم دار و رسن خواہد شدن
چشمِ کور آئینۂ دعوئ بہ کف خواہد گرفت
دستِ شل مشاطۂ زُلفِ سخن خواہد شدن

(غالب)

وہ تو اپنا تھا، یہ دھوکا اُسے کیا دینا تھا
میں نہیں ہوں، اُسے پہلے ہی بتا دینا تھا

میں جو ہوتا بھی تو اس تند ہوا نے مجھ کو
خس و خاشاک کے ہمراہ اُڑا دینا تھا

نقش کہہ کر کسی دیوار میں جڑتے نہ اگر
لفظ کر کے کسی مصرع میں پھنسا دینا تھا

سطح پر جم گیا خود برف کی صورت آخر
جس نے ٹھہرے ہوئے پانی کو چلا دینا تھا

پانو پھر روک دیے حیرتِ منظر نے مرے
یعنی، دیوار کو رستے سے ہٹا دینا تھا

بے نشاں ہوں، مگر اتنا سا ہے پچھتاوا بھی
داغ مٹتا ہوا اُس کو بھی دکھا دینا تھا

بھرے بازار میں پھرتا تھا کھلے مُنہ اُس نے
دیکھ کر میری جھلک پردہ گرا دینا تھا

میں بھی تیار تھا سڑکوں پہ بکھر جانے کو
اُس نے بھی دور سے رُومال ہلا دینا تھا

ظفر، افسانے سُنا جاتے ہو جس کے آ کر
تُم نے تو اُس کو مرے پاس بُلا دینا تھا

☆

نقش تھا جا بجا محمدؐ کا
منظر ایسا کھلا محمدؐ کا

نخلِ سبز پھر ہوا ہے بُلند
دشت پھر گونج اُٹھا محمدؐ کا

اور ہی طرح سے ہے عکس انداز
آئنہ ہے جُدا محمدؐ کا

موسموں پر فضا محمدؐ کی
خوشبُوؤں میں خلا محمدؐ کا

دن ہے سنگِ نشاں سفر کا اگر
رات ہے راستا محمدؐ کا

کچھ رگوں میں رواں لہو کی طرح
ہے کوئی خواب سا محمدؐ کا

دل میں اُڑتا بکھرتا رہتا ہے
رنگ صبح و مسا محمدؐ کا

وارث اُس کا نہ ہو سکا کوئی
تخت خالی رہا محمدؐ کا

کام بھی کوئی اُس طرح کا، ظفر
نام تو لے لیا محمدؐ کا

☆

ہوائے دل بھی نہ تھی ، موسمِ دُعا بھی نہ تھا
بدن پہ وقت کچھ ایسا کبھی پڑا بھی نہ تھا

بکھر گیا تھا ذرا سا وہ رنگِ راز ، تو اب
مجھے ہی فکر تھی ساری ، اُسے پتا بھی نہ تھا

چٹک کے پھول بنا اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ ایک بوسہ جو کچھ اتنا بے صدا بھی نہ تھا

ذرا سی جرأتِ رندانہ چاہیے تھی وہاں
بلند اب کے بہت خوشہ خطا بھی نہ تھا

اُسی کے خواب سے روشن ہے شامِ دشتِ ہوس
وہ داغِ عکسِ تماشا کہ جا بہ جا بھی نہ تھا

رواروی میں ہی خط اُس نے لکھ دیا ، ورنہ
اُداس مجھ سے جدا ہو کے وہ ذرا بھی نہ تھا

کھلی تھی آنکھ مری منظرِ نظر سے پرے
کھڑا تھا چوک میں اور کوئی راستہ بھی نہ تھا

وہاں اُچھال کے پھینکا تھا موجِ دل نے مجھے
جہاں سے خلق بھی غائب تھی اور خدا بھی نہ تھا

میں ایک سانس کی سلوٹ پہ مر رہا تھا ، ظفر
کہ میرے چاروں طرف ہالہ ہوا بھی نہ تھا

☆

میں ، یُوں تو نہیں ہے کہ محبت میں نہیں تھا
الوّٰہ کبھی اتنی مصیبت میں نہیں تھا

اسباب تو پیدا بھی ہوئے تھے ، مگر اب کے
اُس شوخ سے ملنا مری قسمت میں نہیں تھا

طے میں نے کیا دن کا سفر جس کی ہوس میں
دیکھا تو وہی رات ضیافت میں نہیں تھا

اک لہر تھی ، غائب تھی جو طوفان ہوا سے
اک لفظ تھا جو خط کی عبارت میں نہیں تھا

کیفیتیں ساری تھیں فقط ہجر تک اُس کے
میں سامنے آ کر کسی حالت میں نہیں تھا

بدلے گئے احساس کے انداز ہی اب کے
دریا کا بیاں دل کی حکایت میں نہیں تھا

بے ربط سا اک شور رہا شہر میں کچھ دن
میں تھا بھی یہاں پر تو حقیقت میں نہیں تھا

کیا رنگ تھے لہرائے جو بے راہروی میں
کیا نور تھا جو شمعِ ہدایت میں نہیں تھا

لغزش ہوئی کچھ مجھ سے بھی طغیانِ طلب میں
کچھ وہ بھی ، ظفر ، اپنی طبیعت میں نہیں تھا

☆

اب کے اُس بزم میں کچھ اپنا پتا بھی دینا
پانو پر پانو جو رکھنا تو دبا بھی دینا

یوں ہی اَن جان بنا رہتا ہے، دل کا احوال
لاکھ ظاہر بھی ہو چہرے سے، سنا بھی دینا

شب انکار ہے اور روشنی شعلۂ دل
ڈھب پہ آ جائے تو یہ شمع بجھا بھی دینا

آ نکلتا ہے اِدھر بھی، سو غنیمت ہے بہت
وہاں جانے کا گلہ تو اُسے کیا بھی دینا

اُس کی تائید تو کرنی ہی پڑے گی آخر
مُنھ سے جو کچھ بھی کہو، ہاتھ اُٹھا بھی دینا

دل کہاں ہے، کبھی اس شے کا لگانا بھی سُراغ
ہاتھ لگ جائے تو یہ خاک اُڑا بھی دینا

دشت دُشوار کو آسان بھی کرنا مجھ پہ
سانپ اگر راستہ روکے تو عصا بھی دینا

راستی پر ہُوں، مجھے اور بھی کرنا محکم
اور، اگر حرف غلط ہُوں تو مٹا بھی دینا

اِتنے چہروں میں اُسے ڈھونڈ ہی لیتے یُوں بھی
کیا ضروری تھا، ظفرؔ، اُس کو صدا بھی دینا

☆

گرم سفر ہے، بے سروسامان ہے تو کیا
انسان ہے تو کیا، جو بیابان ہے تو کیا

اس میں اگر کہیں نہیں اُگتی صدائے سبز
جنگل ہوائے درد کا گنجان ہے تو کیا

بُوجھے تو اُس بدن کی بجھارت کوئی، مگر
کچھ اور اتا پتا بھی ہو، سنسان ہے تو کیا

سینے میں اُس کے شوق کا موسم بدل سکے
مشکل ہے تو کسے کہیں، آسان ہے تو کیا

یُوں ہی رہے گی بند مہک عطر راز کی
اس کو یقیں بھی چاہیے، ایمان ہے تو کیا

اپنی تو ایک عمر گئی اضطراب میں
دو چار دن سے وہ بھی پریشان ہے تو کیا

گُذریں نہ کس گلی سے، جو گُذریں تو کس کے ساتھ
یہ حُکم ہے تو کس کا ہے، فرمان ہے تو کیا

میدان دوستی کا بھگوڑا ہے، چھوڑیے
صادق نسیم، فوج میں کپتان ہے تو کیا

ویسا تو کوئی بھی نہ تہی دست ہو، ظفرؔ
اب کچھ تو ہاتھ میں ہے، گریبان ہے تو کیا

☆

کیا علم تھا یُوں عکس نُما مُجھ کو ملے گا
آنکھوں کے عقب زار میں جا مُجھ کو ملے گا

شعلوں میں دھنک دھار رہی جس سے مُلاقات
شاخوں میں وہ ہم رنگِ ہوا مُجھ کو ملے گا

اے سنگِ بدن کیا ہُوں تری ہم سفری میں
رستے میں وہی نرم نوا مُجھ کو ملے گا

بکھرے گا مرے چاروں طرف دُھند کے مانند
سب سامنے اور سب سے جُدا مُجھ کو ملے گا

لرزے گا وُہی وہ ، مرے اندر ، مرے باہر
اِنکار کے موسم میں دوتا مُجھ کو ملے گا

بھُوکا نہیں اور خوانِ نعم ہے مری خاطر
پیاسا نہیں میں ، آبِ صفا مُجھ کو ملے گا

ویسی تھی مری طرز تو کیا چھین گیا مُجھ سے
ایسی ہو مری عرض تو کیا مُجھ کو ملے گا

رُوپوش رہوں شہرِ خطا میں کہ بہر طور
آ کے تو وُہی دشتِ سزا مُجھ کو ملے گا

مَیں ہُوں ، ظفر ، اوکاڑہ ہے اور خوف کی خوش بُو
دُشمن ہے تو پنڈی سے بھی آ مُجھ کو ملے گا

-☆-

شرح و شمار شوق کی حالت میں آئے گا
آیا تو اِک ادا سے عدالت میں آئے گا

دیکھے بھی ہوں گے سب نے وکالت کے معرکے
اب کے مزہ تو اُس کی اصالت میں آئے گا

کُچھ تازہ تر سوال اُٹھائے گا عشق بھی
کُچھ حُسن کا بیاں بھی طوالت میں آئے گا

ہو گا ہُجوم ہوش میں کُچھ وہ بھی موج مست
کُچھ مُدعی بھی جوشِ جہالت میں آئے گا

بحثِ وفا میں لائیں گے آدابِ عاشقی
اِک نکتہ یہ بھی درسِ دلالت میں آئے گا

پھُوٹے گا فردِ جُرم سے کُچھ رنگِ مصلحت
کُچھ ذکرِ خیر حرفِ خجالت میں آئے گا

نیچے کی توڑ پھوڑ کہ اوپر کی لُوٹ مار
کِس کا شمار ظلم و ضلالت میں آئے گا

ذرّاتِ زر کی طرح بکھر جائے گا یُونہی
یا داغِ دل ہوس کی کفالت میں آئے گا

اِک فتح اور اپنے مقدر میں ہے ، ظفر
اِک غزوہ اور اپنی رسالت میں آئے گا

-☆☆-

کھلا بھی موسمِ جاں ، قرضِ دل ادا بھی ہوا
جو کام عہدِ ہوس میں نہ ہو سکا ، بھی ہوا

نہاں جو رنگِ رواں تھا سکوتِ صحرا میں
اُسی کا جلوہ سرِ ساحلِ صدا بھی ہوا

بساطِ مدرسہ اُس نے لپیٹ دی آخر
کہ تھا وہ روشنیِ طبع سے ڈرا بھی ہوا

لُٹا ہے رنجِ سفر عکسِ عافیت کے سبب
متاع بھی گئی ، نقصانِ بوریا بھی ہوا

بچا سکے کوئی آنکھیں کہاں بکھرنے سے
کبھی تو اُس کی طرف ہم نے دیکھنا بھی ہوا

وہ مجھ کو چھوڑنے آیا تھا دُور تک ، لیکن
ملا تھا جیسے ، اُسی ناز سے جُدا بھی ہوا

جہاں کہیں بھی ہے وہ ، خُوش رہے ، وہ ہے تو سہی
اگر نہیں ہے مرے رُوبرُو تو کیا بھی ہوا

کہیں ٹھہر تو سہی اے دلِ تنگ تعبیر
مقابل اب کے تو اک خوابِ خُوش نما بھی ہوا

اُڑے نہیں خس و خاشاک ابھی قفس کے ، ظفر
اگرچہ شہر میں ہنگامہ ہوا بھی ہوا

☆

قافلے کی بند گلیوں کا گداگر کر دیا
اُس نے کیسے کام پر مجھ کو مقرر کر دیا

ہم کئی تھے ، اور ہمارے راستے بھی تھے کئی
وہ اکیلا تھا سو اُس نے معرکہ سر کر دیا

جا بہ جا یہ ڈھول کے دھمّے ، دھوئیں کی دھاریاں
آسماں کا آئنہ کس نے مکدّر کر دیا

جس نے چوری کی تھی سو پچاس پر چھوڑا اُسے
جو سڑک پر جا رہا تھا اُس کو اندر کر دیا

چھت زمیں پر آ رہی ، نازک تھے شہتیر اس قدر
گر پڑی دیوار بھی ، ایسا پلستر کر دیا

روشنی اب راہ سے بھٹکا بھی دیتی ہے میاں
اُس کی آنکھوں کی چمک نے مجھ کو بے گھر کر دیا

رختِ خواب اُس کے سفر میں تھا مجھے کافی ، مگر
خارزارِ خوف نے چلنا ہی دوبھر کر دیا

میں نے خُود سے بھی چھپا رکھا تھا ، رنگِ رازِ دل
اُس کی طبعِ خام نے سب پر اُجاگر کر دیا

جھوٹ مُوٹ آخر گلے مل کر ، بہ زعمِ خُود ، ظفر
اگلا پچھلا سب حساب اُس نے برابر کر دیا

☆

توڑ ڈالیں سب حدیں اور مسئلہ حل کر دیا
خود بھی سودائی ہوئے ، اُس کو بھی پاگل کر دیا

ٹوٹ کر ابھی بدن سے وصل کی سرکش ہوا
ایک ہی جھونکے نے کیا جنگل میں منگل کر دیا

تحفۂ داغِ تماشا ہی سے ہم خوش تھے بہت
اب کے اُس نے عطر بھی رومال پر مل کر دیا

تھا ، مگر بارِ سفر اتنا نہ تھا پہلے کبھی
اک ذرا سی آرزو نے دل کو بوجھل کر دیا

ایک دُھندلے نقش نے صحرا کو بخشا اضطراب
ایک زیریں لہر نے دریا کو بے کل کر دیا

دیکھنا حسنِ کرامت ، اک نگاہِ نرم سے
پیرِ کامل نے مرے سونے کو پیتل کر دیا

قہقہوں کے شور میں انسان سایے رہ گئے
معجزوں کی مار نے لمحے کو ململ کر دیا

اُڑتے پھرتے سر میں رنگا رنگ ٹکڑے ابر کے
ایسے ٹکرائے کہ پیشانی کو جل تھل کر دیا

خاتم الشعرا ہمیں مانیں نہ مانیں وہ ، ظفر
شاعری کے دین کو ہم نے مکمل کر دیا

☆

پردے میں یوں تو پھول کھلا احتیاط کا
چرچا ہے شہر بھر میں اسی واردات کا

پھر آگ سے گزر کے مٹی ہے سیاہ بھوک
آٹا تنور میں نظر آیا پرات کا

مہلت ہی دی نہ اپنے دلِ شرپسند نے
پرہیز تھا اُسے تو بہت چھوت چھات کا

موڑا جو میں نے چہرہ، وہ سارا ہی مُڑ گیا
جیسے بنا ہُوا ہو کسی سخت دھات کا

وہ چار ہاتھ کھیلیے کھل کر بس اپنے ساتھ
ایسا نہیں خیال ہمیں جیت مات کا

سب روشنائی اُڑ گئی شب بھر میں ، کیا لکھیں
ڈھکنا کھلا رہا کہیں دل کی دوات کا

گھر بیچ کر ہی اب کے چکایا ہے قرضِ غم
ہم بوجھ کب سہار سکے اُس کی بات کا

کچھ ریت پھیلتی ہوئی صحرائے صبر کی
کچھ زور ٹوٹتا ہوا دریائے ذات کا

آنکھوں سے آتے جاتے، اُلجھتا ہے ، اے ظفر
دیوار پر لکھا ہُوا کچھ اُس کے ہاتھ کا

☆

دل کے صفحے پہ خوب چھاپا
اُس حُسن کا سانولا سراپا

کھینچے گی طُول یہ جُدائی
لائے گا رنگ یہ سیاپا

اندازے سب غلط ہی نکلے
گہرائی کو ڈوب کر ہی ناپا

بٹوے میرے کو لے اُڑا کون
ڈی سی آفس کے بس سٹاپا!

ہیں جیب میں اپنی دو رُپے ، اور
اُس کی قیمت ہے سبز پاپا

اُلٹا ہی لکھ گیا ہُوں ، یعنی
آپا دھاپی کو آپی دھاپا

بیوی باہر گئی کمانے
دن بھر وہ گھر میں دُھوپ تاپا

آدھا مصرع ہُوا برآمد
مارا ایڈیٹروں نے چھاپا

اتنا چُپ رہ کے بھی ظفر نے
بے وقت کا راگ ہی الاپا

-☆-

پڑا ہے دشتِ ابد میں ازل سے ایک اکلا
کوئی سہیل کیا چاہیے ، اُداس ہے اللہ

ہیں آسماں بھی کئی عرشِ آرزو کے سفر میں
ہُوا ہے راہ میں حائل ابھی تو فرشِ مُعلّی

پگھل پڑا دلِ سنگیں نہ جانے کس کے بلبلے
ہے اُس کی طرز انوکھی نہ اُس کا طور اولا

ابھی جو دیکھیں تو حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہے
وداع و وصل میں بھاری ہے چھیڑ چھاڑ کا پلّا

دُکانِ عشوہ فروشاں ہے مہماں کوئی دن کی
کہ کھال اُتارتے ہیں اور پھر دکھاتے ہیں کھلّا

نجات بھی نہیں اس پہ ، نشہ بھی اور کہیں ہے
فلک کی پھوڑ صراحی ، زمیں کا پھاڑ مُصلّی

اُمیدِ فصل ہو بنجر قدیم بیویوں سے کیا
گھروں کو چھوڑیئے اور کھیت میں اُگائیے غلّہ

جو اجتماعِ حریفاں میں سر پہ چڑھ کر بولے
کہاں وہ مجمعِ یاراں میں بیٹھتا ہے نچلا

دکھا کے اور ہی کچھ اب کہیں دلائے نہ کچھ اور
نیا ہے شہر ، ظفر ، اور ہوشیار ہے ولّا

-☆-

یاری ہے وہی، وہی ملاپا
آغاز ہو جس کا ڈھول ڈھمپا

میرے ہی لیے ہے کیوں یہ تاکید
اپنا بھی سمیٹ لُور لپا

ہے قابلِ دید چیز اب بھی
اُجڑا ہُوا حُسن کا بڑھاپا

نقال بڑا بڑا پڑا ہے
ہم لاکھ لگائیں اپنا ٹھپا

میری تو غزل تھی پھُسپھُسی ہی
اب آپ سُنائیں کوئی ٹپا

پاؤں کب شعر سے خلاصی
ڈالا اندھے نے خُوب جپھا

ٹانگیں توڑی ہیں ڈاکوؤں نے
سر میں بھی کھُلا ہُوا ہے کھپا

اِک ذرۂ مخری کی خاطر
چھانا ہے بدن کا چپا چپا

اُتنی ہی چھُٹی بھی ہو گی
جتنی ہے، ظفرؔ، وہ گول گپا

☆

ہے ساری مصیبتوں کا منبع
زخموں پہ تسلیوں کا پھمبا

چپ رہتے ہو اور زندہ بھی ہو
یہ بات ہے اور بھی اچنبھا

ووٹ اُس کے ہیں نقد نوٹ جس کے
قائم دائم کھڑا ہے کھمبا

وہ ہی ہیں یہ گاجریں خدا نے
رکھ ہاتھ میں صبح و شام رمبا

اِس شام کے سلسلے ہیں بے حد
اِس رات کا راستہ ہے لمبا

چلتی نہیں اب ہوا ہوس کی
کھلتا نہیں خواہشوں کا چمبا

چھائی تھی ایسی خشک سالی
چلتا تھا ساری رات بمبا

سو میل ابھی پڑا ہے ملتان
ملتان سے آگے ہے تلمبا

آیا تری لاش پر، ظفرؔ وہ
لے، عید کے بعد پھونک ٹھمبا

☆

کھایا کسی اور ہی نے میوہ
جس پیڑ کی ہم نے کی ہے سیوا

ٹکراؤ لہو کی لہر پہ ہو
رُوٹھے جسموں کا ہو منیوا

زندانی جیسی آرزو کو
جنگل کی ہوا ہے جان لیوا

دیکھے کوئی تُجھ کو بات کرتے
مُندری ترے ہونٹ، لفظ تھیوا

مرگی بھی دُور ہو گی اپنی
جیسے اپنا ہُوا منگیوا

انڈے ہوں چاہے سارے گندے
مُرغی کب چھوڑتی ہے سیوا

میں تو کافی کھپا چکا سر
اب تُم ہی لگاؤ کوئی ٹیوا

ج ونج ہے اور ہی غزل کی
جس روز سے یہ ہُوئی ہے بیوہ

اندر سے، ظفرؔ، ہُوں اور اگر، تو
بدلوں باہر سے بھی پہ بیوا

-☆-

مُجھ پہ وہ جمائے کیوں نہ دھوّا
مَیں ہی گھر میں ہُوں بے ہوّا

تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے
آدم کے لیے عذاب حوّا

کیا بات کریں کہ آج کل تو
بن جاتا ہے بات کا بتوّا

بھاگی وہ اپنے یار کے ساتھ
جس دن ہونا تھا بر دکھوّا

جذبات کی بھیڑ تھی کچھ ایسی
کھوے سے چھِل رہا تھا کھوّا

ڈرنے لگی عشق سے بھی اب وہ
ہتلاتی ہے ہوس کا ہوّا

اودھیا سی عورتیں ہیں اپنی
جنتی ہیں سال بعد پوّا

گاہک کی ہو گئی حجامت
تھا جیسے دُکان دار نوّا

انگشت نُما سبھی ہیں اُس پہ
ایسا ہے ظفرؔ سفید کوّا

-☆-

تمھی بتلاؤ ، کیا کیجے مداوا
بگڑ جائے اگر آوے کا آوا

عدالت ہے حکومت کی خود اپنی
حکومت پر کرے کیا کوئی دعویٰ

کجاوے میں پھنسی ہے اونٹ کی ٹانگ
دھنسا ہے اونٹ کے اندر کجاوا

محبت بھی ہے، موٹر کار بھی ہے
انھیں کچھ چاہیے اس کے علاوہ

بچا چلنے نہیں دیتے کسی کو
کہ روتے ہیں کہ ہے خالی ڈراوا

لڑائی رہ گئی کس بات کی اب
وہی ہے سبز جو ہوتا ہے ساوا

مجھے باہر کے انجیروں سے کیا کام
مجھے کافی ہے اندر کا ستاوا

بدن پر سبز، ہلکی سبز ، بھری
عقب میں گندمی ، گہرا نکلاوا

ابھی ہو ، اور ابھی بالکل نہیں ہو
ظفر ، شاعر ہو یا کوئی چھلاوا

☆

وہ دن میں ہی اس کو چھوڑ نستا
کیا تھا وہ ہیولہ ہوس سا

رنگت ہی بدل گئی بدن کی
جب سانپ نے پہلی بار ڈستا

اس کو ہی اگر نہیں ہے احساس
تم بھی کیوں کھینچتے ہو رستا

چپکی رہتی ہے چھیڑیے تو
آتا نہیں اس کو غصہ غصہ

دیتے ہیں ادھار اس دکاں پر
لیکن ذرا تولتے ہیں کُتا

اب بحث یہاں رکی ہے آ کر
منحو ہے بڑا کہ شیخ بستا

ڈھیلے ہیں پڑے ہوئے میاں تو
بیگم کا ابھی وہی ہے ٹھستا

پانی اتنا ملا کے اس نے
لسی کا بنا دیا ہے لَستا

کنکر پتھر کے قافیوں سے
کرتا ہے ظفر غزل مرصع

☆

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا
بن جائے گا بات کا بتنگا

خیر ، آپ بھی بدمعاش ہوں گے
میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

ہاں ، خواجہ سراؤں کی زباں میں
کہتے ہیں وہ شعر چوں چنگا

خصی ہوں خیال و خواب جن کے
دل کیوں نہ ہو اُن کا بے اُمنگا

کپڑے پہناؤں کیا سخن کو
سر پہ مرے آسماں ہے ننگا

بھگتو اب قارئین کو بھی
کیوں مفت میں لے لیا تھا پنگا

باہر کہیں جا کے خاک اُڑاؤں
گھر میں تو یہ رہی ہے گنگا

اپنی زد میں نہیں ابھی میں
اُس کا ہی ابھی کیا ہے کنگھا

ہوتا بھی ، ظفر ، نباہ کیوں کر
چھوٹا تھا پلنگ سے پچنگا

☆

عینک لیجے اگر بدلوا
روز آئے نظر نیا ہی جلوہ

کیوں کر کچھ کفران نعمت
اُترا ہی کیوں ہے من و سلویٰ

اندھے بھر کس لیے ہوئے ہو
کھانا ہی اگر نہیں تھا حلوہ

جس بات کو پی گئے ہیں فی الحال
اُس پر ہو کر رہے گا بلوا

ہاں ، بھیج کے روز اک نیا خط
جلدی گھر سے مجھے نکلوا

ہو اور تو کیا اُمید تجھ سے
بارے گل پھول ہی مسلوا

تسمہ تو ہے بوٹ کا سلامت
کیا ہے جو گھس چکا ہے تلوا

شاعر چھوٹا نہیں ہے اب وہ
علوی تھا آگے ، اب ہے علوا

سب کاٹھ کباڑ دیکھ لے وہ
رکھیے دروازۂ غزل وا

☆

دیر ہو جائے گی، نہا لیں اب
حسرتوں کا بھرا رکھا ہے ٹب

یہ لطیفہ سُنائیں گے سب کو
دشتِ دل میں کھلا ہے لالۂ لب

ہوس و عشق سے اُسے کیا کام
اور ہے اُس کی دوستی کا سبب

شاعری ہی شعار ہے، حضرت
یا کوئی دُوسرا بھی ہے کرتب

ہے، مگر کیوں ہے، کچھ نہیں معلوم
ساز بے ڈھنگ اور صدا بے ڈھب

یعنی تکلیف جب زیادہ ہو
کرب کو باندھ بیٹھتے ہیں کرب

اور اب کس طرح سے سمجھاؤں
بات ہے خود ہی بات کا مطلب

موت اگر آپ کو نہ دکھلاؤں
آپ زحمت قبولتے ہیں کب

جان چھڑواؤ اس غزل سے بھی
لکھو مقطع، ظفر، نکالو سب

-☆-

میں نے پوچھا تھا، ہے کوئی اسکوپ؟
مُسکرا کر کہا گیا، نو ہوپ

کہا کبھی خوف بھی خُدا کا کچھ
خالی الزام میرے سر پہ نہ تھوپ

جس کی املا بتائی تھی ہم کو
کون سا لفظ تھا وہ، ریپ کہ روپ؟

دو سے تقسیم کر دیا ہے مجھے
پیچھے بیوی ہے، آگے بائیسکوپ

چائے تھوڑی نکالنی ہو گی
اتنا بھر کر دیا نہ کیجیے کوپ

پھر سے لکھوائیں، ایک بال صفا
تین بنیان، چار ٹائلٹ سوپ

ہم بھی مر جائیں گے کبھی نہ کبھی
جس طرح مر گیا بچارا گوپ

دھوپ سے کچھ بچاؤ رہتا ہے
سر پہ رکھتے ہیں شاعری کا ٹوپ

اب تو رکھی ہے دیکھنے کے لیے
کبھی چلتی بھی تھی، ظفر، یہ توپ

-☆-

دل میں ہوتی ہے خلا کی آہٹ
خاک پر چھائی فضا کی آہٹ

پھیل جاتے ہی دھواں آنکھوں میں
کان پڑتی ہے گھٹا کی آہٹ

سانپ سا سر میں سرکتا ہے کبھی
کبھی آتی ہے عصا کی آہٹ

کھل گئے گھر کے سبھی دروازے
آئی جب سیلِ بلا کی آہٹ

منظرِ سحرِ خزاں کے پیچھے
کھو گئی سبز ہوا کی آہٹ

سفرِ شوق کے آغاز میں ہی
آئے گی لغزشِ پا کی آہٹ

بھاگ اٹھتے ہیں گجا دیوانے
اور ہوتی ہے گجا کی آہٹ

موسمِ قحطِ ہوا میں کبھی سن
لرزشِ برگِ نوا کی آہٹ

خلق ہیبت زدہ سنتی ہے، ظفر
آسمانوں پہ خدا کی آہٹ

☆

ہمیں بھی مطلب و معنی کی جستجو ہے بہت
حریفِ حرف، مگر، اب کے ڈو بہ ڈو ہے بہت

وقار گھر کی تواضع ہی پر نہیں موقوف
بہ فیضِ شاعری باہر بھی آبرو ہے بہت

پھٹے پرانے دلوں کی خبر نہیں لیتا
اگرچہ جانتا ہے حاجتِ رفو ہے بہت

بدن کا سارا لہو کھینچ کے آ گیا رخ پر
وہ، ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخرو ہے بہت

ادھر ادھر یوں ہی منہ مارتے بھی ہیں، لیکن
یہ مانتے بھی ہیں دل سے کہ ہم کو تو ہے بہت

اب اس کی دید محبت نہیں، ضرورت ہے
کہ اس سے مل کے بچھڑنے کی آرزو ہے بہت

یہی ہے بے سر و پا بات کہنے کا موقع
پتا چلے گا کسے، شور چار سو ہے بہت

یہ حال ہے تو بدن کو بچائیے کب تک
صدا میں دھوپ بہت ہے، لہو میں لو ہے بہت

یہی ہے فکر، کہیں مان ہی نہ جائیں، ظفر
ہمارے معجزۂ فن پہ گفتگو ہے بہت

☆

نہیں ایسا کہ ہر ہنر ہے عبث
شاعری واعری مگر ہے عبث

غم کے اوقات ہو گئے تبدیل
شام ہے رائگاں، سحر ہے عبث

دل سے اُٹھتا نہیں دھواں بھی یہاں
خرمنِ خاک میں شرر ہے عبث

نالہ نارسا بھی ہے بے سُود
جس طرح آہ بے اثر ہے عبث

اُس کے اِنکار کا نشہ ہے ابھی
اُس کے اِقرار کی خبر ہے عبث

خوف اپنے سے بچ سکو تو بچو
عشق میں دُوسروں کا ڈر ہے عبث

اور ڈھونڈو کوئی علاج اُس کا
لبِ لرزان و چشمِ تر ہے عبث

کہیں صُورت نکالیے کوئی
اس طرح تو گزر بسر ہے عبث

اسے پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے
اے ظفر، کام یہ اگر ہے عبث

☆

اور تو کچھ ہے آج کام نہ کاج
پُوچھیے چل کے شاعری کے مزاج

روز تقریر کرتی ہے چھلنی
دیکھیے بولتا ہے کس دن چھاج

اور تو مانتا نہیں کوئی
آپ ہی اپنے سر پہ رکھیے تاج

کبھی قالین بھی بچھائیں گے
اب تو اس زرد گھاس پر ہی براج

کیوں نکلتا ہے بار بار بٹن
کچھ کھلا رہ گیا ہے شاید کاج

خُوب ہے کل کے ساتھ سونے سے
بوسہ ایک آدھ ہی سہی، پر آج

بھلا آگے وہ پُوچھتے کب تھے
اب جو فہرست سے ہُوا اخراج

اُس ڈلی کے تو ہم نہیں گاہک
اس گھڑی کا بتایئے، الحاج

اب کہاں جائیے گا، جانِ ظفر
ہوتی جاتی ہے گھڑی بھی رواج

☆

قید کے قہر میں نجات کی آنچ
آئی خود سے عجابات کی آنچ

زر دل سے پناہ مانگتا ہوں
خاک کے درمیاں ہے وحات کی آنچ

گرمیِ خواب خوں ہے آنکھوں میں
دن میں شامل ہوئی ہے رات کی آنچ

رُوح کی روشنائی سُوکھ گئی
تھی قلم سے سوا دوات کی آنچ

بھڑک اٹھے ہیں لعلِ سُرخ بہت
تپشِ بوسہ ہے کہ بات کی آنچ

ایک نے خاک کر دیا سب کچھ
گھر میں ہوتی جو پانچ سات کی آنچ

کچھ ٹھہرتا نہیں ہتھیلی پر
لے مرے گی ہمیں یہ ہاتھ کی آنچ

رُک نہ جائے کہیں رگوں میں لہو
نرم تر ہے تعلقات کی آنچ

یہ غزل خام رہ گئی ہے، ظفر
دے اسے اور ایک ذات کی آنچ

☆

سُن لے بس ایک بات ستم گر کسی طرح
گھر سے نکل کے آئے وہ باہر کسی طرح

ہر روز کھینچ لیتا ہے دیوار وہ بھی ایک
اور مَیں بھی دیکھ لیتا ہوں اندر کسی طرح

آیا نہیں ہے عکس بہت صاف اب کی بار
آئنہ ہو گیا ہے مکدّر کسی طرح

دن بھر اُڑا کیے مرے ذرّات ہر طرف
ہونے کو آئی شام، چلوں گھر کسی طرح

دل سے نکل سکے یہ تمنا کسی سبب
آنکھوں کو بھول جائے وہ منظر کسی طرح

بُجھنے لگا بدن میں بدی کا چراغ بھی
یہ رات ہو سکی نہ منوّر کسی طرح

مدّت سے حسرتوں کی کمائی پہ ہے پڑا
یہ دل کہ مانتا نہیں کنجر کسی طرح

یعنی حسابِ عشق و ہوس پاک ہو کہیں
یعنی بپا تو کیجیے محشر کسی طرح

طولِ سفر ہی قطعِ سفر ہو، اگر ظفر
وہ شوخ بیٹھ جائے برابر کسی طرح

☆

روز بکتی ہے شاعری کی بلخ
خوب نشب خون کا چلا مطبخ

قبر میں بھی رہے گی مشقِ سخن
داد گر ہوں گے اپنے مُور و ملخ

فرق دونوں میں کچھ نہ کچھ ہو گا
ورنہ نس کو ہی لوگ کہتے نخ

زور دے کر کہا گیا، یعنی
زندگی ہو گئی ہے اتنی تلخ

رائے اُس کی ہی آخری ٹھہری
جس نے مریخ کو پڑھا مریخ

کہیں پہنچائے یا نہ پہنچائے
ہوتی رہتی تو ہے مگر فخ فخ

آگ سا تپ رہا تھا وہ چہرہ
اور، تھے ہاتھ اُس کے ٹھنڈے یخ

ٹانگ ٹوٹی وہاں کہ دل ٹوٹا
ہو رہی تھی بہت چٹاخ چخ

یُوں تو سُنتا نہیں وہ بات ظفر
لکھ غزل اور سر پہ اُس کے پٹخ

☆

کھلائیں اُس کو اوکاڑے کے امرود
اگر آئے صلاح الدین محمود

اگر فرمائیں تو ڈھاکے سے منگوائیں
یہاں پکتا نہیں حلوائے بے دود

وہیں کے ہو رہیں اب اہلِ ایماں
کہ راہیں مَیں نے کر رکھی ہیں مسدود

الٹوانی کہوں تو کچھ اثر ہو
کہ سیدھی بات اب کہنا ہے بے سُود

مضامیں چاہییں اعلیٰ سخن میں
سخن میں شاعری بے شک ہو مفقود

کوئی ترکیب، کوئی استعارہ
جو کچھ ہو جائے بے چاروں کی بہبود

بھٹکنا بھی ضروری ہے نظر کا
کیا ہے آپ نے منظر کو محدود

بھٹکتا ہے ہوس کے دشت و در میں
وہی اُس کا لبِ انکار آلود

ظفر، اس در گزر سے اب گزر بھی
کہیں اس طرح بھی مرتا ہے مردود

☆

سوچیے شعر کا نیا کوئی کوڈ
ہاتھ چلتا نہیں ہے یہ بھی موڈ

گاڑی اتنی نہیں پرانی بھی
بات کیا ہے جو کھینچتی نہیں لوڈ

سخت ہے، ٹوٹتا نہیں اُن سے
کیوں نہ اخروٹ کو لکھوں اخروڈ

نام ابھی یاد ہے مجھے اپنا
احتیاطاً لگا رکھا ہے بورڈ

اکنامکس پر بھی شاید کچھ
لکھ گئے ہیں جناب سی۔ ایم۔ جوڈ

جب بھی شہزاد ہم کو یاد آیا
ساتھ یاد آئی اُس کی بسنت روڈ

آپ تو ہیں ملے جلے سیّد
ہم بہ فضلِ خدا ہیں خالص اوڈ

کوئی گڑبڑ اگر نہیں ہے کہیں
ساتھ رکھتے ہو کیوں بھلا یہ کموڈ

اور بھی کوئی کام کار، ظفر
ہو چکی شاعری بہت، اب چھوڑ

☆

ہو گیا خوف پر خطر نافذ
یعنی باہر پہ بھی ہے گھر نافذ

اُس نے کر ہی دیا تو کیا کیجے
آپ کو مجھ غریب پر نافذ

خاک پر ہو گئی ہوا ناظم
بُرجوں پر ہوا شرر نافذ

لوگ اس سے ذرا بدکتے ہیں
کیجیے اور کوئی خر نافذ

سوچنا بھی ہو واجبِ تعزیر
کوئی قانون ایسا کر نافذ

یعنی آدابِ عاشقی ہم پر
کیجیے، پر نہ اس قدر نافذ

دل کا فرمان ہی ہوا جاری
جسم پر ہو سکا نہ سر نافذ

کیا ملے کوئی گوشۂ تنہا
شام سے ہو چلی سحر نافذ

غدر اقلیمِ شعر میں پھیلا
ہوئے جس روز سے ظفر نافذ

☆

قتل و غارت میں ہی گنوا اتوار
خاک تھی اور خاک کی تلوار

کچھ ہمیں تنگ بھی کیا اُس نے
اور کچھ آدمی تھے ہم بھی گنوار

ستر پوشی ہے قافیہ بندی
ہاں، ذرا کس کے باندھیے شلوار

ایک بوسہ، ہوائی سا وہ بھی،
اس سے کس کس کو دیجیے نسوار

ڈھونڈ کر دیکھ لیں، اگر مل جائے
کوئی ہم سے زیادہ نیک اطوار

شعر کہنے سے پہلے شاعری کے
اُنھیں گن کر بتائیے ادوار

کام کتنوں ہی کا تمام ہُوا
جب بھی اوچھا پڑا زُبان کا وار

یعنی لکھ دی اُسی طرح کی غزل
ہو گیا جس طرح کا بھوت سوار

کام بگڑے بنے بنائے، ظفر
عجلتِ عشق پہ خدا کی سنوار

☆

کرتا ہوں جمع خود کو بکھرنے کے نام پر
جیتا ہوں اس نواح میں مرنے کے نام پر

صحرا کی ریت اُن کی رگوں میں رواں ہے اب
جو پھنس گئے تھے پار اُترنے کے نام پر

آواز دب گئی ہے اُبھرنے کی آڑ میں
طوفان سو گیا ہے بپھرنے کے نام پر

اُلجھے گی بات اور سُلجھنے کی سعی میں
بگڑیں گے کام اور، سنورنے کے نام پر

اس بحر کا نشیب و فراز ایک ہے، یونہی
ڈوبا کرے گی خلق اُبھرنے کے نام پر

یاروں کو کچھ فریب بھی دینا پڑا مجھے
طے یہ سفر کیا ہے ٹھہرنے کے نام پر

ساری فلاح، ساری فضیلت مجھے ملی
اس دل کے راستے سے گزرنے کے نام پر

ویسے بھی دھوپ تیز تھی اُس کوہسار کی
بھڑکی تھی پیاس اور بھی جھرنے کے نام پر

پڑتا ہے کچھ ہنر بھی بُرائی میں، اے ظفر
کرتا ہوں سارے کام نہ کرنے کے نام پر

☆

کہے گا وصل اس کو کون کنجر
ہوا ڈھیلا کوئی اَنجر نہ پنجر

اگر اُگتی نہیں خواہش تو سُن لو
زمینِ جسم ہے بے کار ، بنجر

جہاں تازہ لہو کی آنچ آئی
لپک کر نیام سے نکلے گا خنجر

پڑا ہے ٹیوب ویل پھر دیر سے بند
بدلوانا پڑے شاید پنجر

ذرا رُک کر پڑھو اس گانو کا بورڈ
کہ ہنجروال ہے یا وال ہنجر

ہوئی صحت رعایا کی ذرا ٹھیک
پڑے بیمار جب سلطان ہنجر

دلوں کا ہاضمہ بگڑا ہے اب کے
یہاں کام آئے گا سوڈا نہ جنجر

رگوں میں ناچتی ہے ایک چوہیا
چھنک چھن چھن چھنن چھن چھن چھنجر

ظفر، اندر سے میں بھی جل چکا ہوں
مگر وہ تو ہے اب بالکل ہی بھنجر

☆

نہ چمکی اُس بدن کی دھوپ دم بھر
رگوں میں جم گیا سارا دسمبر

میاں دورے پہ جائیں یا نہ جائیں
کرو مل بیٹھنے کا کچھ اڈمبر

کہا کس کا تو آخر مانتی ہے
کوئی ہے بھی ترا پیر و پیمبر

نشے میں بھائی پھیرو آن پہنچے
ہمیں ویسے اتر جانا تھا جمبر

اُسے بھی کھینچ کر باہر نکالو
چھپا ہے مولوی بھی زیرِ منبر

سروں پر ٹوٹ کر گرتا نہیں کیوں
ہمارا آسماں ، بھارت کا امبر

اُنھوں نے پھاڑ پھینکا ڈائری سے
وہ صفحہ جس پہ آیا چھ ستمبر

جلا لیتے ہیں کچھ دل کا لہو ہم
یہی اپنے لیے ہے عود و عنبر

مرا بیٹھا ہوں ، دیکھیں کب نکالیں
''سویرا'' کا ظفر اقبال نمبر

☆

رہتے ہو مُضطر
آخر کیا ہے چکّر

دھندا کار میں چھکڑا
ہوئی ہے ایسی ٹکّر

کچھ نایاب ہیں بوسے
کچھ مہنگی ہے شکّر

اس طوفانِ ہوس میں
کبھی تو ہم کو پکّر

خالی رکھوں دل کی
کوئی ٹھکّر ٹکّر

چھاتی سے بھی لگایا
گئی نہ اُس کی اکڑ

وہ تو گئی ہے میکے
کیوں بیٹھے ہو دبک کر

جم گئے سارے جذبے
پڑا ہے ایسا کُکّر

بچ نکلی وہ ظفر سے
کیسا ہے یہ مُقدّر

☆

پڑ گئی ککڑی ، کُلّو
ککڑی تھی یا مٹّو

بھولی تھی صورت سے
اندر سے تھی پٹّو

مطلع سُن کر بولی
بند کرو یہ پھکّڑ

ظفر ہے لاہوری
اسی لیے ہے پھکّو

پڑ گئی میرے پیچھے
لیے ہاتھ میں لٹّو

ٹکتا ہے ہر مصرع
لگا ہوا ہے ٹکّو

آخر پاگل جانے
پہنچا بُوجھ بجھکّو

اُڑے دلوں کے پُرزے
رات چلا وہ جھکّو

چھوڑو بات ظفر کی
مار رہا ہے بکّو

☆

گرتے ہوئے ہاتھ ، گرتی آواز
گر کر نہ اُٹھے دُعاؤں کے راز

اوپر نیچے ہوئے ہیں گڈ مڈ
ساز و آواز و ناز و انداز

زندہ ہے سیاہ و سُرخ لذّت
بے مُت ، بے جان ہیں بدن باز

اُس حُسن کی کیفیت الگ تھی
انجام کے بعد تھا وہ آغاز

خنجر کی چمک تھی اُس بدن میں
دراصل نیام تھی وہ پشواز

اک عُمر سے منتظر کھڑا ہُوں
مُنہ سے کچھ پھوٹتے یہ الفاظ

اب تیر نکل چکا کماں سے
اِنکار کو لکھ گیا ہُوں اِنکاز

یہ شعر بھی فالتو سمجھیے
ہُوں آپ کے باوجُود تجاز

ہو جائے ظفر یہ قافیہ بھی
ہو لیں کچھ اور بھی وہ ناراض

☆

چیزیں اچھی ہیں دونوں ، پوڈر ، زوش
اور پھر دونوں میں ہے بجتر زوش

کون سا ہو پسند ، بندھوا لیں
سامنے ہے جناب کے ہر زوش

خیر کوئی کہاں گوارتا ہے
ہو جسے جس قدر مُیسّر زوش

اُس کی اپنی بہار ، اپنے گلاب
رنگِ لب کے ہُوا برابر زوش

تُو تو دانا ہے آپ ہی ، یعنی
ساتھ بھی اپنے کچھ رکھا کر زوش

میں تو اندر پڑا ہُوں ، جانِ عزیز
کسے دکھلایئے گا باہر زوش

عُمر کا کیا تقاضہ ہے یہاں
دُور کر دے گا سب وِلدّر زوش

ہاں ، اگر آپ دیکھ سکتے ہوں
کھُردرے لفظ کے ہے اندر زوش

داغ وجتے نہ چھپ سکیں گے ، ظفر
شاعری کے مَلو نہ مُنہ پہ زوش

☆

نیلے نشے کی ٹوٹ میں چمکا وہ برق وش
سالم سرور دے گیا بوسے کا نصف کش

نقطے ہیں پورے، صرف تلفظ کا پھیر ہے
پھر بھی قبول کرنے میں اُن کو ہے پیں و پش

کل شاہ راہِ شوق پہ ٹریفک رُکا رہا
کچھ بڑھ چلا تھا ایسا غلط خواہشوں کا رش

ایسا کہاں تھا آگے حریفوں کا زور شور
آخر کو رنگ لائی مری اُس کی چپقلش

بیگم دہاڑتی ہیں اُدھر، ناشتے پہ آؤ!
اور، میں غریب اِدھر ابھی کرنے لگا ہوں برش

بہتر تو ہے یہاں سے بھی اب کوچ کیجیے
دو دن میں عام ہو گئی جو خاص تھی رَوِش

آگے بھی بے لگام نہ پھرتے تھے ہم کبھی
پر اب تو بات بات پہ ہوتی ہے سرزنش

تفسیرِ دل لکھوں تو چڑھاتے ہیں ناک بھوں
کاری گری دکھاؤں تو کرتے ہیں عش عش

کچھ اس غزل میں قحطِ قوافی بھی تھا، ظفر
باندھا سخن کے پیٹ پہ پتھر ہی آخرش

☆

دودھ دے گی نہیں ہمیشہ بھینس
ساتھ اب کے ردیف رکھنا بھینس

صرف اُدھڑی ہوئی زمیں تھی وہاں
غیر حاضر تھے دونوں، بھینسا، بھینس

دل کے سایوں میں سوئی رہتی ہے
ہے ترے وصل کی تمنا بھینس

میم صاحب نے بھی دیا فتویٰ
جس کا لاٹھی اِدھر اُسی کا بھینس

لڑتے رہتے ہیں کٹڑیاں کٹڑے
دیکھتی رہتی ہے تماشا بھینس

پاڑو ہیں کہ فاڑو، مت پوچھ
میں، کبوتر، چکور، کتا، بھینس

لیا آتے ہی اُس نے سینگوں پر
اب کہو عقل ہے بڑی یا بھینس

آپ ہلتی نہیں ہو بستر سے
اور کہتی ہو مجھ کو اُلٹا بھینس

بین جب سے بجا رہا ہوں، ظفر
میرے چاروں طرف ہے کیا کیا بھینس

☆

جن کے رہتا ہے خود بیان میں نقص
کھوجتے ہیں مری زبان میں نقص

تھے بہت وہ بھی نیند کے ماتے
اور تھا اپنی بھی اذان میں نقص

آنکھ سے دیکھتا ہوں سنتا بھی
جب سے پیدا ہوا ہے کان میں نقص

تیر لگنے لگا نشانے پہ
پڑ گیا کیا کوئی کمان میں نقص

صاف جب تک کہ خود نہیں ہوتے
نظر آئے گا اک جہان میں نقص

دل میں وہ میہماں نہیں ہوتا
رہ گیا کیا کہیں مکان میں نقص

ذائقہ منہ کا ہے خراب اب تک
تھا کوئی اس کے پان دان میں نقص

نام دس بیس اگر نہ بکوائے
آئے نقاد کی دکان میں نقص

دھوپ اندر کی تیز تر ہے، ظفر
کیا بتاتے ہو سائبان میں نقص

☆

کچھ ہوئے خوفِ خطا سے ناراض
اور باقی ہیں سزا سے ناراض

برگ و بار اپنے پہ قابو ہی نہ تھا
اور رہتے تھے ہوا سے ناراض

آنکھ بیزار ہے منظر سے بہت
کان ہیں سیلِ صدا سے ناراض

ایک ہے اپنے لیے ردّ و قبول
ہم کہ ہیں دستِ دعا سے ناراض

کیا ہمیں زعمِ کلیمی ہو یہاں
ہم کہ پھرتے ہیں عصا سے ناراض

نقش خود مست ہے، لیکن ہے ابھی
عکس آئینہ نما سے ناراض

بحر ہے آبِ گہر سے ناخوش
دشت نقشِ کفِ پا سے ناراض

ظلمتِ شوق میں سونے والے
ہوئے اک ضربِ ضیا سے ناراض

خوب اپنی بھی گزرتی ہے، ظفر
خلق سے بیر، خدا سے ناراض

☆

کب سے بے کار ہو، سلیم و ریاض
کام کوئی کرو، سلیم و ریاض

پرچہ اپنا نکالتے نہیں کیوں
کچھ خدا سے ڈرو، سلیم و ریاض

کھو گئی ہے کتاب مجھ سے، اب
آپ فرمائیں جو، سلیم و ریاض

جلد بھیجوں گا حلوۂ موعود
منہ ذرا دھو رکھو، سلیم و ریاض

چائے منگوائیے، صلاح الدین
کھڑکیاں کھول دو، سلیم و ریاض

واؤ ہیں تین، آدمی ہیں چار
تابش و زاہد و سلیم و ریاض

اور کیا چاہیے اگر مل جائیں
راہ میں ایک دو سلیم و ریاض

گن کے بتلائیے کہ ہیں کتنے
یعنی میں، آپ، وہ، سلیم و ریاض

جب وہ کہتا ہے اے ظفر اقبال
میں سمجھتا ہوں او سلیم و ریاض

☆

سفر میں نہیں میں ہی تنہا غلط
یہ صحرا ہے مجھ سے زیادہ غلط

کچھ اندازہ اپنا ہی نکلا غلط
کہ طوفاں غلط تھا نہ دریا غلط

درستی کی اُمید کیا کیجیے
یہاں پر ہے کیا جانے کیا کیا غلط

بھٹکتا نہ میں دشتِ دل میں کہیں
مگر تھا مرے پاس نقشہ غلط

لگی دیر پہچاننے میں اُسے
کہ گوری پہن کر وہ برقع غلط

سرِ راہ کچھ وہ بھی غصے میں تھی
کچھ اُس کا کہا میں بھی سمجھا غلط

عمارت بنے گی بہت لاجواب
ذرا سنگِ بنیاد رکھنا غلط

ہمیں کچھ نہیں چاہیے تھا مگر
سمجھتی رہی ہم کو دنیا غلط

مچی دھوم تو چار سُو، پر، ظفر
لگایا یہ ہم نے تماشا غلط

☆

خود سے آزاد ، خبر سے محفوظ
خیر سے دور ہوں ، شر سے محفوظ

اے خدا ، اب تو دعا ہے کہ مجھے
رکھیو عیب اور ہنر سے محفوظ

تم بھی سن لو کبھی آ کر ، کہ مرے
شعر ہوتے ہیں اثر سے محفوظ

کوئی گڑبڑ نہیں ہونے پاتی
رات رہتی ہے سحر سے محفوظ

نام بھی لوں نہ کبھی باہر کا
آج رہ جاؤں جو گھر سے محفوظ

کیا شب و روز تھے وہ بھی ، جب ہم
تھے زمین و زن و زر سے محفوظ

ٹوٹ سکتا نہیں جسموں کا جمود
خرمنِ خوں ہے شرر سے محفوظ

ہے تو بے کار سی اک چیز ، مگر
رہوں دل کے بھی ضرر سے محفوظ

دیکھنا یہ ہے کہ اب رہتے ہو
کتنے روز اور ظفر سے محفوظ

☆

رخت غم رایگاں ، سفر ضائع
ہو چکے دل کے دشت و در ضائع

گھر تو زیر و زبر ہوا سو ہوا
دیکھ ، باہر کو تو نہ کر ضائع

کسی پرواز بے مہار میں اب
کیجیے اپنے بال و پر ضائع

ہم نے معیار ہی بدل ڈالا
عیب محفوظ کر ، ہنر ضائع

شکر ہے جنگ میں بچا کچھ تو
پاؤں باقی ہیں اور سر ضائع

سود کے بے حساب لالچ میں
کر لیا ہم نے اصل زر ضائع

ایک اتوار طوعاً و کرہاً
کیجیے خاک سار پر ضائع

ایک لمحے کی پیش دستی سے
عمر بھر کا ہوا اثر ضائع

آپ نے اک فضول سی ضد میں
آخرش کر لیا ظفر ضائع

☆

اِس مکاں کو اُس مکیں سے ہے شرف
یعنی اک افواہ سی اُڑنے لگی ہے ہر طرف

یہ ہوا پُرزے اُڑا دے گی ہمارے
کاش کر لیتے وہ اپنے ساتھ لف

چور ہُوں، اور چور کا ہو کیا علاج
ماسوائے چند کف

کف پہ کف
صف پہ صف

وصل کا وعدہ وہ کتنی خوش دلی سے کر رہا تھا
ہم کو بھی معلوم تھا، کرتا ہے بلف

معترض کے مُنہ سے ہے کُتا بندھا
اِس لیے سُننا پڑے گی عف عف

ہاں! اگر رکھتے چلیں فن کے لوازم کا خیال
کام تو خاصا ہے مخف

خُوب ہے دیوان، لیکن
خُوب تر ہوتا اگر کُچھ حِصّہ کر دیتے حذف

نظرِ ثانی بھی کریں گے اِس غزل پر، اے ظفر
فی الحال تو لکھی ہے رف

-☆-

کوئی نکلا کہ آئے ہم ناحق
اُسے کھانا پڑی قسم ناحق

سر بچانا بھی شرط ہے، لیکن
وہاں رکھنا بھی ہے قدم ناحق

سب کی ہے اپنی اپنی مجبوری
کوئی کرتا نہیں ستم ناحق

مَیں تو اپنا ہدف ہوں آپ ہی خود
آپ کرتے ہیں مجھ سے رَم ناحق

شعر کہنے پہ اُن کو عذر نہیں
ورنہ یہ بھی نہیں تھا کم ناحق

ناسزا ہو سخن زباں پہ جہاں
کیوں نہ لکھے وہاں قلم ناحق

مَیں نہ لینے میں، اور نہ دینے میں
ناک میں کر دیا ہے دم ناحق

جب غرض درمیاں نہ ہو کوئی
کون کھائے کسی کا غم ناحق

کوئی پیرو اگر نہیں تھا، ظفرؔ
کیوں اُٹھائے پھرے عَلَم ناحق

☆

روح میں خاک، رہ گزار میں خاک
اُڑ رہی ہے مری غبار میں خاک

طے نہیں ہو گا یہ سیاہ سفر
بھر گئی فکر کے مدار میں خاک

کوئی صورت نہیں رہائی کی
قید ہے خاک کے حصار میں خاک

ڈوبتا ہی گیا مَیں آب در آب
نام کو تھی نہ خواب زار میں خاک

لے اُڑی برگ زار کو وہ ہوا
مِل گئی سارے کاروبار میں خاک

آتا اُس کا نظر نہ آئے گا یوں
ڈالیے چشمِ انتظار میں خاک

عکس اُس آئنے کا پڑتے ہی
چمک اُٹھی مری ہزار میں خاک

وہ گُلِ وصل تو کِھلا ہی نہ تھا
لطف آتا مجھے بہار میں خاک

چھا گئیں گرد کی گھٹائیں، ظفرؔ
تھی بہت میرے آر پار میں خاک

☆

سب خورد و خرید ہو مبارک
ہر دید و شنید ہو مبارک

ہم سب کی طرف سے آپ سب کو
یہ صبح سعید ہو مبارک

شمس الرحمٰن فاروقی
یہ رائے مزید ہو مبارک

جیسی بھی ہے شاعری ہماری
تم کو تنقید ہو مبارک

نیّر مسعود کے لیے بھی
تھوڑی سی عید ہو مبارک

عادل کیا سخت جان نکلا
اب کے جو شہید ہو ، مبارک

اِس خط کا جواب چاہتا ہوں
اُس خط کی رسید ہو مبارک

دیتے ہیں نوید وصل خود وہ
جو وعدہ وعید ہو ، مبارک

جینے کے نواح میں ظفر کو
مرنے کی اُمید ہو مبارک

☆

تیری خبر میں شعلہ شر ہے الگ
عیب ہے اپنا جدا ، اپنا ہنر ہے الگ

رُوح کو رکھتے ہیں قید ، رنگ سیاہ و سفید
تختیِ شام اور ہے ، بار سحر ہے الگ

بے ثمر و سایہ ہے ، یعنی شجر ہے عجیب
بے خس و خاشاک ہے ، یعنی شرر ہے الگ

زیر ہوس ہے رواں عکسِ اُفق پر ابھی
رُوئے فلک پر ابھی نیل نظر ہے الگ

سامنے آنے تو دو ، ہاتھ اُٹھانے تو دو
میرا اگر ہے حریف ، مجھ سے اگر ہے الگ

اور بھی ، آ کر ، بڑھی سادہ دلی حُسن کی
شہر کے ماحول کا اُس پہ اثر ہے الگ

خواب سفر ہی مرا زادِ سفر ہو تو ہو
دشت خطا خیز کا خوف و خطر ہے الگ

پھر سخن گرم سے خاک میں ہیں لرزشیں
بحر ہوا چار سُو زیر و زبر ہے الگ

جیل میں پھانسی کسے دی گئی ناحق ، ظفر
آج کے اخبار میں ایک خبر ہے الگ

☆

بہت قید کاٹی ہے ، گھر سے نکل
نکل ، اے شرر ، اب شجر سے نکل

بچھا ہے مرے جسم کا جال سا
وہیں میں کھڑا ہوں ، جدھر سے نکل

ابھی سادہ و صاف ہے لوحِ دل
کسی شام جیسی سحر سے نکل

وہ شے جس کا خطرہ ہے اتنا تجھے
اُسے پھینک دے اور خطر سے نکل

مصیبت کے ساحل کو بھی آزما
کبھی عافیت کے بھنور سے نکل

اُلٹ دے چراغ ہوس ہاتھ سے
پسِ مطلعِ منتظر سے نکل

بتاتا ہوں ساری کہانی تجھے
ذرا شہر کے شور و شر سے نکل

کھلے آب زاروں کی حسرت میں ہم
گئے گردبادِ ہنر سے نکل

یہاں اور بھی ذائقے ہیں ، ظفر
کبھی تو بھی اپنے اثر سے نکل

-☆-

سرگشتہ سراب تھے دشتِ صدا کے ہم
ایسے کہ خود بھٹک گئے رستا دکھا کے ہم

اب پول کھل بھی جائے اگر شہر میں تو کیا
آگے بہت نکل گئے دھوم مچا کے ہم

آمیزہ ایک ہم سے رہے یہ بھی یادگار
تحسینِ طلب ہیں خاک میں خوشبو ملا کے ہم

سب اُڑ گیا ہوا پہ جمانے کی سعی میں
وہ ایک نقش لائے تھے جس کو بچا کے ہم

اندر کی دھوپ ہی کہیں اب راس ہو تو ہو
بھیگے ہوئے ہیں ایک غمِ نارسا کے ہم

اب تیری طرف میں بھٹکتا ہے دھیان کیا
منکر ہیں اپنے ، اور ہیں کافر خدا کے ہم

اب روٹھ ہی گیا ہے تو اُس کو منائیں بھی
آخر کو لوٹ آئے ہیں کچھ دور جا کے ہم

جینے کا اک جواز تو ہو ، جھوٹ سچ کہیں
یوں زندہ رہ تو سکتے ہیں اس کو بھلا کے ہم

کیسا سفر ، کہاں کی ملاقات ، اے ظفر
اب کے تو آگئے ہیں یونہی بھر بھرا کے ہم

-☆-

مُسکرا دینے میں، ہونٹوں کی ضیا دینے میں
فاصلے ہیں ابھی رستے کا پتا دینے میں

جو بھی اسرار ہے، اب دل کے لہو کی لَے ہے
دُور سے میرے لیے ہاتھ ہلا دینے میں

پُوچھ آؤ، کہ مَیں ویسا ہی کھڑا سُوکھتا ہُوں
دیر کتنی ہے مُجھے برگ و نوا دینے میں

ایک ہی نقش ہے، اب سوچ سمجھ لو، کہ نہیں
فرق مِٹنے میں کوئی، اور، مِٹا دینے میں

اور ہی مُہر جماؤ کوئی، اُن گھڑی ہی سہی
لُطف کیا دیکھے ہوئے خواب دِکھا دینے میں

سر اُٹھایا نہیں تُو نے کہ سلامت رہ جائے
عُذر کیا ہے تُجھے اب ہاتھ اُٹھا دینے میں

مُفت کی مُخبری ہے، ترا نقصان ہے کیا
جو ترے پاس نہیں اُس کو لُٹا دینے میں

مرگِ طبعی سے مرے، دیر کے بیمار تھے لفظ
اور، پکڑا گیا مَیں حرف دوا دینے میں

مَیں اگر ہُوں تو کہیں سامنے آ جاؤں، ظفر
مصلحت اور نہ تھی کوئی صدا دینے میں

-☆-

یقیں کی خاک اُڑاتے، گماں بناتے ہیں
مگر، یہ طُرفہ عمارت کہاں بناتے ہیں

لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساسِ فکر نہ طرزِ بیاں بناتے ہیں

قریب و دُور سے بے جوڑ عکس اشیا کے
تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں

کہ مِل سکے نہ ہمارا سُراغ ہم کو بھی
بنائے ابر و ہوا پر مکاں بناتے ہیں

پُرانے ظلم میں لذت نہیں ہمارے لیے
ہم اپنے سر پہ نیا آسماں بناتے ہیں

نہیں نصیب میں مرنا سوادِ ساحل پر
جو ڈُوبنے کے لیے کشتیاں بناتے ہیں

فلک پہ ڈھونڈتے ہیں گردِ رنگِ رفتۂ دل
زمیں پہ شامِ طلب کا نشاں بناتے ہیں

وہ جس کی لَے پہ لرزتا ہے برگ برگ بدن
اُس ایک رنگ سے نقشِ خزاں بناتے ہیں

ظفر، یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زُباں یا زُباں بناتے ہیں

-☆-

کیا پتا کس جرم کی کس کو سزا دیتا ہوں میں
رنگ سا اک باندھتا ہوں ، پھر بھلا دیتا ہوں میں

اپنے آگے اب تو میں خود بھی ٹھہر سکتا نہیں
سامنا ہوتے ہی چٹکی میں اُڑا دیتا ہوں میں

راس آئی ہے سخن کی گرم بازاری مجھے
لفظ کی کھوٹی چونی کو چلا دیتا ہوں میں

معجزہ اگلا تو اب جیسے پرانا ہو چکا
دیکھنا ، اب کے کوئی چکر نیا دیتا ہوں میں

مجھ سے آگے بھی نکل جانا بہت مشکل نہیں
آج کل آہستہ رَو ہوں ، راستا دیتا ہوں میں

شور سا اُٹھتا ہے اور اُٹھتے ہی دب جاتا ہے اب
حرف سا لکھنے سے پہلے ہی مٹا دیتا ہوں میں

تاکہ میری صلح جُوئی کو لگے کچھ بھاو بھی
ہر نئے فتنے کو درپردہ ہَوا دیتا ہوں میں

نقدِ خواب اُس کے لیے لگتا ہے آخر داو پر
رات بھر کی جیت کو دن میں ہرا دیتا ہوں میں

بات بھی سُنتا نہیں ہوں وصل میں دل کی ، ظفرؔ
ایسے خرمستوں کو محفل سے اُٹھا دیتا ہوں میں

-☆-

شور اُٹھا پھر سخن گرم کا بازاروں میں
کھلبلی مچ گئی غالبؔ کے طرف داروں میں

تڑپ اُٹھی ہے فضا ، نعرۂ باطل ہے تو کیا
بات کچھ ہے تو سہی اُس کے گنہ گاروں میں

اک ذرا گرمیِ ہنگامہ تھی اُس کے دم سے
جس سے ڈرتے تھے وہی آ گیا اخباروں میں

کل کو ایسا نہ ہو اپنا بھی ہو انجام یہی
آج کل ہم بھی ہیں کچھ حاشیہ برداروں میں

اب تو بیکار بھی بیکار نہیں لگتی ہے
ایسے گھل مِل گئے ہم وقت کے خرکاروں میں

ایک یلغار ہے اب ساری مُصیبت کا علاج
ہیں دفینے ابھی گرتی ہُوئی دیواروں میں

ہاتھ پڑنے کو ہیں دامانِ مسیحا پہ یہاں
مشورے ہونے لگے روز کے بیماروں میں

وقت آیا تو پھر ان آنکھوں سے دیکھو گے کہ وہ
بیٹھے اُڑ جانے کو تیار ہیں طیاروں میں

دار پر کھینچنا آساں جو نہیں ہے تو ، ظفرؔ
نام لکھ لیجیے پہلے مرا غداروں میں

-☆-

ابھی سے وصلِ دل آرا کا اہتمام کہاں
ابھی ہیں باتیں ہی باتیں ۔ ابھی سے کام کہاں

کرے گا تُو ہی اُنھیں داغِ بوسہ پہ آزاد
اب اور جا کے بکیں گے ترے غلام کہاں

نکل کے دل سے رُکے اشک اندھیری آنکھوں میں
مُسافرانِ محبت کو آئی شام کہاں

جو ہیں تو خود سے گُزر جائیں ہم ۔ مگر ہوں بھی
کہ وہمِ پُختہ کہاں ۔ اور یقینِ خام کہاں

رہِ نیاز سے اُس کا گُزر ہُوا ہے ۔ نہ ہو
یہ اب کی بار بچھایا ہے دل نے دام کہاں

قریب سبز ہے ایسا سوادِ ساحلِ دل
یہاں سے جائے گی یہ موجِ بے خرام کہاں

غبارِ آبِ سیہ کی فصیلِ ویراں پہ
ہَوا کا نقش تو ہو گا ۔ ہَوا کا نام کہاں

ہمارے قتل پہ اک شور ہی اُٹھا اب کے
کہ اپنے خوں میں وہ خوش بُوئے اِنتقام کہاں

مری غزل پہ ۔ ظفر ۔ اُن کے سر ہلیں کیوں کر
طریقِ خاص میں لُطفِ مذاقِ عام کہاں

-☆-

خُود سے بھی چال چلتا رہتا ہُوں
دریا ہُوں ۔ رُخ بدلتا رہتا ہُوں

اندھے ہو ۔ اور ۔ دیکھتے نہیں کُچھ
سانچے ہیں ۔ اور ۔ ڈھلتا رہتا ہُوں

میرے اُس کے لہُو کا چاند چڑھے
کیسا کیسا مچلتا رہتا ہُوں

چکھتا ہے سبزۂ ہوس چشمہ
پیاسا ہُوں ۔ اور ۔ پھسلتا رہتا ہُوں

قائم دائم رگوں کا حبس وہی
پنکھی سانسوں کی جھلتا رہتا ہُوں

اندر کی طرف ہے یورشوں کا رُخ
خُود سے باہر نکلتا رہتا ہُوں

گُونج اُٹھتا ہُوں آپ ہی بیاباں میں
اور ۔ آپ ہی پھر دہلتا رہتا ہُوں

خیالا ڈر اُتارنے کے لیے
مٹّی کی رَو میں رلتا رہتا ہُوں

نازل ہو جاؤں اب زمیں پہ ۔ ظفر
بے فائدہ روز ٹلتا رہتا ہُوں

-☆-

خیر، جعلی ہے کہ فرضی ہے، میاں
رکھ تو لو، وصل کی عرضی ہے، میاں

جو بلا ہم پہ ہوئی ہے نازل
وہ سماوی ہے نہ ارضی ہے، میاں

اُسی چوکھٹ پہ پڑا رہتا ہے
دل ہے، کیا کیجیے، غرضی ہے، میاں

عمر بھر میں نہیں اُترا سر سے
قرض تو کیا ہے وہ قرضی ہے، میاں

ہے یہاں عکسِ ہوا بھی نایاب
شاخ تو آپ ہی لرزی ہے، میاں

خود ہی دھو لیتے ہیں، سی لیتے ہیں
بیوی دھوبن ہے تو درزی ہے میاں

شعر کچا بھی نکل جاتا ہے
ساری اللہ کی مرضی ہے، میاں

بس اسی پر نہیں دیوانِ غزل
اور بھی قافیہ ورزی ہے میاں

ہے جدا طور تمھارا بھی، ظفر
وہ بھی سو طرح کا طرزی ہے، میاں

☆

سفرِ خواب کا صلہ مانگیں
نُچتے پَر، کانپتی ٹانگیں

ابھی دریا تو دُور ہے، صاحب
ذرا یہ دل کی آڑ تو لانگھیں

بور ہوتے ہیں پاس والے سے
جو ذرا دُور ہے اُسے تانکیں

خود تو ننگے دھڑنگے ہیں ہی، اب
راستے کے درخت ہی چھانگیں

کسی لالچ کی لو اُبھارتی ہیں
شاخ کو باجتی ہوئی سانگیں

شوق کے جام ہوتے پیچے کو
وصل کی ویزلین سے وانگیں

فاقہ مستی ہوس کی چھائی ہے پھر
بھوک سے دے رہا ہوں پھر بانگیں

کچھ ترے بھائیوں نے مار رکھا
کچھ پڑیں اپنے گھر سے بھی ڈانگیں

ڈوب جائیں ہمارے رس میں، ظفر
یا ہمیں اپنے رنگ میں رانگیں

☆

شامل غرض ہنر کر کے ریاکاری کو
آخر آسان کیا روز کی دُشواری کو

آگ بھڑکے تو سہی ، تاب تماشا ہے بہت
کھول کر سینہ ہُوا دیتا ہُوں چنگاری کو

وہی بکھراو ہے ، بکھراو میں یک سُوئی بھی
آئنہ جانتا ہے عکس کی عیّاری کو

بھوک وہ نشہ نازک ہے کہ جب ٹوٹے گا
جی ترس جائے گا اس طرح کی سرشاری کو

لوگ ہیں میرے ہی جیسے ، مرا حصّہ ہی تو ہیں
دل کو سمجھاتا ہُوں ، بہلاتا ہُوں بے زاری کو

ہے یہی منظر و ماحول تو بے جا کیا ہے
مَیں اگر خواب سمجھتا رہا بیداری کو

بستہ دل تھا مری جیب میں ، وہ بھی کھوٹا
گھر سے نکلا تھا مَیں خوابوں کی خریداری کو

بات بھی ہم سے نہ کی شوخ نے سیدھے مُنہ سے
سب سے آگے تھے ہمیں اُس کی طرف داری کو

کوئی صُورت ہو ضمانت پہ رہائی کی ، ظفرؔ
اتنے ایّام ہوئے میری گرفتاری کو

☆

حد ہو چکی ہے ، شرمِ شکیبائی ختم ہو
بہتر ہے اب دُعا کی پذیرائی ختم ہو

لیں گے حساب مُجھ سے ابھی لفظ لفظ کا
یعنی ذرا یہ انجمن آرائی ختم ہو

دیکھا ہے اس نواح میں وہ کُچھ کہ اے خُدا
اب تو یہی دکھا کہ یہ بینائی ختم ہو

ممکن ہے ، منتظر ہو کوئی خاکِ خُوش خصال
شاید کہیں یہ ساحلِ رُسوائی ختم ہو

ہے دُود خاک دار بہت ، پاک ہو ہَوا
پانی ہے زیرِ بار بہت ، کائی ختم ہو

خُوش رنگ میں کھلا ہُوا بد رنگ ہو جُدا
اور ، شور میں چھپی ہُوئی تنہائی ختم ہو

اپنے مُقابل آپ ہی آ جاؤں گا کبھی
تنگ آ چکا ہُوں ، اب مری یکتائی ختم ہو

آ کر وہ میری بات سُنے ، اور جواب دے
گر یُوں نہیں تو پھر یہ شناسائی ختم ہو

بازارِ بوسہ تیز سے ہے تیز تر ، ظفرؔ
اُمّید تو نہیں کہ یہ مہنگائی ختم ہو

☆

دھوپ ، عکس ، ہوس تماشا ، لو
بے سفر ، بے صدا بدن بالو

آڑے آئے بڑے میاں ہی وہاں
اُس کو لڑکے نہ کر سکے چالو

وہ تو غُرّا کے چل رہی تھی ، مگر
سہما سہما تھا شیر کا خالو

کون لیتا ہے سُکھ کی سانس یہاں
کس کی بیوی نہیں ہے جھگڑالو

ہُوئی میعاد ممبری کی ختم
رہ گئے لال دین سے لالو

جسے سمجھے نہیں قبولتے ہیں
شعر ہے وہ سڑا ہُوا آلو

حرفِ ناگفتہ سے خُدا کی پناہ
بچ رہے ہونٹ ، جل اُٹھا تالو

قافیہ تنگ ہوتا جاتا ہے
ایک باقی ہے ، وہ بھی شفتالو

لفظ بھو کے بھٹک رہے ہیں ، ظفر
فن تماشا ہے ، فکر ہے بھالو

☆

گر کے میں ٹوٹ گیا شام کی تصویر کے ساتھ

تھے یہاں منظر و معنی بھی اُلٹے پلٹے
خواب سیدھا نہ ہُوا خواب کی تعبیر کے ساتھ

وہ بھی رُخصت ہُوا کچھ وقت سے پہلے شاید
اور پہنچا وہاں میں بھی ذرا تاخیر کے ساتھ

جذبۂ دل کو تو کچھ گھاس نہ ڈالی اُس نے
آخرِ کار اُسے قائل کیا تقریر کے ساتھ

جسے پایا تھا بہ صد حیلہ و حکمت میں نے
اُسے کھویا بھی ہے آخر بڑی تدبیر کے ساتھ

وہ بھی معدوم ہُوا سوزِ سخن سے اپنے
بہہ گیا میں بھی کہیں تلخیٔ تحریر کے ساتھ

سب میں شامل بھی ہُوں ، بیزار بھی سب سے ہُوں بہت
وہ کڑی ہُوں کہ چھنکتی نہیں زنجیر کے ساتھ

میں تو اک شعلۂ امکاں کو ہُوا دیتا تھا
یہی تقصیر نہ لکھی گئی تعزیر کے ساتھ

اور ویران ہُوا جاتا ہُوں اندر سے ، ظفر
ربط کچھ ہے تو کسی شہر کی تعمیر کے ساتھ

☆

سانس کے آرپار، دل سے وراء
وہی ویراں ہے عالمِ اشیا

آئنہ توڑ کر ہی ممکن ہے
رُوٹھنے والے عکس کا احیاء

اپنے دل میں ہے ایک اور بھی دل
اس خلا میں ہے ایک اور خلاء

مطمئن ہیں مُخالفت سے تری
ہم کو معلوم ہے ترا منشاء

شاعری سُست پڑتی جاتی ہے
چاہیے فکر کے لیے بھی طلاء

اپنے بارے میں بے خبر ہوں، مگر
میرے نقّاد کو ہُوا القاء

یہی صورت ہے اب، کتاب اُس کے
سر پہ دے مار، اور کہہ: اقراء

ساری مایُوسیوں کا ایک علاج
یعنی ایم اے کے بعد کیجیے لاء

قافیے اور بھی بہت تھے، ظفر
کیوں نہ ناراض ہوں جنابِ ضیاء

-☆-

لیتے ہیں آڑ کیوں سخنِ فتنہ ساز کی
حاجت ہی کیا ہے قتلِ صدا کے جواز کی

طوفاں تو بے صدا تھا دمِ مرگ کی طرح
آواز تھی وہ ڈوبنے والے جہاز کی

سرکش ہوئی تو دستِ رسا سے بھی تھی بلند
وہ شاخِ سُرخ و سبز گلستانِ راز کی

چمکا ہے آفتابِ ہوس جنگلوں کے پار
اُٹھی ہے لہر برف بدن کے گداز کی

دل پر سیاہ رنگ کا موسم رُکا رہا
اچھا ہے، تُم نے چشمِ تماشا نہ باز کی

ہے سنگ پر نشاں کسی نقشِ نیاز کا
لرزش ہے آئنے میں کسی عکسِ ناز کی

کیوں رائیگاں اُٹھائے رکھی مشعلِ سوال
کیوں مُفت میں زبانِ تمنا دراز کی

میں دُشمنوں کی راہ سے ہو کر نکل گیا
جس روز دوستوں نے بہت ساز باز کی

اُس سے تو بے سُرا ہی بھلا تھا مجھے، ظفر
یک ساں نہیں تھی یُوں بھی سُر میرے ساز کی

-☆-

گم ہیں کسی جستجو میں اب بھی
یہ جلوتِ جسم کے مُربّی

امی تو اُس کی ہے بھلی لوگ
ملنے نہیں دیتے اُس کے امی

میں ہی بے مُرشدا نہیں ہوں
وہ ہے مجھ سے زیادہ کتی

جنت سے تو وہ بھلے ہی مانے
لے جایئے بھر کے اُس کو تھتی

کر استعمال کچھ سیاست
تجی دکھلا کے مار کھتی

رشوت سے بنے ہوئے مکاں پر
لکھوا ہذا من فضلِ ربی

مُندری تو اُڑا کے لے گئے چور
خالم خالی پڑی ہے ڈبی

اُردو کو کیا ہوا تمھاری
چھتیس کو کہہ رہی ہو چھتی

پہلے ہی، ظفر، ہیں اس طرح کے
کتیا تو نہیں تھی ڈب کھڑبی

☆

آگ دو دن میں ہو گئی ٹھنڈی
حضرتِ دل دکھا گئے جھنڈی

اب کے سیر ہے پکی ہوئی فصل
تیز ہے جنسِ خام کی منڈی

دو قدم بھی چلا نہیں جاتا
نکلی ہے دل کے پاؤں پہ چنڈی

یُوں تکی ہے پچھی پرانی اُمید
شام کے وقت جس طرح رنڈی

واپس آنے کی راہ کوئی نہیں
جاتی ہے شہر کو یہی ڈنڈی

خلوتِ خاص میں پڑا ہے وہاں
ایک سے ایک بڑھ کے پاکھنڈی

قید ہے ان کبوتروں کے لیے
یہ دھنسی اور پھنسی ہوئی بنڈی

سینگ تو کافی خوب صورت ہیں
دُم ذرا شاعری کی ہے لنڈی

لاکھ بچ کر چلو ظفر اُس سے
لے مرے گی تمھیں وہ مشٹنڈی

☆

میری بھی نہ چھوڑ کر ترقی
اے خان قطب نثار بھگی

دیوالیہ ہو کے آپ اب تو
کروائے گا بند میری ہنگی

آگے ہی بہت پڑھا ہُوا ہُوں
مجھ کو نہ پڑھاؤ اور ہنگی

چھا ہے تھانے دار نے ، تو
کروا لو ڈاکٹر سے ہنگی

نزلہ ہے قوم کو ، اِدھر ہے
لسّی جمہوریت کی کھٹی

یہ حزب اختلاف بھی کچھ
کھائے گی تو ہو گی ہنگی

ٹھہرے گی اس دفعہ بھی کیا کچھ
بھڑلو کے آگے یہ ٹکٹی

دیتی ہے خیر بھینس تو دودھ
لیکن کیوں ناچتی ہے ٹنگی

شاید ، ظفر ، اُن کی ہجو کے ساتھ
اپنی بھی لکھ گیا ہوں پھنگی

-☆-

رات گئے چڑھ دوڑے گھگی
چینی امریکا کی تھگی

کلّر تھور ہوئیں سب راہیں
تالابوں پہ کائی تھگی

گھر والا تھا بجھ مُٹھیا سا
تھی خود تو وہ اُونچی لگی

نمبر دو پہ رکھیے اس کو
پہلے پہ ہے اُس کی اتی

مرچ مسالے تو پُورے تھے
ذرا کچیری تھی ققحی

دل کا پرچا بند پڑا ہے
چھاپ لیا کرتے ہیں ڈگی

جب سے چُھٹی محبت بازی
کھیل لیا کرتے ہیں رتی

وہی ہوس کا تانا بانا
وہی مُستانات اور مُستی

مدحیہ اشعار بھی تیرے
اُسے ، ظفر ، لگتے ہیں ڈگی

-☆-

تنہائی آئے گی ، شبِ رُسوائی آئے گی
گھر ہے تو اِس میں زینت و زیبائی آئے گی

اپنا علاج خود ہی کریں گے کبھی مریض
آتے ہی آتے اِن کو مسیحائی آئے گی

ہو گی کچھ اور شکل تمنّا کی اس دفعہ
چہرے پہ اور طرح کی زردائی آئے گی

اب گرم ہے لہُو تو اِسے کام میں بھی لا
یہ چاند پھر چڑھے گا نہ رُشنائی آئے گی

کچھ روز دیکھ تو بھی اِسے چشمِ قہر سے
اِس آگ سے ہی دودھ پہ بالائی آئے گی

جتنا وہ تند خو ہے ، ذرا دیکھ تو سہی
اُتنی ہی اُس کی بات میں نرمائی آئے گی

کچھ صبر و ضبط چاہیے ، توڑے گا جتنی جلد
پھل میں اُسی حساب سے تُرشائی آئے گی

آخر ہے فتح اپنی ، مگر ، یہ بھی یاد رکھ
اِس جنگ میں کہیں کہیں پسپائی آئے گی

اُمیدِ وصل کو ، ظفرؔ ، اتنا غلط نہ جان
اِس جھوٹ سے تو سوچ میں سچائی آئے گی

☆

اتنا نہ سنبھال مال مڈی
اندر ہو، چل پڑی ہے کڈی

گھلنے کھودائے فرش پر ہی
کھیلے نہ پلنگ پر کبڈی

اب ہوس نکال کر بتیں گے
تازہ ہے اور ریڈ بلڈی

انگیا میں ڈوبتا ہے دن سا
خوش بُو سی چھوڑتی ہے چڈی

تانا پیٹا ہوئے ہیں غائب
چلنے کو چل رہی ہے کھڈی

پہنچیں گے اگرچہ سب سے پہلے
کہلائیں گے پھر بھی ہم پھسڈی

اک عادتِ بد تھی شاعری کی
سو وہ بھی ہم نے چھوڑ چھڈی

آیا ہے آخرش نظر کیا
تکتی نہیں کیوں زمیں پہ اڈی

پھُکا وہیں ہو گیا ، ظفرؔ ، وہ
آئی جہاں جس کے مُنہ میں ہڈی

☆

حرف بکھرا ہے محبت کا مٹا دینے سے
گھر بچایا ہے، ظفر، آگ لگا دینے سے

غل مچا آپ ہی، بدلا ہے اگر موسمِ دل
فائدہ کیا یہ خبر اُس کو سُنا دینے سے

لوگ پہنچائیں گے پیغام زبانی کتنے
فیصلہ ہو گا اُسے پاس بُلا دینے سے

سچ پکتا جو یہ پکوان تو میٹھا ہوتا
بات بگڑی ہے فقط بات بڑھا دینے سے

تم مجھے جو بھی کہو، مَیں تو سمجھتا ہوں کہ مَیں
محرمِ خاک ہُوا خاک اُڑا دینے سے

مَیں تو تیار تھا، اِس بحر و بیاباں میں اگر
فرق پڑتا کوئی طوفان اُٹھا دینے سے

نیند کی، نرمیِ رفتار سے کھل جائے گی آنکھ
راہ رُک جائے گی دیوار ہٹا دینے سے

ایک ضد ہے کہ جسے پال رہے ہیں، ورنہ
مر نہیں جائیں گے کچھ اُس کو بھلا دینے سے

گھر وہ لعلِ طلبِ تاب تماشا ہے، ظفر
روشنی کم نہ ہوئی جس کے چھپا دینے سے

☆

صحرا مرا سفینہ، صدا بادبان ہے
مَیں چار سُو ہوں، سیلِ سفر درمیان ہے

ہر شب نیا کرشمہ دکھاتی ہے یہ زمیں
ہر روز میرے سر پہ نیا آسمان ہے

اک بے طلب نشے میں گرفتار ہے بدن
اک بے سبب ہراس کی مٹھی میں جان ہے

کچھ راس آ چلی ہے مجھے وحشتِ ہوس
کچھ اُس کے جنگلوں کی ہوا مہربان ہے

گرد و غبارِ خواب سے نکلا نہیں ابھی
یعنی وہ نقش آب ابھی بے نشان ہے

ڈیوڑھی بڑی سی، ریلوے کراسنگ کے سامنے
ڈیوڑھی سے چار چھ قدم آگے مکان ہے

کانوں سے اُنگلیاں نہ نکالو تو کچھ نہیں
سُنتے رہو تو روز نئی داستان ہے

سودا سلف نہیں ہے تو کھاتے کھنگالیے
کرتے ہی رہیے کچھ نہ کچھ، آخر دکان ہے

اُس ذائقے کی تاب تو لاتا کوئی، ظفر
کہنے کو اک جہان کے مُنہ میں زبان ہے

☆

ابھی تو کرنا پڑے گا سفر دوبارہ مجھے
ابھی کریں نہیں آرام کا اشارہ مجھے

لہو میں آئے گا طوفان شدہ رات بہ رات
کرے گی موج بلاخیز پارہ پارہ مجھے

بجھا نہیں مرے اندر کا آفتاب ابھی
جلا کے خاک کرے گا یہی شرارہ مجھے

اُتار پھینکتا میں بھی یہ تار تار بدن
اسیرِ خاک ہوں ، کرنا پڑا گزارہ مجھے

اُڑے وہ گرد کہ میں چار سُو بکھر جاؤں
غبار میں نظر آئے نہ کوئی چارہ مجھے

مرے حدود میں ہے میرے آس پاس کی دُھند
رہا یہ شہر تو اس کا نہیں اجارہ مجھے

سحر ہوئی تو بہت دیر تک دکھائی دیا
غروب ہوتی ہوئی رات کا کنارہ مجھے

مری فضا میں ہے ترتیب کائنات کچھ اور
عجب نہیں جو ترا چاند ہے ستارہ مجھے

نہ چھو سکوں جسے کیا اُس کا دیکھنا بھی ، ظفر
بھلا لگا نہ کبھی دُور کا نظارہ مجھے

☆

فتور اگرچہ تمنا کا سر میں اترا ہے
غزل کہے کوئی کیا ، شور گھر میں اترا ہے

وہ پارہ پارہ کرے ، اور ، یہ اُڑا لے جائے
جو فرق ہے تو ہوا و ہنر میں اترا ہے

ابھی تو جانے کہاں ہے کہ ٹوٹتا ہے بدن
خمار آمدِ گل کی خبر میں اترا ہے

میں اُس کا چور ہوں اور اُس سے چھپتا پھرتا ہوں
خبر نہ تھی کہ مزا اُس کے ڈر میں اترا ہے

فساد سارا لہو کا ہے ، جانچتے رہیے
کہ تھا قیام میں اترا ، سفر میں اترا ہے

اس ایک پل کے تصادم کو بھی غنیمت جان
کہ اپنا حصّہ شبِ مختصر میں اترا ہے

ہے پانیوں کی تہوں میں چمک دمک اُس کی
نہ عکس موجِ بلا کا گہر میں اترا ہے

یہ کس ہوا میں لرزتا ہے برگ برگ اس کا
یہ زہر کون سی رُت کا ثمر میں اترا ہے

ظفر ، وہ سانولا ، چھوٹا سا ہاتھ رکھ دل پر
کہ وہ بھی دیکھ سفینہ خطر میں اترا ہے

☆

ایک ہی نقش ہے ، جتنا بھی جہاں رہ جائے
آگ اُڑتی پھرے ہر سُو کہ دھواں رہ جائے

کچھ غرض اس سے نہیں ، رزقِ گدا ہو کہ نہ ہو
کوچہ و راہ میں آوازِ سگاں رہ جائے

یہ سفر وہ ہے کہ اتنا بھی غنیمت ہے ، اگر
اپنے ہم راہ یہی خاکِ رواں رہ جائے

اور کچھ روز رُکے سُست لہُو کا موسم
اور کچھ دیر یہی رنگِ خزاں رہ جائے

آج کل اُس کی طرح ہم بھی ہیں خالی خالی
ایک وہ دن ، اُسے کہیو ، کہ یہاں رہ جائے

کچھ تو رہ جائے تگ و تازِ طلب میں باقی
وہم اپنا رہے یا اُس کا گُماں رہ جائے

وہ تمنا ہوں کہ دل سے نہ گزر ہو جس کا
وہ تماشا ہوں کہ نظروں سے نہاں رہ جائے

یہ بھی اک مرحلہ سخت ہے ، اے صاحبِ طرز
کہ بیاں کی جگہ اندازِ بیاں رہ جائے

نام تو پھر بھی بڑی بات ہے دُنیا میں ، ظفر
یہ بھی کیا کم ہے جو کچھ اپنا نشاں رہ جائے

☆

کھولتا سا کچھ رگوں میں چھپایا ہوا تو ہے
چہرے سے رنگِ خاک اُڑایا ہوا تو ہے

اک ذرہ خواب ہم نے بھی ، کیا جانے کس لیے
دل کی اندھیری تہ میں بٹھایا ہوا تو ہے

ہونا ہی اُس کا کم نہیں ، وہ جس جگہ بھی ہو
کھویا ہوا تو ہے اُسے ، پایا ہوا تو ہے

لفظوں کے لہر لہر اندھیرے کے باوجود
منظر صدا کا ہم نے دکھایا ہوا تو ہے

کام آئی تو ہے اپنی لہو سے بھری قمیص
پرچم سا ہم دموں نے بنایا ہوا تو ہے

مٹی پہ اپنا بس نہیں چلتا تو کیا ہوا
کاغذ پہ ہم نے حشر اُٹھایا ہوا تو ہے

وہ چور ہے ، پر اُس کو پکڑتا نہیں کوئی
ہم ہیں ، سو ہم نے شور مچایا ہوا تو ہے

صحرا بھی اپنی پیاس کی پوشاک میں ہے تنگ
دریا بھی اپنی موج میں آیا ہوا تو ہے

کب تک رہے یہ صبر و سکوں ، دیکھیے ، ظفر
پنڈی کے دوستوں کو بھلایا ہوا تو ہے

☆

یوں تو کس چیز کی کمی ہے
ہر شے ، لیکن بکھر گئی ہے

دریا ہے رُکا ہُوا ہمارا
صحرا میں ریت بہ رہی ہے

کیا نقش بنایئے کہ گھر میں
دیوار کبھی نہیں ، کبھی ہے

خواہش کا حساب بھی لگاؤں
لڑکی تو بہت نئی نئی ہے

دل تنگ ہے پاس بیٹھنے سے
اُٹھنا چاہوں تو روکتی ہے

ہوتی جاتی ہے میری تشکیل
جُوں جُوں مجھ میں وہ ٹوٹتی ہے

تصویرِ خزاں لہو میں اب کے
پیلی پیلی ، ہری ہری ہے

باہر سے چٹان کی طرح ہُوں
اندر کی فضا میں تھرتھری ہے

پیرو نہیں ایک بھی ظفر کا
کس مذہبِ سخت کا نبی ہے

☆

عکسِ خیال و نقشِ صدا ہے ترے لیے
آئینہ خانہ سب سے جُدا ہے ترے لیے

زندانِ احتیاط سے باہر نکل کے دیکھ
سرسبز جنگلوں کی ہوا ہے ترے لیے

سینے میں دوستی کی فضا ہو نہ ہو ، مگر
اپنے سے دُشمنی کی ادا ہے ترے لیے

رکھے گا تُو ہی اپنی تروتازگی کی شرم
باغِ بدن اُجاڑ دیا ہے ترے لیے

اک چاند پارہ پارہ ہے آنکھوں کے آر پار
اک پھول دل میں بکھرا پڑا ہے ترے لیے

تجھ کو یہ کیا خبر کہ چراغ ہوں یہاں
کن کُنج راستوں پہ جلا ہے ترے لیے

چمکا ہے تیری خاک میں میرے لہو کا رنگ
یعنی ، میرے کیے کی سزا ہے ترے لیے

اپنی خوشی سے آ یہاں ، اپنی رضا سے جا
دروازہ میرے دل کا کھلا ہے ترے لیے

ہو گا ، تجھی بتا ، ترا کس جگ بھلا ، ظفر
بیمِ بشر نہ خوفِ خُدا ہے ترے لیے

☆

قافیہ چاہیے کھانے کے لیے
یعنی مطلع میں کھپانے کے لیے

خوشہ چینوں کو خبر ہے شاید
مَیں کماتا ہُوں لٹانے کے لیے

سب سے پہلے سُنی اُس نے مری بات
بزم سے مُجھ کو اُٹھانے کے لیے

مُفت میں اُس سے لڑائی لے لی
کوئی پہنچا نہ چھُڑوانے کے لیے

ہُوا ایجاد خُوشی کا ٹیکا
غم کی میعاد بڑھانے کے لیے

کُچھ ہوا چاہیے آخر مُجھ کو
سانس کا سکہ بجانے کے لیے

کُچھ فضا کی بھی ضرورت ہے مُجھے
اپنی بے پر کی اُڑانے کے لیے

ٹوٹ جانے کے لیے جُڑتا ہوں
شعر لکھتا ہُوں بھلانے کے لیے

شاعری اصل کہاں ہے، کہ ظفر
دانت ہیں یہ تو دکھانے کے لیے

☆

رنگ جلنے کے لیے، راز پگھلنے کے لیے
ہے ہر اک چیز کسی اور میں ڈھلنے کے لیے

لوگ ہیں اور ہی منزل کے مُسافر، یعنی
خاک رہ جائے گی اب خاک میں رُلنے کے لیے

راہ پانے کی ذرا دیر ہے، ٹھنتے رہنا
چشمہء خوف ہے بے تاب اُبلنے کے لیے

ذرۂ ریگ بدن ہے مجھے دیوار سیاہ
در کوئی چاہیے صحرا سے نکلنے کے لیے

آ نکلتا ہے کبھی دل کے نہاں خانے میں
اک ذرا پیرہنِ ناز بدلنے کے لیے

مَیں گرا بھی تو اُسے لے کے گروں گا، ورنہ
لڑکھڑانا تو بہانہ ہے سنبھلنے کے لیے

دُشمنوں سے نہیں مُنہ بھیڑ اگر قسمت میں
ہو سڑک پر کوئی چھلکا ہی پھسلنے کے لیے

لفظ چھپتا ہے وہاں میرے مُخالف، تو یہاں
بات آتی اُسے کافی ہے اُچھلنے کے لیے

پتیاں چُوم کے جس کی، ظفر، اتنے خُوش ہو
پھول تھا وہ تو، مری جان، مسلنے کے لیے

☆

دن ہُوا ، کٹ کر گرا مَیں روشنی کی دھار سے
خلق نے دیکھے لہو میں رات کے انوار سے

اُڑ گیا کالا کبوتر ، نُو گئی خوابوں کی رَو
سایۂ دیوار نے کیا کہہ دیا دیوار سے

کیا وہ میرے پاس آتا ، کِس طرح سُنتا مری
مَیں اُسے آواز دیتا تھا بدن کے پار سے

جب سے دل اندھا ہُوا ، آنکھیں کھلی رکھتا ہُوں مَیں
اُس پہ مرتا بھی ہُوں ، غافل بھی نہیں گھر بار سے

خاک پہ اُڑتی بکھرتی پُرزہ پُرزہ آرزو
یاد ہے یہ کچھ ہوا کی آخری یلغار سے

عشق سمجھوں یا عقیدت ، شوخ نے میری غزل
پرس میں رکھی ہوئی تھی کاٹ کر اخبار سے

اب تو بارش ہو ہی جانی چاہیے ، اُس نے کہا
تاکہ بوجھ اُترے پرانی گرد کا اشجار سے

عشق تو اب شعر کہنے کا بہانہ رہ گیا
حرف کو رکھتا ہُوں روشن شعلۂ افکار سے

شہر کے نقشے سے مَیں مٹ بھی چکا کب کا ، ظفرؔ
چار سُو ، لیکن ، چمکتے ہیں مرے آثار سے

☆

ایماں کے ساتھ خامیِ ایماں بھی چاہیے
عزمِ سفر کیا ہے تو ساماں بھی چاہیے

کچھ اصل تو کھلے کہیں اس زور و شور کی
دریا کے راستے میں بیاباں بھی چاہیے

بھڑکا تو ہے بدن میں لہو کا گلاب سا
مشکل ہے یہ کہ تنگیِ داماں بھی چاہیے

اُس کے نئی قمیص کے تحفے کا شکریہ
لیکن، یہاں تو پیرہنِ جاں بھی چاہیے

اس تیرگی میں پرتوِ مہتابِ رُخ کے ساتھ
کچھ عکسِ آفتابِ گریباں بھی چاہیے

مشکل پسند ہی سہی میں وصل میں، مگر
اب کے یہ مرحلہ مجھے آساں بھی چاہیے

کچھ اُس طرف بھی جوشِ جفا ہے نیا نیا
کچھ ظلم اپنی شان کے شایاں بھی چاہیے

ڈرتے بھی رہیے اُس سے کہ اس میں بھی ہے مزا
لیکن، کبھی کبھی ذرا شوں شاں بھی چاہیے

مشاطگیِ معنی بہت ہو چکی، ظفر
کچھ روز اب یہ زُلف پریشاں بھی چاہیے

☆

بوسہ نہ سہی، اپنا کوئی ذائقہ تو دے
یہ ہاتھ ہے، اس پر کہیں ناخن ہی کھبو دے

کچھ کیفِ کشاکش تو رہے تیری فضا میں
بہتر ہے جو پا لینے سے پہلے مجھے کھو دے

آلودہ ہے دامن مرے ہونے ہی سے تیرا
میں داغ ہوں، میرے ہی لہو سے مجھے دھو دے

اب لذتِ خاک اپنی ہی مٹی سے ملے گی
طوفاں کوئی ایسا کہ سفینے کو ڈبو دے

کب سے بدن شعر کیا رکھا ہے تشکیل
اس میں کوئی اب رُوح کا کانٹا بھی چبھو دے

میں برگِ ہنر ہوں، یونہی اُڑتا پھروں کب تک
اس خوابِ خزاں میں کہیں مجھ کو بھی سمو دے

اُس شے کی طلب کر کہ نشاں بھی نہ ہو جس کا
دریوزہ گرِ وصل کو جو پاس نہ ہو، دے

بارش کوئی جل تھل بھی نہیں چاہیے ہم کو
دفتر سے گھر آتے ہوئے کپڑے تو بھگو دے

ہے طرفہ تماشا، ظفر، اُس کی بھی طبیعت
خوش رہتا اُسی سے ہے وہ جس بات پہ رو دے

☆

عرض و اظہار سے آگے ہے، تو ایسی ہے
جرم سے پہلے ہے پیدا، یہ سزا کیسی ہے

کیا ہو اُمید شفا، کون یہاں جان سکا
مرضِ مرگ ہے کس دھار، دوا کیسی ہے

جانتے ہیں سبھی، اب کون بتائے کس کو
نقشِ دیوار ہے کس رنگ، ہوا کیسی ہے

قصرِ سلطاں میں کھلا طرف گلہ کا مضمون
طبع، اب دیکھیے، کس کس کی رسا کیسی ہے

نہ بجھے گی، نہ برستے ہی بنے گی اس کو
کبھی پوچھو گے کہ سر پہ یہ گھٹا کیسی ہے

شوق کو کرتی ہے یک سُو، یہ ادا ہے کس کی
سرخ رُو کرتی ہے سب کو، یہ خطا کیسی ہے

گونجتی تھی سرِ گل زار، خوشی تھی عجب
کھولتی ہے درِ زنداں، یہ صدا کیسی ہے

اس کی تصویر چھپا کر کہاں رکھیے آخر
وسعتِ خانہ میں یہ تنگیِ جا کیسی ہے

ایک یوسف ہوں، ظفر، اور برادر اتنے
قیمت، اب کیا کہوں میں، اُن کی بھلا کیسی ہے

☆

اک دن ادھر سوار سمندِ سفر تو آئے
خود بڑھ کے روک لیں گے کہیں وہ نظر تو آئے

کچھ دیر پھڑپھڑا کے نکل جائیے، مگر
وہ دامِ دل پذیر کہیں زیرِ پر تو آئے

وہ درد لا دوا ہی سہی، دل پہ وا تو ہو
وہ حُسن اک بلا ہی سہی، اپنے سر تو آئے

یہ کیا کہ آبگینہ سلامت ہی لے کے آئیں
کچھ ٹوٹ پھوٹ تو رہے، کوئی ضرر تو آئے

شامل نہیں خلوص ہمارے میں وہ تو کیا
یہ بھی بہت ہے، بام سے نیچے اتر تو آئے

ارزاں ہے خونِ خلق تو پھر کو بہ کو تو ہو
ہے دشنۂ ستم تو ذرا در بہ در تو آئے

آنکھیں چمک دکھائیں تو آساں ہو راہِ مرگ
یعنی سحر سے پہلے چراغِ سحر تو آئے

کچھ بن سکے نہ ہم تو بگڑ کر دکھا دیا
یوں کارگاہِ شوق میں کچھ کام کر تو آئے

نازاں ہوں اپنے عیبِ سخن پر ہزار بار
لازم ہے آدمی کو، ظفر، کچھ ہنر تو آئے

☆

کوئی کنایہ کہیں اور بات کرتے ہوئے
کوئی اشارہ ذرا دور سے گزرتے ہوئے

مرے لہو کی لپک میں رہے وہ ہاتھ، وہ پانو
مجھے آئنے سے کہیں ڈوبتے ابھرتے ہوئے

شرارِ بوسہ ہی اس سنگِ لب سے ہو پیدا
کہ میرے سر میں کئی لفظ ہیں ٹھٹھرتے ہوئے

نہ سخت گیر تھا وہ اور نہ میں ہی بے ہمت
پر اس کو ہاتھ لگایا ہے آج ڈرتے ہوئے

جلائیں گے نہ ساحل پہ کشتیاں اپنی
اس آب زارِ تماشا میں پانو دھرتے ہوئے

گزر ہی جائے گی سر سے کہیں تو موجِ ہوس
کبھی تو شرم اسے آئے گی مکرتے ہوئے

حواس میں ہیں کہیں خوف کے نشیب و فراز
جو خود سے بھاگتا ہوں راہ میں ٹھہرتے ہوئے

یہ کام اور تو اب کون ہی کرے گا یہاں
سمیٹتا بھی رہوں جسم کو بکھرتے ہوئے

مجھے تو رنج تھا سب سے کہیں زیادہ، ظفر
جو دیکھ لیتا مری سمت بھی وہ مرتے ہوئے

☆☆

یہ جو لکھتا ہے مجھے، یہ جو مٹایا ہے مجھے
نہ سہی اور، تماشا تو بنایا ہے مجھے

کوئی تیر و تبر اپنا بھی نکالا ہوتا
میرے ہی اسلحے سے اس نے ڈرایا ہے مجھے

جیسے یہ سب ہیں، اسی طرح کا ہو جاؤں اگر!
بیٹھے بیٹھے یہ خیال آج ہی آیا ہے مجھے

عیب رکھتا ہوں کہ آخر یہ ہنر ہے میرا
دھوپ میری ہے یہی، اور یہی سایا ہے مجھے

تاکہ میں کچھ نہ کہوں وضع کی مجبوری میں
اس لیے مسندِ ایواں پہ بٹھایا ہے مجھے

سرِ تسلیم ہوں، جس طور جھکایا مجھ کو
دستِ تائید ہوں، جس رنگ اٹھایا ہے مجھے

ہوں میں وہ خوں کہ بہایا ہے مجھے سڑکوں پر
میں ہوں وہ رنگ کہ چہروں سے اڑایا ہے مجھے

پھڑپھڑاتا ہوں ابھی زور ہوا کے رخ پر
نہ اٹھایا ہے ابھی اور نہ گرایا ہے مجھے

میں کہ اس عہد میں منکر ہوں، ظفر، اپنا بھی
کس لیے محفلِ غالب میں بلایا ہے مجھے

☆☆

مشکل بھی شعر ہو تو سمجھ میں ذرا تو آئے
یہ بھی اگر نہ ہو تو، کم از کم مزا تو آئے

تنہا ہی جشنِ مرگِ معانی منائیں ہم
لیکن، حصارِ حرف سے باہر صدا تو آئے

ہم بشر ہے بات بہت دور کی، جناب
حق میں ہمارے آپ کو خوفِ خدا تو آئے

دیوارِ دل میں ڈال رکھا ہے شگاف سا
اس کی خبر تو لائے، اُدھر سے ہوا تو آئے

مشکل ہے اس کی سانولی رنگت کا نقش اگر
تصویرِ انتظار میں اس کی فضا تو آئے

عکسِ شرارِ شوق ہے یا پرتوِ ملال
کیا ہے پسِ غبارِ ہوس، دیکھتا تو آئے

اتنے ہجوم میں بھی غنیمت سہی، مگر
سب سے الگ چلے، کبھی سب سے جدا تو آئے

اس کے لہو کی لہر میں شامل تو ہیں، مگر
کس حال چال میں ہیں، کچھ اپنا پتا تو آئے

اس سے کہیں زیادہ محبت میں ہیں، ظفر
وہ مانتا نہ تھا، مگر، اس کو سنا تو آئے

☆

زہر زمیں میں تھی نہ فشار فلک میں ہے
وہ حبس جاں کی لہر کہ اس کی جھلک میں ہے

کیوں کر چھپائے، سب کی نظر سے بچائے کیا
وہ شوق بے پناہ کہ تصویر تک میں ہے

ملنے کے ڈھونڈ لے گا بہانے بھی آپ وہ
مجھ سے زیادہ وہ ہی نہ ملنے کے حق میں ہے

آنکھیں بھی تازہ تر ہیں مشامِ ہوس کے ساتھ
کچھ پیچ و تابِ رنگ بھی گویا مہک میں ہے

آثارِ جسم و جاں بھی چمکتے ہیں دور دور
کچھ خاکِ خونِ دل بھی غبارِ شفق میں ہے

ہے یوں تو اس کا سانولا پن سانولا ہی پن
چکھو تو اک مٹھاس بھی اس کے نمک میں ہے

شاید ہوائے تند ہی محشر کرے بپا
بادل تو آج محو خود اپنی کڑک میں ہے

آمادۂ سفر مجھے رکھتی ہے رات دن
سچ پوچھیے تو یہ جو رکاوٹ سڑک میں ہے

کچھ روز سلسلے کو چلا اور ابھی، ظفر
رسوائیاں ہیں دور، ابھی بات شک میں ہے

☆

بجتے تھیں اب ٹن ٹن ٹے
چپ ہیں گھنٹے مندروں کے گھنٹے

کالج سے اُس کی واپسی تک
چوراہے میں کھیلتے ہیں بٹے

ظاہر کچھ ہیں، باطن میں کچھ اور
یہ مسجد شوق کے مُلٹے

اب چاہے بیٹھ کر شرافت
تر مال تو لے اُڑے لفٹے

ہر رات کا راستہ جُدا ہے
حیران ہیں روز کے بھرٹے

جب شیر نے دَم دیے سرِشام
جنگل سے نکل گئے ہرنٹے

تو • بالغاں ہے اور ہم
بچے ہوئے جب سے کانوٹے

چوری ، یاری ، قمار ، نشہ
میں ایک ہوں اور ہزار ٹنٹے

بے شک وہ بھی، ظفر، بہت ہیں
ہیں آپ بھی ایک انٹ شنٹے

☆

چھیڑا اُسے آج پھر ، پٹھاں سے
کھائے ہیں آج بھی طمانچے

تھا حاصلِ جمع گالیوں کا
حیا پانچا کہ تین پانچے؟

کچھ مُنہ کا مزا بدل ، نکل کر
باہر کیا کیا لگے ہیں خوانچے

ڈھیلی ڈھالی قمیص اتنی
شلوار کے اتنے تنگ پانچے

ڈھلنے کو ہیں بے قرار ہم بھی
دو چار جو فالتو ہوں سانچے

علامہ کو بد دُعائیں مت دو
پرچے تو لونڈیا نے جانچے

روٹی کپڑا ہے کیا ضروری
چلتے پھرتے تو ہیں یہ ڈھانچے

سکڈ بائی جو آن جیکسن وولف
ویل کم شن پیاؤ تانگ شاں سے

بتلاؤ ذرا حساب کر کے
آئی ہے ، ظفر ، کہاں کہاں سچ

☆

مصروفِ کار تو نظر آتا بھی چور ہے
یہ ہاتھ پانو توڑ کے بیٹھا بھی چور ہے

اس سے بھی ہوشیار، کہ یہ چور چور کا
کوٹھے پہ چڑھ کے شور مچاتا بھی چور ہے

گٹھڑی میں اُس کا دستِ سفید آ گھسا ہے پھر
جس کو ضمیرِ شہر سمجھتا بھی چور ہے

ہوتے تھے چور ہر دو فریقِ مقدمہ
کرسی پہ اب تو بیٹھ کے سُنتا بھی چور ہے

منڈی لگی ہوئی ہے، پسند اپنی آپ کی
گورا بھی دستیاب ہے، کالا بھی چور ہے

جاتا ہے اُس کا چور لیے مال و زر تو کیا
پیچھے ہی پیچھے اُس کے ہمارا بھی چور ہے

کچھ تو کرے گا آپ کی خدمت بھلی بُری
یعنی قبول کیجیے جیسا بھی چور ہے

اس صاف گوئی کی بھی ذرا دیجیے گا داد
جو ہے سو اپنے آپ کو کہتا بھی چور ہے

دیواں ہی اپنے نام سے چھپوا دیا، ظفر
اے سینہ زور، کیا کوئی ایسا بھی چور ہے

☆

''ظفر اقبال کی شاعری دراصل ایک خوب صورت بٹن کی مانند ہے۔ ایک ایسا بٹن جو لنڈے کے پُرانے کوٹ سے اُتار کر شہر کی سب سے دیدہ زیب عورت اپنے چمڑے کے چمکیلے کوٹ میں ٹانک لے۔ ایسے بٹن کی ایک یادداشت ہوتی ہے۔ اس نے نہ صرف سات سمندر پار کا سفر کیا ہوتا ہے، بلکہ اُس کے سُوراخوں سے کئی مقامی احساسات کی کیفیتیں چھن چھن کر نکلی ہوتی ہیں۔

ظفر کی شاعری تمنا کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔ تمنا کی ابتری نے ہمیشہ بڑے اچھے شاعروں کو جنم دیا ہے جو بڑی اونچی سطح پر سوچتے ہیں اور بڑی عام سی ڈب کھڑبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ عام انسان بڑا خوش نصیب ہے کہ وہ عام ہونے کی سزا مُعاشرے سے پاتا ہے۔ خاص ہونے کی سزا دونی ہے۔ اپنے حصے کی سزا مُعاشرے سے بھی ملتی ہے اور اپنے آپ سے بھی۔ اسی دوہرے کیمیائی عمل سے گزر کر شاعری کا جن شاعر کے وجود کو چھوڑ کر سارے مُعاشرے پر مُسلط ہو جاتا ہے۔ پھر ظفر اقبال کے شعر اُس کے سینے کا بوجھ نہیں رہتے۔ یہ دوا خوب صورت لیبل کے ساتھ دکانوں میں ''رطب و یابس''، ''گلافتاب'' اور ''آبِ رواں'' بن کر بکنے لگتی ہے۔ مجھ سا عام انسان جسے صرف مُعاشرے سے سزا پا کر پاک وصاف ہو جانے کا حکم تھا، میں اس بوتل کے چار قطرے پیتی ہوں اور اس طرح میرے اندر بھی بدی کا بیج سا سما جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا واقعہ یہ پیش آیا کہ اردو جو فراق گورکھپوری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی زبان بھی تھی، جس میں کرشن چندر اور منشی پریم چند نے کہانیاں لکھیں، وہ بھی مجھوب وحیران ہو کر بلا قصور، بلاوجہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلی آئی۔ مُسلمانوں سے نفرت کا ہندوستان میں یہ عالم تھا کہ ایک جیتی جاگتی، ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان کو اُنھوں نے شُدھی کیا اور ہندی کا رُوپ دے کر مطمئن ہو گئے۔

پنجاب میں اس بیوہ نے عجیب رُوپ دھارا۔ بڑی صحت مند، مُشٹنڈی اور ست رُوپی

نکل آئی۔ اس رُوپ کو سنوارنے میں ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بڑا عمل دخل رہا ہے جو بڑے صحت مند اور اس دھرتی سے گہرے طور پر منسلک تھے۔ لیکن یوں یوں وہ اُردو کی نوک پلک سنوارتے، اُردو کے پُرانے چاہنے والے جو نشوونما کے شوقین تھے اور اُردو کو اس درخت کی طرح پالنا چاہتے تھے جو دو سال کا ہو کر بھی سوا فٹ سے اُونچا نہیں ہوتا۔ ایسے اُردو نوازوں کو بڑا دُکھ ہُوا۔ اُنھوں نے پکار پکار کر زبان دانی کے خملہ کو الف و ضوابط سے ڈرایا۔ وہ سجاوٹ، وہ ست رنگی خوش پوشی جس سے اُردو کا دامن سج رہا تھا، اُس پر اعتراض کیا، لیکن یہ سب بے سُود رہا۔

یہاں میں اپنے پہلے بیان کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہوں کہ ظفر اقبال کی شاعری ایک خوب صورت بٹن ہے جس میں چار سوراخ ہیں اور تمنا کی اتری کا مضبوط دھاگا۔ ایک ظفر کا ایسا وجود ہے جو اندر سے ڈسا ہُوا ہے۔ اس بٹن کے ایک سوراخ میں اُس کے زبان کے تجربات کا کنواں ہے۔ دُوسرے سوراخ سے آپ گھروں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔ تیسرے سوراخ سے گلابی مزاج کی دُھوپ جھلکتی ہے اور چوتھا سوراخ بہت مُہیب اور غم دیدہ ہے۔ یہاں خوف کی چمگادڑیں اُلٹی لٹکی نظر آئیں گی۔ یہ چاروں سوراخ ہیں جنھیں تمنا کی اتری سیتی ہے۔ جس روز اُسے شبہ ہو گیا کہ بٹن درستی سے لگ گیا ہے، وہ اس میں آخری گانٹھ لگا کر ظفر کے وجود سے اپنا دھاگا توڑ لے گی۔ پھر ہمارے پاس صرف لیبل لگی کتابیں رہ جائیں گی۔ ظفر ہم میں موجود نہیں ہوگا۔"

بانو قدسیہ
(مضمون سے اقتباس)

"فیض اور ناصر کاظمی کے عہد میں غزل میں شاید ہی کسی شاعر کو اتنی انفرادیت اور اتنی شہرت حاصل ہُوئی ہے جتنی ظفر اقبال کو۔ دُوسرے لفظوں میں اب وہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا غزل گو ہے۔ اُس کی شاعری میں تو مجھے ایک جیتا جاگتا، ہنستا بولتا، عشق کرتا، مُسکراتا، چلتا پھرتا انسان نظر آتا ہے، جس میں ایک طرح کا چُلبلا پن بھی ہے۔ تخلیق کی ایک نئی جہت تلاش کرنے کی خواہش ہی نہیں اُس کا بھرپُور اظہار بھی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے مزاج کی شرارت اور معصومیت دونوں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

وہ راستہ چلتا ہی نہیں ٹھوکر بھی لگاتا ہے، پھولوں کی تعریفیں ہی نہیں کرتا اُنھیں شاخوں سے توڑتا بھی ہے، کُچل کر پھینک بھی دیتا ہے، اور پھر اسی زمین میں نئے نئے بیج بوتا ہے بلکہ نئی نئی زمینوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر منڈلاتا پھرتا ہے۔ لسانی تجربے، اینٹی غزل۔ یہ سب باتیں جو اس کی بدنامی کا باعث تھیں، وہی اُس کی شہرت کا سبب بن گئیں۔ اگر مجھے اپنا مذہب اجازت دیتا تو میں اُسے نئی غزل کا جبریل کہتا۔ لیکن میں اُسے نئی غزل کا جبریل اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ وہ دراصل نئی غزل کا پیغمبر ہے۔ بلکہ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اُردو میں فراق، فیض اور ناصر کاظمی کی تلافی ظفر اقبال کا "رطب و یابس" کر دے گا۔ جی ہاں ظفر اقبال نستعلیق اور شکستہ دونوں طرح غزل لکھنا جانتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ظفر اقبال کے کلام کی بُوالعجبیاں اچھی لگتی ہیں، اس لیے کہ وہ اُردو کا دوست ہے، دُشمن نہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس کے کلام میں اپنی انفرادیت ہے، اپنی زبان کے روڑے ہیں، اور بلاشبہ اُس نے کہیں کہیں محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے، لیکن خوب کیا ہے۔ کہیں کہیں لفظوں کے توتا مینا بھی بنائے ہیں اور شہزادہ جانِ عالم کی طرح کسی توتے کے پیچھے شہزادی کو دیکھنے اور اُسے حاصل کرنے کا چکر اُسے نہ جانے کتنے طلسمات میں لیے پھرا ہے، لیکن بہ ہر حال اس سارے طلسمات سے نکل کر زندہ سلامت گھر آ جاتا ہے۔"

قمر جمیل

نسرین، آفتاب، عائشہ، شانزے اور یحیٰ کے نام

مَیں اپنے خواب یہاں چھوڑ جاؤں گا اِک دِن
جو کر سکو تو ذرا دیکھ بھال کر لینا

بہت بے سود ہے، لیکن ابھی کچھ اور دن مجھ کو
سوادِ صبح میں رہ کر شمارِ شام کرنا ہے
نشاں دینا ہے مَیں نے کچھ غبار آلود سمتوں کا
کوئی کافی پُرانا راز طشت از بام کرنا ہے

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میرؔ
اس آبِ خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

وہی منظر برف برسنے کے ، وہی گھڑیاں دھوپ نکلنے کی
کبھی سلسلہ وار سہیلیں ہیں ترے موسمِ راز میں ڈھلنے کی

یہ جو خواب خیال اُمیدیں ہیں ، یہ جو وصل وصال نویدیں ہیں
مرے سال سفر کی کلیدیں ہیں تری روشن راہ پہ چلنے کی

کہیں ساعتِ سبز کا عکس اُڑے ، کہیں گریۂ شام کی موج مُڑے
کوئی سعیِ سعید حجاب میں ہے ترا لمس لباس بدلنے کی

کسی سان گمان کرشمے پر کوئی نقش لبوں کے لرزنے کا
کسی خواب سراب سمندر میں کوئی لہر لہو کے اُچھلنے کی

یہ جو زخموں کی پھُلجھڑیاں ہیں ، یہی صورت صورت کڑیاں ہیں
اِسی خار خمار خرابے میں مرے گرنے اور سنبھلنے کی

آرام حرام ہے میرے لیے ، یہی شام انعام ہے میرے لیے
ترے ہجر کی آگ میں جلنے کی ، اِسی آگ میں پھولنے پھلنے کی

وہی میں ہوں ظفرؔ مری راہ وہی ، مرے دل کا یہ سنگِ سیاہ وہی
کہیں پردۂ غیب میں صورت ہو کوئی اِس پتھر کے پگھلنے کی

☆

غبارِ آرزو میں روشنی ہے
ترے دم سے لہو میں روشنی ہے

دھندلکا ہے نئی آبادیوں پر
پرانے کاخ و کُو میں روشنی ہے

ہوئے جاتے ہیں رستے خود منوّر
کہ اُس کی جستجو میں روشنی ہے

اندھیرے میں چمک اُٹھتا ہوں کیوں کر
یہ کیسی گفتگو میں روشنی ہے

کسے میں نے پکارا ہے سرِ شام
ظفرؔ ، میرے گلو میں روشنی ہے

☆

چٹکتی وسعتوں میں جو گلِ صحرا کھلا ہے
کوئی کہہ دے اگر پہلے بھی ایسا کھلا ہے

ازل سے گلشنِ ہستی میں ہے موجود بھی وہ
مگر لگتا ہے جیسے آج ہی تازہ کھلا ہے

بہم کیسے ہُوئے ہیں، دیکھنا، خواب اور خوش بُو
گزرتے موسموں کا آخری تحفہ کھلا ہے

لہو میں اک الگ انداز سے مستور تھا وہ
سرِ شاخِ تماشا اور بھی تنہا کھلا ہے

کہاں خاکِ مدینہ اور کہاں خاکسترِ دل
کہاں کا پھول تھا لیکن کہاں پر آ کھلا ہے

کبھی دل پر گری تھی شبنمِ اسمِ محمدؐ
مری ہر سانس میں کلیوں کا مجموعہ کھلا ہے

یہی روزن بنے گا ایک دن دیوارِ جاں میں
مرے دل میں ندامت کا جو اک لمحہ کھلا ہے

یہیں تک لائی ہے یہ زندگی بھر کی مسافت
لبِ دریا ہوں میں اور وہ پسِ دریا کھلا ہے

بکھرتا جا رہا ہے دُور تک رنگِ جُدائی
ظفر، کیا پُوچھتے ہو زخمِ دل کیسا کھلا ہے

☆

چلو اتنی تو آسانی رہے گی
ملیں گے اور پریشانی رہے گی

اسی سے رونقِ دریائے دل ہے
یہی اک لہر طوفانی رہے گی

کبھی یہ شوق نامانوس ہو گا
کبھی وہ شکل انجانی رہے گی

نکل جائے گی صُورت آئنے سے
ہمارے گھر میں حیرانی رہے گی

تنگ سر ہو کے جینا ہے کوئی دن
ابھی کچھ دن گراں جانی رہے گی

سخن کے لفظ میں بھی پھڑپھڑاہٹ
لہو میں بھی پرافشانی رہے گی

ہماری گرم گفتاری کے باوصف
ہوا اتنی ہی برفانی رہے گی

ابھی دل کی سیاہی زور پر ہے
ابھی چہرے پہ تابانی رہے گی

ظفر، میں شہر میں آ تو گیا ہوں
مری خصلت بیابانی رہے گی

☆

نہیں کہ ذوقِ سماعت بیاں کے بعد ہوا
زباں کا معجزہ قطعِ زباں کے بعد ہوا

سفر کی سمت کا اندازہ اب کی بار مجھے
اگر ہوا تو کہیں درمیاں کے بعد ہوا

بڑا مزا دلِ گم گشتہ کی تلاش میں ہے
زیاں کا فائدہ ظاہر زیاں کے بعد ہوا

دلِ تباہ کی اس نے خبر نہ لی، لیکن
خراب آپ بھی وہ خانماں کے بعد ہوا

رہا اگرچہ خفا، تھا تو شہر میں موجود
بہت اداس میں اس بدگماں کے بعد ہوا

مرے زوال میں موسم کی کوئی قید نہ تھی
خزاں میں ہو نہ سکا جو خزاں کے بعد ہوا

مجھے پتا نہ چلا، تھا میں اپنے خواب میں گم
شعورِ برق مجھے آشیاں کے بعد ہوا

اب اس میں گردِ سفر کا قصور کیا ہے، ظفر
روانہ میں ہی اگر کارواں کے بعد ہوا

☆

ابھی آنکھیں کھلی ہیں اور کیا کیا دیکھنے کو
مجھے پاگل کیا اس نے تماشا دیکھنے کو

وہ صورت دیکھ لی ہم نے تو پھر کچھ بھی نہ دیکھا
ابھی ورنہ پڑی تھی ایک دنیا دیکھنے کو

تمنا کی کسے پروا، کہ سونے جاگنے میں
میسر ہیں بہت خوابِ تمنا دیکھنے کو

بظاہر مطمئن میں بھی رہا اس انجمن میں
سبھی موجود تھے، اور، وہ بھی خوش تھا دیکھنے کو

اب اس کو دیکھ کر دل ہو گیا ہے اور بوجھل
ترستا تھا یہی دیکھو تو کتنا دیکھنے کو

اب اتنا حسن آنکھوں میں سمائے بھی تو کیوں کر
وگرنہ آج اسے ہم نے بھی دیکھا دیکھنے کو

چھپایا ہاتھ سے چہرہ بھی اس نامہرباں نے
ہم آئے تھے ظفر، جس کا سراپا دیکھنے کو

☆

یہ فیصلہ ہے کہ خود سے خفا نہیں رہنا
وہ جل گیا تو پھر اُس سے جدا نہیں رہنا

ہنسی خوشی یونہی دن کاٹنا ہیں فُرقت کے
اُداس پھرنا نہیں ، مبتلا نہیں رہنا

وہ رات رہنے کو آیا تھا اپنے گھر سے ، مگر
جو مَیں نے پُوچھا تو کہنے لگا ، نہیں رہنا

وہی اُمید خرابی ہے طبع سے اپنی
اگرچہ موسمِ دل ایک سا نہیں رہنا

یہ کیفیت ہے کہ اب کے خبر کسی کو نہیں
کہ کیا بہار میں رہنا ہے ، کیا نہیں رہنا

بغیر سانس لیے دن گزارنا ہیں کہ اب
رہے اگر تو رہینِ ہوا نہیں رہنا

وہ کاروبار کریں گے خدا کے نام پہ ہم
کہ اس نواح میں نامِ خدا نہیں رہنا

بے زباں ہوں مَیں ، بچ میری بددعا سے کہ تُو
نہیں رہے گا اگر کہہ دیا نہیں رہنا

اُمیدِ وصل غلط بھی نہیں کہ اُس بُت نے
ظفر ہمیشہ تو یُوں بے وفا نہیں رہنا

☆

رُخِ زیبا اِدھر نہیں کرتا
چاہتا ہے ، مگر نہیں کرتا

سوچتا ہے ، مگر سمجھتا نہیں
دیکھتا ہے ، نظر نہیں کرتا

بند ہے اُس کا در اگر مجھ پہ
کیوں مجھے دربدر نہیں کرتا

حرفِ انکار اور اتنا طویل
بات کو مختصر نہیں کرتا

نہ کرے ، شہر میں وہ ہے تو سہی
مہربانی اگر نہیں کرتا

حُسن اُس کا اُسی مقام پہ ہے
یہ مُسافر سفر نہیں کرتا

جا کے سمجھائیں کیا اُسے ، کہ ظفر
تُو بھی تو درگزر نہیں کرتا

☆

سراب دیکھنے کو ، اِنتظار کرنے کو
کرو تو کام پڑے ہیں ہزار کرنے کو

دکھائی دیتی نہیں شکل اب وصولی کی
کہ اُس سے کر تو لیا ہے اُدھار کرنے کو

وہ رُوٹھتا رہے اور ہم اُسے منایا کریں
کہا تھا کس نے یہ تقسیمِ کار کرنے کو

کریں گے ہم بھی ، مگر ، وقت چاہیے ہم کو
یہ بے حسی کی روش اِختیار کرنے کو

خود اُس کے دل سے اُٹھے گی صدا تسلّی کی
بہت کہو نہ اُسے اعتبار کرنے کو

کلید بوسہ کہیں وہ بھی رکھ کے بھول گیا
یہاں بھی دل نہیں ملتا نثار کرنے کو

گناہگار تو پہلے کرو ہمیں اِک بار
ہو بے قرار بہت سنگسار کرنے کو

اُتار پھینکنے کو اب یہی ہے چادرِ چشم
وہی ہے دامنِ دل تار تار کرنے کو

بساطِ شوق ہی اُس نے لپیٹ دی ہے ، ظفر
اُداس ہو جسے لپٹا کے پیار کرنے کو

☆

سیدھا تھا مسئلہ مگر اُلٹا سمجھ لیا
غیروں کا غیر تھا جسے اپنا سمجھ لیا

اب کے ممانعت بھی اجازت لگی مجھے
دیوار تھی کہ جس کو دریچہ سمجھ لیا

اُس کی بھی اُلجھنیں ہیں ، مسائل ہیں اُس کے بھی
جلتی تھی آگ ، مَیں نے تماشا سمجھ لیا

اپنی بُرائیوں کی خبر تھی مجھے ، مگر
اُس نے کہا تو مَیں نے بھی اچھا سمجھ لیا

مَیں ہی سمجھ سکا نہ اُس آئینہ رُو کا بھید
ورنہ اُسے تو جس نے بھی دیکھا ، سمجھ لیا

کہتا ہے ، سچ بتائیں ، محبت ہے یا مذاق
اُس نے مجھے بھی اپنے ہی جیسا سمجھ لیا

ناممکنات میں سے ہے وصل اُس کا ، اے ظفر!
حیران ہوں کہ آپ نے بھی کیا سمجھ لیا

☆

[illegible] سکوں کسی اختیار سے باہر
نہیں ہے یہ بھی مرے اختیار سے باہر

بروں خاک نہیں میرے نام کی تحریر
نہاں نہیں مرا نقش غبار سے باہر

حساب اُس کا ہے درپیش، حد نہیں جس کی
شمار اُس کا ہے جو ہے شمار سے باہر

کسر نکالتا ہے خوب گھر پہنچتے ہی
مجھے کہ رکھتا ہے وہ اتنے پیار سے باہر

کسی نے رُخ نہ کیا اُس کے بعد جنگل کا
نہ شیر ہی کبھی نکلا کچھار سے باہر

اُمیدوارِ کرم ہم بھی تھے وہاں اب کے
مگر، کھڑے رہے شاید قطار سے باہر

بس ایک حسرتِ ہم خواب دل میں تھی، وہ بھی
نکل چکی ہے لہو کے مدار سے باہر

میں ایک عمر سے کوشش میں ہوں نکلنے کی
طلسمِ دائرۂ انتظار سے باہر

دکھا ہمیں کبھی اُس کا بھی اصل چہرہ، ظفر
نکال اُسے بھی ہوس کے حصار سے باہر

-☆-

نظر کو چھوڑیے، صرفِ نظر ہی ممکن ہے
قیام کر نہیں سکتے، سفر ہی ممکن ہے

اثر تو خیر بڑی بات ہے، کہ اُس بُت پر
بہت کرو تو گمانِ اثر ہی ممکن ہے

ہم ایک بار جو قائل نہ کر سکے اُس کو
تو اس لیے کہ یہ بارِ دگر ہی ممکن ہے

نہ اور اُونچی صدا میں پکارنا اُس کو
کہ آج کل تو فقط اس قدر ہی ممکن ہے

جسے سمجھتے رہے ایک عمر ناممکن
پتا چلا ہے کہ وہ سربسر ہی ممکن ہے

بتا بھی سکتا ہوں کب تک بھلا سکوں گا اُسے
مگر، یہ بات اُسے دیکھ کر ہی ممکن ہے

وہ مہرباں ہے تو مل لو جہاں بھی ہو ممکن
کہ اب کے گھر تو نہیں، رہگذر ہی ممکن ہے

فضول طولِ ملاقات پہ نہ کر اصرار
کہ چل چلاؤ ہے اور مختصر ہی ممکن ہے

ہنروری تو بہت دور کی ہے بات، ظفر
ابھی تو کوششِ خوابِ ہنر ہی ممکن ہے

-☆-

یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آ گیا
جب رہ نہیں سکا تو بہانے سے آ گیا

ہم کر کے بات پھنس گئے اپنے ہی جال میں
کیسا پلٹ کے تیر نشانے سے آ گیا

وہ مرحلہ کہ ڈرتے رہے جس سے ایک عمر
خوابوں کے ساتھ خواب جلانے سے آ گیا

آتا نہ تھا کبھی ہمیں اپنا خیال کچھ
اتنا بھی اُس کے پاس بٹھانے سے آ گیا

کیا لاتعلقی سے ہُوا فائدہ ہمیں
کیا اُس کے ہاتھ بات بڑھانے سے آ گیا

اب جو سلوک بھی وہ کرے، ہے روا اُسے
کیوں میں ہی اُٹھ کے اپنے ٹھکانے سے آ گیا

کچھ اور بھی سپولیے حق دار تھے، ظفر
میں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آ گیا

☆

سرکش سہی، فی الحال تو سر بھی نہیں رکھتے
کیا اہلِ نظر ہیں کہ نظر بھی نہیں رکھتے

کرتے ہیں گلہ بھی کہ ثمر ہی نہیں آتا
کچھ رابطہ شاخ و شجر بھی نہیں رکھتے

اک لرزشِ بے نام ہے پہلو میں گرہ گیر
ظاہر میں کوئی خوف و خطر بھی نہیں رکھتے

دنیا سے بھی محتاط ہیں اور دل سے بھی مجبور
روتے بھی ہیں اور دیدۂ تر بھی نہیں رکھتے

کچھ تو ترے جانے کا یقیں بھی نہیں ہم کو
کچھ ہم ترے آنے کی خبر بھی نہیں رکھتے

یہ نالۂ دل ہے کہ اثر ہی نہیں کرتا
کر جائے تو ہم تاب اثر بھی نہیں رکھتے

کافی ہے یہاں ایک اشارہ ہی سفر کا
کہتے ہو تو ہم رختِ سفر بھی نہیں رکھتے

جس دن سے اُدھر جانے سے روکا ہے ذرا سا
اُس دن سے قدم آپ اِدھر بھی نہیں رکھتے

شرمندہ بہت ہیں ظفر اس عیبِ سخن پر
اور، اس کے سوا کوئی ہنر بھی نہیں رکھتے

☆

عجیب سلسلہ روزگار رکھتے ہیں
کہ معتبر نہیں، اور، اعتبار رکھتے ہیں

ہمیں ہے عشرتِ آغازِ خواب ہی کافی
اگرچہ خواہشِ پایانِ کار رکھتے ہیں

کچھ اُس کے لطف و کرم کا حساب ہے کوئی
نہ اپنی حسرتِ دل کا شمار رکھتے ہیں

اگر شہید ہوں ہیں تو اس قماش کے ہم
کہ جس پہ مرتے ہیں اُس کو بھی مار رکھتے ہیں

وہ سامنے ہو تو بے اختیار ہو جائے
ہم اپنے دل پہ یہی اختیار رکھتے ہیں

یہاں پہ تھا تو یہ ضد تھی کہ وہ چلا ہی جائے
چلا گیا ہے تو اب انتظار رکھتے ہیں

اُسے ہی آب و ہوا راس ہے محبت کی
نہ ہم ہی موسمِ دل خوشگوار رکھتے ہیں

نجانے ختم بھی ہوگی کہیں یہ بارشِ خاک
نظر میں گرد ہے، دل میں غبار رکھتے ہیں

چراغ چہرہ کو بجھنے نہیں دیا، کہ ظفر
ہم اپنے گرد ہوا کا حصار رکھتے ہیں

☆

چھپا ہوا ہی کسی خوف خواب کے پیچھے
نکل پڑوں گا کبھی آفتاب کے پیچھے

بدن میں خاک اُڑاتی ہیں آندھیاں کیا کیا
جو دیکھ لو بھی اس آب و تاب کے پیچھے

ہے وہ بھی زہر، مگر ذائقہ تو بدلے گا
ہٹ سکوں نہ کسی اضطراب کے پیچھے

دبا رکھی ہے وہ تحریرِ خواب دل میں کہیں
چھپا رکھا ہے وہ منظر کتاب کے پیچھے

لہو کی لہر تھی یا سوچ کی کوئی سلوٹ
لرز رہی تھی کوئی شے شراب کے پیچھے

جئیں گے کشمکشِ زندگی میں کیا آخر
مَرے جو پھرتے ہیں خط کے جواب کے پیچھے

عجب نہیں ہے اگر مار ہی گرائیں اُسے
جو فاختائیں لگی ہیں عقاب کے پیچھے

بھلا رکھا نہیں یوں ہی خدا کی دُنیا کو
پڑے ہوئے نہیں یوں ہی جناب کے پیچھے

ظفر، جو ہو نہیں سکتا اُسی کے درپے ہو
فضول بھاگ رہے ہو سراب کے پیچھے

☆

جسے بھی اس پہ ہے دعوائے جبر، بکتا ہے
ہوا ہے وہ تو، اُسے کون روک سکتا ہے

بس ایک بار پڑا تھا اُس آفتاب کا عکس
یہ دل، یہ سنگ سیہ رات بھر چمکتا ہے

یہ اتفاق نہیں ہے جو رنگ زرد اُس کا
کبھی کبھی مرے چہرے سے بھی جھلکتا ہے

کہیں چھپائے بھی چھپتی نہیں خوشی اُس کی
غم اُس کی گود میں بچہ سا جب ہمکتا ہے

نہیں ہے صبر کی گنجائش اس قدر دل میں
مگر، ابھی یہ پیالہ کہاں چھلکتا ہے

میں قتل ہو کے بھی خوشبو بکھیرتا ہوں، ظفر
لہو گلاب کی صورت پڑا مہکتا ہے

☆

نظر کا پھیر ہے یا مال ہی کچھ ایسا تھا
کہ ہم تو بھول گئے چال ہی، کچھ ایسا تھا

کوئی بچاؤ کی صورت نہ تھی کہیں باقی
بُرے پھنسے ہیں، کہ وہ جال ہی کچھ ایسا تھا

تمام شہر سلامت ہے میرے گھر کے سوا
یقین کیجیے، بھونچال ہی کچھ ایسا تھا

کچھ اپنے آپ پہ قابو بھی چاہیے، اے دل
لبوں کا رنگ اگر لال ہی کچھ ایسا تھا

یونہی تو پوچھتا پھرتا نہیں تھا لوگوں سے
کہ اُن دنوں میں مرا حال ہی کچھ ایسا تھا

میں خود بھی اُس سے نکلنا نہ چاہتا تھا ابھی
نہ پوچھیے، کہ وہ جنجال ہی کچھ ایسا تھا

جو ظلم اُس نے کیے، اُن کا ذکر کیا کیجے
ہماری عمر میں یہ سال ہی کچھ ایسا تھا

اُسے ہماری محبت پہ شک بجا تھا، ظفر
ہمارا نامۂ اعمال ہی کچھ ایسا تھا

☆

منظر، ظفر کھلیں ہی کھلیں آفتاب کے
اُڑنے لگے ہوا میں کنارے نقاب کے

ہونٹوں سے چھو بھی لے، مگر آنکھوں کو بند رکھ
طغیانیوں میں ہیں یہ سمندر سراب کے

کالج سے اُس کو کام بہت تھا بھلا ہوا
مَیں نے بھی کچھ سوال نکالے حساب کے

کچھ بھر دیا ہے خواہشِ خالی میں رنگِ دل
کچھ پُر کیے ہیں بیٹھ کے نقشے نصاب کے

نقشہ تھا ٹنڈمنڈ درختوں کے آرپار
تھے اُس کے شارٹ کوٹ پہ چھینٹے شراب کے

بتی بُجھی تو گدلے اندھیرے میں اور بھی
چمکے حروفِ گرم و گداز اُس کتاب کے

اس شوقِ بے ثمار کا انجام ہو بخیر
اچھے نہیں لہو میں بھنور ماہتاب کے

اُلجھی ہوئی ہیں سر میں صداؤں کی گتھیاں
پانو میں کھبے ہوئے ٹکڑے ہیں خواب کے

آنکھوں میں سُرخیوں کا سفر رُک گیا، ظفر
دیکھا تو ہم اسیر تھے نیلے گلاب کے

☆

پتوں کی طرح زرد بکھرنا تو چاہیے
شہرِ شبِ خزاں سے گزرنا تو چاہیے

ڈوبے ہوؤں کو طرۂ طوفاں نے یہ کہا
سَیلِ سفر کے ساتھ اُبھرنا تو چاہیے

کچھ زندگی کا ذائقہ بدلے کسی طرح
یعنی کسی کے نام پہ مرنا تو چاہیے

لے ہی مریں گے کچھ نہ کچھ، اپنا زیاں ہے کیا
کچھ روز در پہ اُس کے پسرنا تو چاہیے

ہو جس کے گھر بھی چور ہمارا چھپا ہوا
الزام سارے شہر پہ دھرنا تو چاہیے

آنکھوں میں رنگِ تیرگیِ آب سبز ہو
آخر وہ نقشِ ناب بکھرنا تو چاہیے

ساحل سے موج موج بدن کا شمار کیا
اُس بحرِ بے صدا میں اُترنا تو چاہیے

ہوگا وہی جو دل نے کہا بابِ وصل میں
ڈرنے کی بات اور ہے، ڈرنا تو چاہیے

پکڑے گئے تو وہ بھی بھگت لیں گے، اے ظفر
فی الحال اُس کے آگے مکرنا تو چاہیے

☆

کھولے آنکھ تو منظر ہے نیا اور بہت
تُو بھی کیا کچھ ہے، مگر تیرے سوا اور بہت

جو خطا کی ہے بڑا خوب ہی پائی اُس کی
جو ابھی کی ہی نہیں، اُس کی سزا اور بہت

خوب دیوار دکھائی ہے یہ مجبوری کی
یہی کافی ہے، بہانے نہ بنا اور بہت

دیکھ، رہ جائے نہ حسرت کوئی دل میں تیرے
شور کر اور بہت، خاک اُڑا اور بہت

ہم چلے جائیں تو کیا فرق پڑے گا تجھ کو
شہر بستا رہے، گلیوں میں گدا اور بہت

سر سلامت ہے تو سجدہ بھی کہیں کر لیں گے
جستجو چاہیے، بندوں کو خدا اور بہت

کیوں پشیمان پھرو ترکِ حیا پر اِتنے
اور بازار سے لے آؤ، حیا اور بہت

عشق وہ طرفہ لطیفہ رہا، اس بار، کہ مَیں
اُس نے دوبارہ سُنایا تو ہنسا اور بہت

سر میں جھکّڑ جو چلا کرتا ہے دن رات، ظفر
یہ گرائے گا ابھی برگِ نوا اور بہت

-☆-

کی ہوس ہواؤں کے رُخ پر اُتار دے
کھوئے ہوؤں سے مل، یہ دلدر اُتار دے

بے سمت کی اُڑان ہے شوقِ شباب کی
اس چھت پہ آج تو یہ کبوتر اُتار دے

مَیں اتنا بدمعاش نہیں، یعنی کھل کے بیٹھ
چبھنے لگی ہے دھوپ، سویٹر اُتار دے

دن رات یُوں نہ خوف کا گٹھڑ اُٹھائے پھر
یہ بوجھ اپنے سر سے جھٹک کر اُتار دے

اس کی ہی آب و تاب سے روشن ہو ریگِ دل
یہ تیغ میرے سینے کے اندر اُتار دے

چہرے سے جھاڑ پچھلے برس کی کدورتیں
دیوار سے پُرانا کیلنڈر اُتار دے

یہ بات ظرف کی نہیں، ہے ماورائے ظرف
چاہے تو اس کنویں میں سمندر اُتار دے

لوگوں کے ساتھ میری لڑائی ہے آج کل
بہتر ہے مجھ کو شہر سے باہر اُتار دے

تُو خود تو سات پردوں میں مستور ہے، ظفر
ملبوس تیرے آگے وہ کیوں کر اُتار دے

-☆-

سو بھی تمام گرمیِ بازار کا بدن
یاقوت لب پہ گوہرِ گفتار کا بدن

ہر شام دائرے سے بناتا ہے میرے گرد
اُس جسمِ جاں گداز کے اسرار کا بدن

چمکے گا پھر ہوائے بیاباں کی رات میں
ریگِ ہوس پہ وعدۂ دیدار کا بدن

دل میں کھلا ہے ٹوٹتی راتوں کا زہر زرد
پگھلا ہے سر میں صبح کے آثار کا بدن

پھیلے ہوئے ہیں کائی زدہ لفظ ہر طرف
ہے درمیاں میں حسرتِ اظہار کا بدن

پھرتا ہے گرد باد کی صورت کہاں کہاں
دل کی فضا میں خاک خبردار کا بدن

آغاز شیشہ رنگ ، تمنا کی ابتری
پانی کا پھول ، عکسِ گرفتار کا بدن

دریا تو اپنا آپ ہے ، کیسے عبور ہو
بے شک پکارتا رہے اُس پار کا بدن

مخفی ہے اُس کی رمز بدن در بدن ، ظفر
انکار کے بدن میں ہے اقرار کا بدن

-☆-

جو تھے امیر اب اُن کو فقیر تو دیکھو
رہا کیے ہوئے اپنے اسیر تو دیکھو

ہمارا ایک نظر دیکھنا بھی تھا معیوب
اور ، اب یہ سلسلہ دار و گیر تو دیکھو

وہ ظرف تھا کہ لئے ابتدائے عشق میں ہم
ٹھہر تو جاؤ ، ہمارا اخیر تو دیکھو

ہم اُس سے کچھ بھی نہیں چاہتے ، وہ ہے تو سہی
ہماری خاکِ طلب کا خمیر تو دیکھو

ہنسی مذاق تو ظاہر کا رنگ ہے اُس کا
جو اُس کے دل میں ترازو ہے تیر تو دیکھو

ظفر ، غلط ہے کہ میں اُس کو پا نہیں سکتا
یہ میرے ہاتھ پہ اُس کی لکیر تو دیکھو

-☆-

دیکھتے دیکھتے ویراں ہُوئے منظر کتنے
اُڑ گئے بامِ تمنّا سے کبوتر کتنے

ہم ذرا صبر جو کرتے تو وہ خُود کہہ دیتا
بن گئے کہہ کے وہی بات سُبک سر کتنے

لڑکیاں سُنتی نہیں، دیکھتی رہتی ہیں اُسے
روز بیکار چلے جاتے ہیں لیکچر کتنے

کوئی مطلب ہے محبت کا نہ مقصد ہے کوئی
ذائقے ہیں، مگر اس زہر کے اندر کتنے

اُس سے مانگا نہ کبھی خُونِ تمنّا کا حساب
اُس سے پُوچھا نہ کبھی ہیں ترے پیکر کتنے

ایک اُمّید کہ جھوٹی ہی سہی، پر دیکھو
اسی اُمّید سے روشن ہیں یہاں گھر کتنے

کیوں نہ جھگڑا ہو یہاں عرسِ غزل پر ہر بار
قبر ہے ایک ظفرؔ، اور مجاور کتنے

-☆-

ایسا نہیں کہ دادِ ہُنر دیجیے مجھے
اک بار شرمسار تو کر دیجیے مجھے

میری تو خامیاں ہُوئیں سب آشکار، اب
اپنی بھی خُوبیوں کی خبر دیجیے مجھے

درپیش ہے، مسافتِ موہوم ہی سہی
کچھ آپ بھی تو زادِ سفر دیجیے مجھے

تعریف کو طلب ہی سمجھ لیجیے، مگر
طعنہ تو یہ نہ شام و سحر دیجیے مجھے

بدنام ہُوں، بُرا ہُوں، غلط ہُوں، غریب ہُوں
موقع تو ایک بار، مگر دیجیے مجھے

بے فائدہ ہے جال بچھانا یہاں، ظفرؔ
اچھا ہی مشورہ ہے اگر دیجیے مجھے

-☆-

لرزشِ پردۂ اظہار کا مطلب کیا ہے
ہے یہ دیوار تو دیوار کا مطلب کیا ہے

جس کا انکار ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں
جانتا ہی نہیں انکار کا مطلب کیا ہے

ایک بار اُس نے اگر دے ہی دیا صاف جواب
پھر اُسی بات پہ اصرار کا مطلب کیا ہے

بیچتا کچھ نہیں اُس نے تو خریدار ہیں کیوں
آخر اس گرمیٔ بازار کا مطلب کیا ہے

اُس کی راہوں میں بکھر جائے یہ خاکسترِ چشم
اور اپنے لیے دیدار کا مطلب کیا ہے

ربط باقی نہیں الفاظ و معانی میں، ظفر
کیا کہیں اُس سے کہ اِس پیار کا مطلب کیا ہے

-☆-

اب تو یہ انتظام رکھنا ہے
کام سے اپنے کام رکھنا ہے

نشہ اُن خواب خواب آنکھوں کا
اپنے اُوپر حرام رکھنا ہے

وہ بھی ہیں رکھ رکھاو کے قائل
ہم کو بھی احترام رکھنا ہے

اُس کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے
طبع کو ہم نے خام رکھنا ہے

اُس کا مقصد اسیر کرنا نہیں
اِک ذرا زیرِ دام رکھنا ہے

اُس نے پیدا کیا سوال، ظفر!
مَیں نے اب اُس کا نام رکھنا ہے

-☆-

بستی میں ہے پانی تو نگر میں بھی ہے پانی
جل تھل نہیں بازار ہی، گھر میں بھی ہے پانی

یہ چھت ہے کہ چھلنی ہے کوئی، اس کے علاوہ
دیوار میں مرتا ہے تو در میں بھی ہے پانی

سامان تو بھیگا ہے کہ بچتا نہ کسی طور
ساماں کے، نگر، زیر و زبر میں بھی ہے پانی

وہ ٹوٹ کے برسا ہے، بہا لے گیا ہر شے
پانی میں ضرر ہے تو ضرر میں بھی ہے پانی

کھاتا بھی ہے لبریز، کھتونی بھی لبالب
میدان میں بھی، راہگزر میں بھی ہے پانی

پہنچے کوئی کیا، پانو کی زنجیر ہے بارش
دیکھے کوئی کیا، ظرفِ نظر میں بھی ہے پانی

اُس حُسن کی آنکھوں کے اُفق پر بھی ہیں بادل
اُس زُلف کے پیچیدہ بھنور میں بھی ہے پانی

کس طرح خیالات شرابور نہ ہوتے
سوچو تو یہاں کاسۂ سر میں بھی ہے پانی۔

چُپ رہیے تو بس ڈوبتے ہی جائیے ہر دم
کہیے تو ظفر عرضِ ہنر میں بھی ہے پانی

☆

گھونسلے، شاخیں، ثمر، سارا شجر پانی میں ہے
کیا وضاحت ہو کہ کیا کچھ سربسر پانی میں ہے

سر پہ تھا ساماں کہ پھر بارش نے آ گھیرا ہمیں
جو نکالا تھا ابھی، بار دگر پانی میں ہے

طعنے دیتا تھا کبھی خانہ بدوشی کے ہمیں
آج اُس بے مہر کا اپنا بھی گھر پانی میں ہے

ہر کوئی باراں گزیدہ ہے، جہاں بھی، جو بھی ہو
یہ اِدھر بوچھار میں ہے، وہ اُدھر پانی میں ہے

جو جہاں موجود ہے اُس کو غنیمت جان لو
جو کہیں گم ہو گیا اُس کی خبر پانی میں ہے

ایک ہی صف میں ہیں، کس کا ہو بیاں، کس کا نہ ہو
مُعتبر پانی میں ہے، نامعتبر پانی میں ہے

اور کیا مذکور ہو، اتنا سمجھ لیجے، اگر
زندگی ہے اک سفر، رختِ سفر پانی میں ہے

اُس کا ہی کچھ بچ رہا ہو ڈوبنے سے، دیکھنا
کیا کہیں، اپنا تو سب عیب و ہنر پانی میں ہے

آزما لے وہ ہمارے حوصلے بے شک، ظفر
دیکھنا ہے، آپ بھی وہ کس قدر پانی میں ہے

☆

یہ فردِ جرم ہے مجھ پر کہ اُس سے پیار کرتا ہوں
میں اس الزام سے فی الحال تو انکار کرتا ہوں

جھٹک دیتا ہے خوابِ وصل کا ہر رنگ آنکھوں سے
یہ کوشش ، کیا کہوں ، ہر روز کتنی بار کرتا ہوں

سُلا دیتا ہوں دل میں تھپکیاں دے کر محبت کو
بجائے اُس کے فرضی نفرتیں بیدار کرتا ہوں

کبھی حیران ہیں کیا تھا وہ سمجھوتا جدائی کا
نہ وہ اعلان کرتا ہے نہ میں اظہار کرتا ہوں

عجب کیا ہے اگر گھاٹا پڑا مجھ کو محبت میں
یہ کاروبار ہے ، اور ، میں یہ کاروبار کرتا ہوں

☆

بندھے وہ زور ظفر خاک کی روانی کے
کہ رنگ بجھنے لگے خون کی بہانی کے

کھلے بدن کی زباں سے کبھی پکار اُس کو
اُٹھا مزے بھی کبھی اپنی بے زبانی کے

اُلجھ نہیں ، روش و رنگ کا تماشا کر
جدھر سے آئے ، کبھی راستے ہیں پانی کے

پھر آئی تھی وہی لفظوں کی تند و تیز ہوا
اُڑا کے لے گئی ذرّے زرِ معانی کے

فلک پہ چاند بنی آمدِ خزاں کی خبر
زمیں کا رزق ہوئے رازِ گل بیانی کے

لبوں پہ ذائقہ ہے مرگِ شہد منزل کا
رگوں میں دوڑتے ہیں زہر زندگانی کے

لرز گیا ہے کوئی شاخ شاخ جسم ، ظفر
چمک اُٹھے ہیں کہیں نقش نوجوانی کے

☆

ہوتا رہے گا یُوں ہی نظارا کہ اب نہیں
پہلے ہی کب تھا اپنا گوارا کہ اب نہیں

چھوڑا ہے جب سے اُس نے وہ اندازِ اِلتفات
ہم نے بھی کر لیا ہے کنارا کہ اب نہیں

وہ چاند پھر چڑھے گا کبھی ، پُوچھتا ہے دل
کہتا ہے شامِ ہجر کا تارا کہ اب نہیں

دھڑکے گا جب تک اُس کی اجازت رہی یہ دل
رُک جائے گا جب اُس نے پکارا کہ اب نہیں

راضی رہیں گے اُس کی رضا پر اِسی طرح
کہنا پڑے نہ اُس کو دوبارا کہ اب نہیں

ہم اِتنے عقلمند نہ ہوں گے ، مگر ظفر
کافی تھا اُس کا ایک اشارا کہ اب نہیں

-☆-

وہ کوئی خواب پریشاں تھا ، محبت کیا تھی
یاد بھی اب تو نہیں ہے بری حسرت کیا تھی

میری آشفتہ سری کا بھی نہ تھا کوئی جواز
غمزدہ رہنے کی اُس کو بھی ضرورت کیا تھی

مُسکرا دینے پہ اُس کا تو کبھی کچھ نہ لگا
دیکھ لو ، ہم نے ادا کی ہے جو قیمت ، کیا تھی

اُس کی تردید بہرحال بجا تھی ، ورنہ
ہمیں معلوم ہے اُس کو بھی ، حقیقت کیا تھی

اب کہیں تمغۂ رُسوائی ملا اُس کے طفیل
شہر میں ورنہ ظفر آپ کی عزت کیا تھی

-☆-

کچھ ہم میں پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا
ظالم تو وہ تھا ہی، مگر اتنا بھی نہیں تھا

جب گھر سے چلے تھے تو یہ حالت تھی ہماری
دامن میں کوئی تارِ تمنا بھی نہیں تھا

حاصل تھیں اُسے جملہ تفاصیل ہماری
جب ہم نے اُسے غور سے دیکھا بھی نہیں تھا

بے بس تھا تو دعوے ہی نہ وہ باندھتا اتنے
اب اس پہ مُصر ہے کہ وہ دھوکا بھی نہیں تھا

آگے نہیں بڑھنا ہے تو واپس ہی پلٹ جائے
یہ عشق نہیں تھا تو تماشا بھی نہیں تھا

☆

میں زرد آگ نہ پانی کے سرد ڈر میں رہا
رہا تو سوئی ہوئی خاک کے خطر میں رہا

وہ گردِ باد کہ دل کی زباں کا ذائقہ ہے
نظر اُفق پہ ہویدا ہوا نہ سَر میں رہا

کہ شامل اُس میں مری لرزشِ خیال بھی تھی
جو اصل چھوڑ کے میں عکس کے اثر میں رہا

ترے لباس پہ ہو اُس کی واپسی کی چمک
جو ایک عمر ترے خون کے سفر میں رہا

گھرا تھا چاروں طرف دھوڑ کی قنات سا میں
مگن زمانہ کسی نقشِ رہگزر میں رہا

اُس ایک لمحے کی گُم گشتگی پہ خوش ہیں سبھی
جو حشر بن کے مرے سنگِ بے شرر میں رہا

یہ شہر زندہ ہے، لیکن ہر ایک لفظ کی لاش
جہاں کہیں سے اُٹھی، شور میرے گھر میں رہا

چپاتیاں تھیں بندھی پیٹ پر، مگر شب بھر
اُبھرتا ڈوبتا میں بھوک کے بھنور میں رہا

کہاں سے، کیسے، کیے، کون لے اُڑا تھا، ظفر
جو آدھی رات کو رولا سا دشت و در میں رہا

☆

ملوں اُس سے تو ملنے کی نشانی مانگ لیتا ہُوں
تکلّف برطرف ، پیاسا ہُوں ، پانی مانگ لیتا ہُوں

سوالِ وصل کرتا ہُوں کہ چکاؤں لہُو دل کا
مَیں اپنا رنگ بھرنے کو کہانی مانگ لیتا ہُوں

یہ کیا اہلِ ہوس کی طرح ہر شے مانگتے رہنا
کہ مَیں تو صرف اُس کی مہربانی مانگ لیتا ہُوں

وہ سَیرِ صبح کے عالم میں ہوتا ہے تو مَیں اُس سے
گھڑی بھر کے لیے خواب جوانی مانگ لیتا ہُوں

جہاں رُکنے لگے میرے دلِ بیمار کی دھڑکن
مَیں اُن قدموں سے تھوڑی سی روانی مانگ لیتا ہُوں

مرا معیار میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
نئے لمحوں میں تصویریں پُرانی مانگ لیتا ہُوں

زیاں کاری ظفر بنیاد ہے میری تجارت کی
نمک ساری کے بدلے سرگرانی مانگ لیتا ہُوں

-☆-

درونِ خانہ کہ بیرونِ در ضرورت ہو
کُشیدہ دستِ طلب ہیں جدھر ضرورت ہو

چلو ، تُمھیں تو ضرورت نہ تھی محبت کی
ہمیں سے پُوچھتے ، شاید اِدھر ضرورت ہو

دِکھائی دیتے رہو ایک بار تو دن میں
اگرچہ تُم مری شام و سحر ضرورت ہو

چھپائے پھرتا ہُوں خُود کو تُمھاری خواہش پر
مَیں ہو بھی سکتا ہُوں ظاہر اگر ضرورت ہو

یہ دل کی غیر ضروری ضرورتیں ، یعنی
تُم آؤ بھی نہیں ، اور سربسر ضرورت ہو

ملے کہیں تو ظفر سے یہ پُوچھ لینا خُود
سوال کرتا نہیں ، کیا خبر ضرورت ہو

-☆-

کھڑکیاں کس طرح کی ہیں ، اور ، دَر کیسا ہے وہ
سوچتا ہوں ، جس میں وہ رہتا ہے ، گھر کیسا ہے وہ

کیسی وہ آب و ہوا ہے جس میں وہ لیتا ہے سانس
آتا جاتا ہے وہ جس پر رہگزر کیسا ہے وہ

کون سی رنگت کے ہیں اُس کے زمین و آسماں
چھاؤں ہے جس کی یہاں تک بھی ، شجر کیسا ہے وہ

اِک نظر میں ہی نظر آ جائے گا وہ سربسر
پھر بھی اُس کو دیکھنا ، بارِ دگر کیسا ہے وہ

مَیں تو اُس کے ایک اِک لمحے کا رکھتا ہوں شمار
اور ، میرے حالِ دل سے بے خبر کیسا ہے وہ

اُس کا ہونا ہی بہت ہے ، وہ کہیں ہے تو سہی
کیا سروکار اِس سے ہے مجھ کو ، ظفر ، کیسا ہے وہ

-☆-

کب وہ ظاہر ہوگا اور حیران کر دے گا مجھے
جتنی بھی مشکل میں ہوں ، آسان کر دے گا مجھے

رُو برو کر کے کبھی اپنے مہکتے ، سرخ ہونٹ
ایک دو پل کے لیے گلدان کر دے گا مجھے

رُوح پھونکے گا محبت کی مرے پیکر میں وہ
پھر وہ اپنے سامنے بے جان کر دے گا مجھے

خواہشوں کا خوں بہائے گا سرِ بازارِ شوق
اور ، مکمل بے سر و سامان کر دے گا مجھے

منہدم کر دے گا آ کر ساری تعمیراتِ دل
دیکھتے ہی دیکھتے ویران کر دے گا مجھے

ایک ناموجودگی رہ جائے گی چاروں طرف
رفتہ رفتہ اس قدر سنسان کر دے گا مجھے

یا تو مجھ سے وہ چھڑا دے گا غزل گوئی ، ظفر
یا کسی دن صاحبِ دیوان کر دے گا مجھے

-☆-

بہت کچھ ہو تو سکتا ہے، مگر، کچھ بھی نہیں ہو گا
مجھے معلوم ہے اُس پر اثر کچھ بھی نہیں ہو گا

مسافت میں کسی لاحاصلی کا رنگ ہے شامل
کہ یوں لگتا ہے، انجامِ سفر کچھ بھی نہیں ہو گا

رُتوں پر جیسے چھا جائے گا اُس کے ہجر کا موسم
شجر ہوں گے، مگر، اب کے ثمر کچھ بھی نہیں ہو گا

کشاکش دل کے اندر ہے کہیں، اور، جس قدر بھی ہے
یہیں رہ جائے گی، بیرونِ در کچھ بھی نہیں ہو گا

ہٹاتا کیوں نہیں چہرے سے یہ اسرار کی چادر
بتاتا کیوں نہیں مجھ کو اگر کچھ بھی نہیں ہو گا

مَیں دیکھوں گا اُسے، اور، دیکھتا رہ جاؤں گا یکسر
نظر ہو گی نہ اندازِ نظر، کچھ بھی نہیں ہو گا

وہ آنکھوں کا اندھیرا ہو کہ ہونٹوں کا اُجالا ہو
مجھے اندازۂ شام و سحر کچھ بھی نہیں ہو گا

محبت، اور، محبت کرنے والے کم نہیں، لیکن
اُدھر ہی جائے گا یہ دل جدھر کچھ بھی نہیں ہو گا

ظفر، کرنا پڑے گا اُس کو پہلی بار ہی قائل
نہ ہو پایا تو پھر بارِ دگر کچھ بھی نہیں ہو گا

☆

سرِ شاخسار گلاب ہے کہ سراب ہے
مرے سامنے یہ کتاب ہے کہ سراب ہے

کوئی پیاس ہے مری خواہشوں میں رُکی ہوئی
کہیں دُور چشمۂ آب ہے کہ سراب ہے

یہ طلسمِ خوابِ وصال ہے کہ ہے واہمہ
یہ لہو میں زورِ شباب ہے کہ سراب ہے

وہی ناشناس ہوں اُس کے نیم سخن کا مَیں
کہ سوال ہے کہ جواب ہے کہ سراب ہے

کسی لب پہ حرفِ حجاب ہے کہ فسوں کوئی
کسی رُخ پہ نازِ نقاب ہے کہ سراب ہے

تری اُنگلیوں کا شمار ہے مرے رُوبرُو
کہ یہ حُسن ہے کہ حساب ہے کہ سراب ہے

مجھے کیا خبر کہ یہ اتنے دُور کی دوستی
کوئی رنجِ خانہ خراب ہے کہ سراب ہے

وہی تشنگی کا خُمار ہے مرے چارسُو
ترے وسط میں مرا خواب ہے کہ سراب ہے

وہ ہمارا نقشِ نیاز تھا کہ نہیں، ظفر
یہ کسی کا عکسِ عتاب ہے کہ سراب ہے

☆

رفتہ رفتہ اس دل سے جو محبت ماند پڑی
یُوں محسوس ہُوا ہر ایک ضرورت ماند پڑی

دھاروں دھار برسنے والا بادل خشک ہُوا
خوابوں خواب چمکنے والی صُورت ماند پڑی

آہستہ آہستہ سارے منظر دُھول ہُوئے
آنکھوں میں اِک نوتعمیر عمارت ماند پڑی

پہلے تو اُتری اُس نغمہ نواز آواز کی آب
پھر اُس شوخ کے تازہ خط کی عبارت ماند پڑی

رات میں دن سا کر دیتا تھا یاد کا روشن لمس
پھر وہ موسم بدلا ، اور ، وہ مُہلت ماند پڑی

تنگ پڑے جب آخر اپنے جوشِ جنوں سے ہم
جنگل سے واپس گھر آئے ، وحشت ماند پڑی

شکر کرو ، اِن آنکھوں کا وہ خوف تمام ہُوا
اور ، ظفر ، اِس خالی دل کی دہشت ماند پڑی

☆

حُسن کے انکار سے بھی کُچھ تو پردہ رہ گیا
مَیں بھی کافی مُطمئن ہوں ، وہ بھی اچھا رہ گیا

دل میں اُس کے موم بتی سی جلائی بھی ، مگر
روشنی کے باوُجود اتنا اندھیرا رہ گیا

کیا کیا جائے کہ سمجھوتا بھی تھا اُس کے ساتھ
اُس کا خط واپس کیا اُس کو ، لفافہ رہ گیا

خوب صُورت ہے تو اُتنا ہی کمینہ بھی ہے وہ
ایک بھی دل نے نہ مانی ، مَیں تو کہتا رہ گیا

دیکھنے آتا بھی ہے چھوڑے ہُوئے اِس شہر کو
یعنی اُس کے بعد کیا اُجڑا ہے ، کِتنا رہ گیا

موڑ کر دریا کو دُشمن لے گئے اپنی طرف
اور ، اِدھر رُوئے زمیں پر داغِ دریا رہ گیا

اور گھر دیکھو کوئی ، اُس کے تو چہرے پر ، ظفر
رنگِ دل باقی نہیں اب ، رنگِ دُنیا رہ گیا

☆

مجرمِ دل کی سزا نہیں دیتا
کیوں کوئی فیصلہ نہیں دیتا

خوابِ حسرت ہُوں، دیکھتا نہیں وہ
خاکِ دل ہُوں، اُڑا نہیں دیتا

اِس قدر احتیاط ہے اُس میں
ڈھونڈتا ہے، صدا نہیں دیتا

میری رکھتا ہے سب خبر، لیکن
خود کہاں ہے، پتا نہیں دیتا

دیکھنا اب تو صرف یہ ہے کہ دل
اُسے کب تک بھلا نہیں دیتا

جا کے اُس کو بتا وکیل، ظفرؔ
جو کوئی مشورہ نہیں دیتا

-☆-

بے وفائی کر کے نکلوں یا وفا کر جاؤں گا
شہر کو ہر ذائقے سے آشنا کر جاؤں گا

تُو بھی ڈھونڈے گا مُجھے شوقِ سزا میں ایک دن
مَیں بھی کوئی خوب صُورت سی خطا کر جاؤں گا

مُجھ سے اِجتنائی بھی مت کر میری مرضی کے خلاف
ورنہ مَیں بھی ہاتھ کوئی دُوسرا کر جاؤں گا

مُجھ میں ہیں گہری اُداسی کے جراثیم اِس قدر
مَیں تُجھے بھی اِس مرض میں مُبتلا کر جاؤں گا

شور ہے اِس گھر کے آنگن میں ظفرؔ کُچھ روز اور
گنبدِ دل کو کسی دن بے صدا کر جاؤں گا

-☆-

فکر کر تعمیرِ دل کی ، وہ یہیں آ جائے گا
بن گیا جس دن مکاں ، خود ہی مکیں آ جائے گا

خود بھی وہ چالاک ہے ، لیکن اگر ہمت کرو
پہلا پہلا جھوٹ ہے ، اُس کو یقیں آ جائے گا

کون سا ہم روز روز اُس کو بُلاتے ہیں یہاں
بے مُروّت ہے ، مگر ، اِتنا نہیں ، آ جائے گا

ہم سے مِل لینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ اب
ہر کوئی اُس کو بُلا لے ، ہر کہیں آ جائے گا

زخمِ دل تو سات پردوں میں چھپا ہوگا کہیں
اور ، سب کے سامنے داغِ جبیں آ جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اِس لشکر کشی سے حُسن کا
کُچھ علاقہ اور بھی زیرِ نگیں آ جائے گا

اب تو جیسے خود بھی آنا چاہتا ہے وہ ، ظفر
گھر ، گلی ، ہوٹل جہاں چاہو وہیں آ جائے گا

☆

مُسافرت کو بہانہ اگر بنا لیتا
وہ میری آنکھوں میں اِک رہگزر بنا لیتا

گُناہ گار جو ہوتی مری نظر اِک بار
وہیں مَیں شاخِ تماشا پہ گھر بنا لیتا

لیے تو چلتے وہ دیوارِ سنگ تک مُجھ کو
مَیں چُومتا اُسے اور اُس میں دَر بنا لیتا

غرض کُچھ اور نہ تھی دل کے اِس گھروندے سے
وہ توڑ دیتا ، مَیں بارِ دِگر بنا لیتا

تلاشِ یار میں پھرنا ہی تھا مری قسمت
تو پھر مَیں اپنا ٹھکانا کِدھر بنا لیتا

کبھی وہ مُہرِ خموشی کو توڑتا بھی ، ظفر
وہ جھوٹ بولتا ، اور ، مَیں خبر بنا لیتا

☆

خوش ہے وہ دے کے ہمیں خواب سہانے خالی
پاس آتا نہیں، کرتا ہے بہانے خالی

بیٹھتا وہ بھی نہیں ایک جگہ پر جم کر
اور، جانے لگے اپنے بھی نشانے خالی

جائیں گے ہم وہاں صرف اُس کی زیارت کرنے
آئے گا وہ یہاں قصّے ہی سُنانے خالی

دل کے ہمسائے میں نکلو تو نظر آئیں گے
گھر کئی اور بھی تاریک، پُرانے، خالی

کام کچھ کیجیے، بیکار محبت ہی سہی
بیٹھ رہنے سے تو ہو جائیں خزانے خالی

شامِ شنوائی ترستی ہے دریچے سے الگ
جامِ رُسوائی لرزتا ہے سرہانے خالی

بجھ گئیں خواب تمنا سے چھلکتی آنکھیں
شہر برباد ہُوا، اور، ٹھکانے خالی

دل سے غائب ہُوا اُس شکلِ خوش آغاز کا ورد
رہ گئے ہاتھ میں تسبیح کے دانے خالی

کیا کریں، عمر ہی اتنی تھی محبت کی، ظفر
گزرے اُس میں بھی کئی ایک زمانے خالی

☆

قیام ہے ابھی، سُوئے سفر بھی آتا ہُوں
مَیں اس طرف سے تو ہو لوں، اُدھر بھی آتا ہُوں

کوئی مجھے بھی وہاں اپنے ساتھ لے جائے
مَیں راستے پہ اس اُمّید پر بھی آتا ہُوں

تمھاری بزم میں ہونا ہے جو سلوک، اُس کی
مجھے خبر بھی ہے، اور، بے خبر بھی آتا ہُوں

کیا تو ہے مجھے گُمراہ بھی محبت نے
مَیں گھوم پھر کے، مگر، اپنے گھر بھی آتا ہُوں

کچھ اپنے ظاہر و باطن کو آپ بھی دیکھیں
کہ مَیں تو جیسا ہُوں ویسا نظر بھی آتا ہُوں

جہاں جہاں مرے عیبوں کی آندھیاں ہیں ظفر
وہیں مَیں لے کے چراغِ ہُنر بھی آتا ہُوں

☆

میں چلتے چلتے اپنے گھر کا رستا بھول جاتا ہوں
جب اُس کو یاد کرتا ہوں تو کتنا بھول جاتا ہوں

ضروری ضابطے، فوری فرائض، قیمتی قدریں
میں اُس کو دیکھ کر سارا تماشا بھول جاتا ہوں

کہاں تک جائیں گے دونوں، کہاں سے واپسی ہو گی
وہ کیا کچھ یاد رکھتا ہے، میں کیا کیا بھول جاتا ہوں

بھلا دیتا ہوں گر وہ روکتا ہے پاس آنے سے
دوبارہ روکتا ہے، میں دوبارہ بھول جاتا ہوں

مقرر کر بھی دوں، کوئی جو مجھ کو یاد دلوائے
تو میں اُس آدمی کو ساتھ رکھنا بھول جاتا ہوں

نصیحت دلنشیں رکھتا ہوں اُن خاموش آنکھوں کی
مگر، بندہ بشر ہوں، رفتہ رفتہ بھول جاتا ہوں

اگر کچھ یاد رہتا ہے مجھے، تو بھول جانا ہی
میں کیسا یاد رکھتا ہوں، میں کیسا بھول جاتا ہوں

ذرا سی بات پر بے حال ہو جاتا وہ ہنس کر
جو زخم اُس نے لگا رکھے ہیں گویا بھول جاتا ہوں

ظفر، ضعفِ دماغ اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا
کہ جاتا ہوں وہاں اور واپس آنا بھول جاتا ہوں

☆

نشیب راہ میں ہے یا فرازِ بام پہ ہے
نگاہِ گم شدہ کس خواب کے خرام پہ ہے

تغافل اور توجہ کے ذائقے ہیں عجب
ابھی پتا نہیں چلتا وہ کس مقام پہ ہے

کشش ہزار کرے آب و تابِ دانۂ دل
وہ راہ کار ہے، اُس کی نظر بھی دام پہ ہے

لہو میں پیاس کی پرواز ہے وہی پیہم
کہ انحصار اُسی تیغِ بے نیام پہ ہے

وہ رنگ ابھی مری دیوارِ جاں تک آیا نہیں
جو تہ بہ تہ ترے ہونٹوں کے خشک جام پہ ہے

بس ایک بوند ملاقات کی ہمارے لیے
کہ یہ مسافرِ دل مختصر قیام پہ ہے

یقینِ پختہ کی دیوار توڑ دی ہے، ظفر
ہمارا دار و مدار اب خیالِ خام پہ ہے

☆

ہمارے نقشِ طلب کا نشاں بھی خالی ہے
زمیں تو تھی ہی ، یہاں آسماں بھی خالی ہے

جو ہے تو صرف زبانی ہے جمع و خرچ اُس کا
ہمارے حق میں تو وہ مہرباں بھی خالی ہے

مچی رہی یہاں لفظوں کی لوٹ مار ، مگر
ہماری طرح کفِ دیگراں بھی خالی ہے

فریبِ گرمیِ بازارِ حرف تو دیکھو
کہ بھیڑ بھی ہے وہی ، اور دکاں بھی خالی ہے

یہ ہیں خلا مرے اندر کہ خود خلاؤں میں ہوں
یقیں تو خیر یقیں تھا ، گماں بھی خالی ہے

رہے تو جانے کہاں تک رہے یہ صورتِ حال
کہ پیاس بھی نہیں لگتی ، کنواں بھی خالی ہے

ہماری اپنی شرائط ہی سخت ہیں ، ورنہ
کرایہ دار بھی حاضر ، مکاں بھی خالی ہے

لگی ہو جیسے کوئی بددعا کسی کی ، ظفرؔ
کہ جسم بھی ہے تہی خواب ، جاں بھی خالی ہے

-☆-

ہمیں شکایتِ مبہم سے اجتناب تو ہے
کچھ اعتراض ، اگر سن سکیں جناب ، تو ہے

کیا ہے نرم دلِ سنگ کو اُس کے
کسی قدر ہمیں دعوائے انقلاب تو ہے

روا نہیں تھا اُسے لاجواب کر دینا
وگرنہ اُس کے سوالات کا جواب تو ہے

نہیں ہمارے لیے اُس کی روشنی ، نہ سہی
کہ اِس فضا میں کہیں کوئی آفتاب تو ہے

پڑے گا کون بہار و خزاں کے چکر میں
کہ خونِ ناب تو ہے ، رنگ پر گلاب تو ہے

نئی عمارت اِسی خاک و خوں سے اُٹھے گی
قرارِ جاں ابھی تصویرِ انقلاب تو ہے

ظفرؔ ، گلا ہے وہ گردانتے نہیں دل کو
حریمِ خاص میں کچھ دن سے باریاب تو ہے

-☆-

یُوں بھی نہیں کہ دل میں کوئی غم نہیں رہا
یہ سِلسلہ کُچھ اِتنا مُنظّم نہیں رہا

ویسا ہے آج بھی یہ ترا حُسنِ بے اماں
ورنہ کہیں بھی ایک سا موسم نہیں رہا

دل سے تو خیر دھو گئی بارش تمام نقش
دیوار شہر کا بھی وہ عالم نہیں رہا

ضد پر وہ اپنی آج بھی قائم تو ہے، مگر
اگلا سا وہ بیان میں دم خم نہیں رہا

چھوڑی ہے جب سے ہم نے ظفرؔ عاجزی کی خُو
اِتنا مزاج اُس کا بھی درہم نہیں رہا

-☆-

نظر جھکائے اِدھر سے اُدھر گزرتا ہے
ٹھہرنا چاہتا بھی ہے، مگر، گزرتا ہے

یہ کیا طلسم ہے آخر کہ آہ کا اُس پر
اثر نہیں ہے، گمانِ اثر گزرتا ہے

ابھی نہیں کوئی دھڑکا زیانِ زر کا اُسے
وہ دشتِ دل سے ابھی بے خطر گزرتا ہے

شکستِ خواب ہے زنجیرِ خواب کے پیچھے
سفر کے بعد غُبارِ سفر گزرتا ہے

مَیں چُوم لیتا ہُوں اُس راستے کی خاک، ظفرؔ
جہاں سے کوئی بہَت بے خبر گزرتا ہے

-☆-

آنکھ میں شوخی نہیں چھلکے گی ، آنسو آئے گا
پہلے مَیں آیا تھا تیری سمت ، اب تُو آئے گا

مَیں بھی کوشش تو کروں گا بچ نکلنے کی بہت
تُو بھی سارا لے کے اپنے ساتھ جادُو آئے گا

دل خریداری کو خالی جیب نکلے گا یہاں
جب بڑھا لیں گے دُکانیں ، یہ نکھٹو آئے گا

زندگی ، لِکھ لیجیے ، جتنی بھی ہے بے آب و رنگ
اس میں بھی اک لمحہ رُخسار و گیسُو آئے گا

کاروبارِ شوق جب تک گرم ہے زیرِ فلک
باغ میں پریاں ، ظفرؔ ، جنگل میں آہُو آئے گا

-☆-

گلشنِ خواب ہُوں ، تاراج حقیقت کر دے
اتنے احسان کیے ، یہ بھی مُروّت کر دے

یُوں محبت سے نہ دے میری محبت کا جواب
یہ سزا سخت ہے ، تھوڑی سی رعایت کر دے

اہلِ بازار میں ہوتا نہ پھِروں خوار و زبُوں
ایک ہی بار اگر طے مِری قیمت کر دے

اس نے کیا سوچ کے مُجھ کو بھی کِیا ساتھ خراب
اتنا دم خم جو نہیں تھا کہ بغاوت کر دے

خُوگرِ ظلم تھا مَیں آپ ہی ، لیکن مَیں نے
کب کہا تھا کہ وہ ایسی بری حالت کر دے

-☆-

اور اب سلسلۂ ناز نہیں رکھ سکتا
مجھے سچ کہنے سے وہ باز نہیں رکھ سکتا

میرے حالات کو ناساز تو کر سکتا ہے
میرے حالات کو ناساز نہیں رکھ سکتا

پھر صدا دے کے چلا آئے گا خود ساتھ، کہ وہ
اپنا پیکر پسِ آواز نہیں رکھ سکتا

اُس کو ناراض تو کر لیتا ہوں اکثر، لیکن
دیر تک مَیں اُسے ناراض نہیں رکھ سکتا

غیر کو تحفۂ رُسوائی نہ دینا ہرگز
کوئی کم ظرف یہ اعزاز نہیں رکھ سکتا

مَیں اشاروں میں ترا بوجھ بتاؤں گا کبھی
مَیں تری پُشت پہ الفاظ نہیں رکھ سکتا

خود پریشان ہُوا چاہتی ہے یہ خوش بُو
مَیں ترے راز کو اب راز نہیں رکھ سکتا

اپنے انجام کو پہنچوں گا بہت جلد، اگر
شرمِ پابندیِ آغاز نہیں رکھ سکتا

پَر پرواز ہی اِک ایسی مصیبت ہے، ظفرؔ
جس کو مَیں شاملِ پرواز نہیں رکھ سکتا

☆

کچھ احتیاط بھی اِس میں بہت ضروری تھی
ہماری اُس کی مُلاقات بس ادھوری تھی

جو ہونے والا تھا، اور، ہو نہیں سکا، اُس کا
اُسے بھی ڈر تھا، مجھے بھی اُمید پُوری تھی

بہت زیادہ نہ تھے فاصلے حمنا کے
نہ اپنی راہ میں حائل دلوں کی دُوری تھی

ہمارا مقصدِ آخر جُدائی تھا اُس سے
کہ اُس سے ملنے کی خواہش فقط عبُوری تھی

ہم اُس کے ہاں صفِ اوّل میں بیٹھتے کیوں کر
کہ اپنے پاس خوشامد نہ جی حضُوری تھی

مَیں خوابِ سبز تھا دونوں کے درمیاں میں، ظفرؔ
کہ آسماں تھا سُنہرا، زمین بھُوری تھی

☆

انکار کی حدوں سے گزرتے کچھ اور ہیں
ڈرتے کچھ اور لوگ ہیں ، مرتے کچھ اور ہیں

کھوئے ہُوؤں کا لوگ لگاتے تو ہیں سُراغ
لیکن لہو میں اپنے اُترتے کچھ اور ہیں

اُن کو سنبھالنا ہے قیامت ، کہ صُبحِ وصل
چُنتا سمیٹتا ہُوں ، بکھرتے کچھ اور ہیں

ہر روز اُن کو ہاتھ دکھاتا ہُوں مَیں کچھ اور
الزام روز مجھ پہ وہ دھرتے کچھ اور ہیں

اب تو جہاں بھی اُس کی دلاتا ہے کوئی یاد
نقش اُس کو بھولنے کے بکھرتے کچھ اور ہیں

پڑتا ہے جب سے راہ میں اپنی کسی کا گھر
رُکنے لگے ہیں اور ، ٹھہرتے کچھ اور ہیں

مَیں نے ، کہ ہے یہ عیبِ سخن ہی بڑا ہُنر
الفاظ رائج اور تھے ، برتے کچھ اور ہیں

-☆-

رُکو اگر تو روانی بحال کر لینا
مثالِ سبزہ ہمیں پائمال کر لینا

مُطالبات ہمارے بہت زیادہ نہیں
بوقت فیصلہ اِتنا خیال کر لینا

جو دُور دُور ہی رہنا کوئی بڑی شے ہے
تو باکمال ہو ، یہ بھی کمال کر لینا

مَیں اپنے خواب یہاں چھوڑ جاؤں گا اِک دن
جو کر سکو تو ذرا دیکھ بھال کر لینا

مٹے گی روز کی اُلجھن تو ایک بار ، ظفرؔ
جواب کچھ تو ملے گا ، سوال کر لینا

-☆-

لڑتے ہیں ، مگر ، معرکہ جاری نہیں رکھتے
یہ کیسی محبت ہے کہ طاری نہیں رکھتے

پہچان ہمیں خود ہی نہیں ہے اگر اپنی
پھر کیا ہے جو پروا وہ ہماری نہیں رکھتے

شرمندہ ہیں اپنے سے بھی اور اُس سے بھی نادم
ہم زخم بھی رکھتے ہیں تو کاری نہیں رکھتے

ہم کو ہی ضرورت ہے زیادہ ، اُسے کہنا
ہم ہی کوئی تصویر تمھاری نہیں رکھتے

جھگڑا ہے تو کس بات پہ ، جیسے ہیں ظفرآپ
بس ٹھیک ہے ، ایسوں سے وہ یاری نہیں رکھتے

-☆-

محبت کا تماشا وصل کی تاثیر جیسا ہے
کہ بل بیٹھے نہیں اور ذائقہ انجیر جیسا ہے

مکمل خامشی ہے یا غبار آلود حیرانی
ہمارے درمیاں جھگڑا کوئی تصویر جیسا ہے

میں روزانہ ہی اُس کے دل میں اپنا گھر بناتا ہوں
مگر ، یہ مسئلہ کچھ حسرتِ تعمیر جیسا ہے

ترا خط پڑھ کے جیسے تیری صورت دیکھ لیتا ہوں
سمجھتا ہوں ترا چہرہ تری تحریر جیسا ہے

ذرا سی مہربانی اور بوجھل کر گئی دل کو
اُسے کہنا کہ یہ انعام تو تعزیر جیسا ہے

ظفر ، بیمارِ اُلفت ہو تو دل سے دُور مت رہنا
قسم لے لو ، اثر اِس خاک میں اکسیر جیسا ہے

-☆-

جس نے نفرت ہی مجھے دی نہ ظفر پیار دیا
مَیں نے سب کچھ اُسے کیوں ہار دیا، وار دیا

اک نظر، نصف نظر شوخ نے ڈالی دل پر
اور، اس دشت کو پیرایۂ گلزار دیا

وقت ضائع نہ کرو، ہم نہیں ایسے ویسے
یہ اشارہ تو مجھے اُس نے کئی بار دیا

زندہ رکھتا تھا مجھے شکل دکھا کر اپنی
کہیں روپوش ہُوا اور مجھے مار دیا

کوئی اس بات کو تسلیم کرے یا نہ کرے
صبح کی سیر نے مجھ کو دلِ بیمار دیا

زردیاں ہیں مرے چہرے پہ ظفر اُس گھر کی
اُس نے آخر مجھے رنگِ در و دیوار دیا

☆

وہ دن بھر کچھ نہیں کرتے ہیں، مَیں آرام کرتا ہُوں
وہ اپنا کام کرتے ہیں، مَیں اپنا کام کرتا ہُوں

بجا ہے، آپ نے تو میٹھی نظروں سے نہیں دیکھا
مجھی کو وہم ہے، مَیں ہی خیالِ خام کرتا ہُوں

یہی مَیں ہوں تو پکڑا جاؤں گا اس جرم میں اک دن
کہ جتنی خاص باتیں ہیں مَیں اُن کو عام کرتا ہُوں

بری کوتاہیاں مجھ کو ہمیشہ بھول جاتی ہیں
اسی خاطر مَیں اکثر شکوۂ ایام کرتا ہُوں

لگاتا پھر رہا ہُوں عاشقوں پر کفر کے فتوے
ظفر، واعظ ہُوں مَیں اور خدمتِ اسلام کرتا ہُوں

☆

پہلے تکرار کروں گا ہوسِ یار کے ساتھ
لگ کے سو جاؤں گا پھر ہجر کی دیوار کے ساتھ

بات جب کچھ بھی نہیں ہے تو مجھے دیکھ کے کیوں
اس کی رنگت بھی بدل جاتی ہے رفتار کے ساتھ

عشق بے دل نہ ہوا حسن سے محرومی پر
لوگ رخصت نہ ہوئے گرمیِ بازار کے ساتھ

شہر تھا شہر فقط اس کے یہاں ہونے سے
کیسے گزرے گی اس اجڑے ہوئے آثار کے ساتھ

ابھی قیمت بھی لگائی نہ تھی اس نے اپنی
اور، ہم چل بھی دیے اٹھ کے خریدار کے ساتھ

سفرِ تازہ کی بنیاد رکھی ہے جس پر
اس بیاباں کی حدیں ملتی ہیں گلزار کے ساتھ

اس کی دیوار پہ لکھ آئیں غزل جا کے، ظفر
آج کل کچھ اسے رغبت نہیں اخبار کے ساتھ

-☆-

وہ بے بسی ہے کہ دل کو یقیں نہیں آتا
مکاں پکار رہا ہے، مکیں نہیں آتا

خرامِ کوچہ و بازار ہے نہ سیرِ چمن
وہ شوخ اب کئی دن سے کہیں نہیں آتا

خیال اس کا بہت خوش ہے وسعتِ دل میں
ہمارے پاس یہ صحرا نشیں نہیں آتا

ہماری ساری فتوحات کے برابر ہے
وہ ایک شہر کہ زیرِ نگیں نہیں آتا

کچھ اس زمیں پہ اندھیرے ہیں آرزو کے، ظفر
کچھ آسماں پہ وہ ماہِ مبیں نہیں آتا

-☆-

دیکھنا بارِ دگر دیکھنا ہے
کیا کوئی ایک نظر دیکھنا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ دیکھے وہ بھی
ورنہ کیا اور کِدھر دیکھنا ہے

دیکھنا اور طرف ہے ، یعنی
اُس کے برعکس ، جدھر دیکھنا ہے

کھولنا ہے ابھی سامانِ سفر
اور ، امکانِ سفر دیکھنا ہے

تُجھے دیکھا ہے بہت دن ہم نے
اے بُرے! اب ترا گھر دیکھنا ہے

اہتمام اِتنا ہے اور ، اُس بُت کو
اِک سرِ راہگزر دیکھنا ہے

توڑ لینا ہے تعلّق اُس سے
چند روز اور ، مگر ، دیکھنا ہے

بُجھتی جاتی ہیں یہ آنکھیں ہر دم
اور ، ابھی خواب ہُنر دیکھنا ہے

سُو بہ سُو سایۂ شُہرت ہے ، ظفر
کاٹ کر یہ بھی شجر دیکھنا ہے

☆

نہیں کہ ملنے مِلانے کا سلسلہ رکھنا
کِسی بھی سطح پہ کوئی تو رابطہ رکھنا

مَریں گے لوگ ہمارے سوا بھی تُم پہ بہت
یہ جُرم ہے تو پھر اس جُرم کی سزا رکھنا

مدد کی تُم سے توقّع تو خیر کیا ہو گی
غریبِ شہرِ ستم ہوں ، مرا پتا رکھنا

بس ایک شام ہمیں چاہیے ، نہ پُوچھنا کیوں
یہ بات اور کِسی شام پر اُٹھا رکھنا

نئے سفر پہ روانہ ہُوا ہُوں از سرِ نو
جب آؤں گا تو مرا نام بھی نیا رکھنا

فصیلِ شوق اُٹھانا ، ظفر ، ضرور ، مگر
کِسی طرف سے نکلنے کا راستا رکھنا

☆

لگا ہُوں جب شام کے کِنارے
چمک اُٹھے بام کے کِنارے

قدیم ہونٹوں پہ کانپتے ہیں
کِسی نئے نام کے کِنارے

مرے کِناروں سے جل چکے ہیں
اِک اور کُہرام کے کِنارے

الگ الگ آرزو کی لہریں
جُدا جُدا کام کے کِنارے

ابھی تو پایاب ہے محبت
چلے چلو تھام کے کِنارے

کہیں پہ آغاز کا بھنور ہے
نہ کوئی انجام کے کِنارے

اب اور کب تک پڑا رہُوں گا
مَیں خواہشِ خام کے کِنارے

☆

خامشی اچھی نہیں ، اِنکار ہونا چاہیے
یہ تماشا اب سرِبازار ہونا چاہیے

خواب کی تعبیر پر اِصرار ہے جن کو ابھی
پہلے اُن کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

ڈوب کر مرنا بھی اُسلوبِ محبت ہو تو ہو
وہ جو دریا ہے تو اُس کو پار ہونا چاہیے

اب وہی کرنے لگے دیدار سے آگے کی بات
جو کبھی کہتے تھے بس دیدار ہونا چاہیے

بات پُوری ہے ، ادھوری چاہیے ، اے جانِ جاں
کام آساں ہے ، اِسے دُشوار ہونا چاہیے

دوستی کے نام پر کیجے نہ کیوں کر دُشمنی
کُچھ نہ کُچھ آخر طریقِ کار ہونا چاہیے

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اُس پر ، ظفرؔ
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

☆

درکار ہے مجھے تو دوائی کے طور پر
رکھتے ہیں ایک شے جو مٹھائی کے طور پر

آیا بھی ہے اگر کبھی آنکھوں میں خوابِ وصل
آیا ہے ایک خواب جدائی کے طور پر

جیسے بھی ہو، اُٹھا تو دیا بزم سے مجھے
نفرت کی وجہ سے کہ صفائی کے طور پر

اچھائی مجھ میں ہے بھی کوئی تو بہ ستم ظریف
کرتا ہے اُس کو پیش بُرائی کے طور پر

سردی میں گرم رکھتی ہے کیا آتشِ حسد
لیتا ہوں اس سے کام رضائی کے طور پر

محرومیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم
حق اپنا مانگتے ہیں گدائی کے طور پر

وہ وقت ہے کہ عرضِ تمنا بھی اہلِ شوق
کرتے ہیں بس لگائی بُجھائی کے طور پر

وجدان ایک سیلِ فلک سیر تھا جسے
ہم نے بچھا رکھا ہے چٹائی کے طور پر

سُنتے ہیں اور لُطف اُٹھاتے ہیں سب ظفر
میرا کلام ہرزہ سرائی کے طور پر

-☆-

جہاں میرے نہ ہونے کا نشاں پھیلا ہوا ہے
سمجھتا ہوں غُبارِ آسماں پھیلا ہوا ہے

مَیں اس کو دیکھنے اور بھول جانے میں مگن ہوں
مرے آگے جو یہ خوابِ رواں پھیلا ہوا ہے

ابھی دو حیرتوں کے درمیاں موجود ہوں میں
سرِ آبِ یقیں عکسِ گماں پھیلا ہوا ہے

رہائی کی کوئی صورت نکلنی چاہیے اب
زمیں سہمی ہوئی ہے اور دھواں پھیلا ہوا ہے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا اس کا کہ آخر
کہاں تک سایۂ عہدِ زیاں پھیلا ہوا ہے

کہاں ڈوبے، کدھر اُبھرے بدن کی ناؤ دیکھیں
کہ اتنی دُور تک دریائے جاں پھیلا ہوا ہے

مَیں دل سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں آخر
مرے ہر سُو یہ دشتِ بے اماں پھیلا ہوا ہے

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، اور، اندر ہی اندر
لہو میں ایک دستِ رائگاں پھیلا ہوا ہے

ظفر، اب کے سخن کی سرزمیں پر ہے یہ موسم
بیاں غائب ہے، اور رنگِ بیاں پھیلا ہوا ہے

-☆-

یہ مت سمجھو کنارہ کرنے والا ہُوں
ابھی تو صرف اشارہ کرنے والا ہُوں

جسے کر کے بہُت نادم ہُوا تھا مَیں
وہی حرکت دوبارہ کرنے والا ہُوں

جسے کرتا رہا ہُوں مَیں پسند اِتنا
اُسی کو اب گوارا کرنے والا ہُوں

کِسی کی پردہ داری کے وسیلے سے
مَیں خُود کو آشکارا کرنے والا ہُوں

مری آنکھیں کِسی دریا میں پھینک آؤ
کہ مَیں اپنا نظارا کرنے والا ہُوں

یہ دل مسجد تو بن پایا نہیں مجھ سے
اِسے اب گوردوارہ کرنے والا ہُوں

مَیں خُود کو پُرزہ پُرزہ جوڑنے کے بعد
دوبارہ پارہ پارہ کرنے والا ہُوں

بہُت قطروں کو دریا کر چُکا ، اور اب
مَیں سُورج کو ستارہ کرنے والا ہُوں

ظفرؔ ، شاعر تو مَیں اچھا نہیں اِتنا
بہ ہر صُورت ، گزارہ کرنے والا ہُوں

-☆-

شبِ اُمید بھی ہے ہجر کی اس شام کے بعد
اِک سفر اور ہے اِس وقفۂ آرام کے بعد

آنکھ رہ جائے گی اِک منظرِ بے شکل میں گُم
جی ٹھہر جائے گا اِک لرزشِ بے نام کے بعد

حسرتِ خوابِ فراغت ہے وہی آنکھوں میں
کام کُچھ اور بھی یاد آئے مُجھے کام کے بعد

منزلِ وصل سے آگے بھی گُزرنا ہے مُجھے
ایک آغاز ابھی اور ہے انجام کے بعد

سر میں اِک خواہشِ طفلانہ ہی کیا کم ہے ظفرؔ
اور کیا چاہتے ہو اِس ہوسِ خام کے بعد

-☆-

نہ کوئی بات ہی ہے نہ کوئی کام کرنا ہے
اور اُس کے بعد کافی دیر تک آرام کرنا ہے

اس آغازِ محبت ہی میں پُورے ہو گئے ہم تو
اسے اب اور کیا شرمندۂ انجام کرنا ہے

بہُت بے سُود ہے لیکن ابھی کُچھ اور دن مجُھ کو
سوادِ صبح میں رہ کر شمارِ شام کرنا ہے

نشاں دینا ہے مَیں نے کُچھ غُبار آلُود سمتوں کا
کوئی کافی پُرانا راز طشت از بام کرنا ہے

بدی کے طور پر کرنی ہے نیکی بھی محبت میں
کہ جو بھی کام کرنا ہے وہ بے ہنگام کرنا ہے

ابھی تو کارِ خیر اتنا پڑا ہے سامنے میرے
ابھی تو مَیں نے ہر خاص آدمی کو عام کرنا ہے

کوئی بدلہ چُکانا ہے وفا کے نام پر اُس سے
مسافت کے لیے اُٹھنا ہے اور بسرام کرنا ہے

کمائی عمر بھر کی ہے یہی اِک جائداد اپنی
سو یہ خوابِ تماشا اب کسی کے نام کرنا ہے

اِک آغازِ سفر ہے اے ظفرؔ یہ پختہ کاری بھی
ابھی تو مَیں نے اپنی پختگی کو خام کرنا ہے

☆

عطیہ، ناصر، بختاور، بلال اور نُور کے نام

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
(اقبال)

طبعِ رواں کو لوگوں کی اپنی راہوں پہ ڈال دیا
یوں تصویرِ سخن سے میں نے اپنا آپ نکال دیا

پانی سا بہتا پھرتا تھا میں پانی کے ساتھ، ظفر
کوئی بہت منہ زور لہر تھی جس نے مجھے اچھال دیا

☆

طبعِ رواں کو لوگوں کی اپنی راہوں پر ڈال دیا
یوں تصویرِ سخن سے میں نے اپنا آپ نکال دیا
پانی سا بہتا پھرتا تھا میں پانی کے ساتھ ، ظفر
کوئی بہت منہ زور لہر تھی جس نے مجھے اچھال دیا

-☆-

سفرِ تازہ کی بنیاد رکھی ہے جس پر
اس بیاباں کی حدیں ملتی ہیں گلزار کے ساتھ

-☆-

گرچہ کہتی تو نہیں خلقِ خدا سب اچھا
شور ہے پھر بھی ہر اک سمت بپا سب اچھا

نیتیں اپنی سبھی آئیں گی آگے اپنے
شامِ رُسوائی ہو یا صبحِ سزا، سب اچھا

ہُو کا عالم ہے سراسیمگیِ دل کی طرف
کہہ رہی ہے شبِ دہشت کی ہوا سب اچھا

لفظ کے پانو میں جُوتے ہیں معانی کے نئے
جو بھی لکھوائیں بھلا ہو کہ بُرا، سب اچھا

ناز و انداز میں کپڑے تو نکالے میں نے
آخر کار مجھے کہنا پڑا، سب اچھا

کچھ مجھے زہر بھی خالص نہ ملا تھا، اور کچھ
میرے مرنے میں نہ تھی اُس کی رضا، سب اچھا

مجھ سے چاہے گا وضاحت بھی کسی روز یہ دل
میں نے اس بار اُسے کہہ تو دیا، سب اچھا

مجھ سے بھی کس نے کہا تھا کہ اسی کو چاہوں
جو سلوک اُس نے مرے ساتھ کیا، سب اچھا

جو مرا حال تھا خود اُس پہ بھی ظاہر تھا، مگر
اُس نے پوچھا تو ظفرؔ میں نے کہا، سب اچھا

☆

حضرتِ دل تو اِس دفعہ صاف نکل نکل گئے
ہجر کی آگ میں، مگر، ہاتھ ہمارے جل گئے

سادہ دلوں کو روز و شب جن سے ڈرا رہے تھے آپ
کل کے جلُوس میں وُہی آپ کے ہم بغل گئے

کیوں نہ بساطِ وقت سے خوف زدہ ہوں جاں نثار
آپ کو ایک ہی تھی یاد، آپ وہ چال چل گئے

کس سے جواب مانگیے، کس کے حساب میں ہے وہ
سعی جو بے ثمر رہی، قول جو بے عمل گئے

دُور بہت نکل گئے جوشِ وفا میں راہرو
اب بھی سمجھ سکیں اگر، اب بھی اگر سنبھل گئے

اتنی ہمیں بھی تھی نہ کچھ برف پہ بھاگنے کی مشق
ہم بھی سبھی کے ساتھ تھے، ہم بھی کہیں پھسل گئے

جلسۂ ناز میں، ظفرؔ! کیسے اُکھڑ گئی ہوا
آپ ہی کچھ بتایئے، آپ تو سر کے بل گئے

☆

کچھ ہوئے باغی یہاں، کچھ لوگ بے دل ہو گئے
اور، کچھ شائستۂ معیارِ محفل ہو گئے

کچھ مدارج طے کیے اہلِ ہوس نے سعی سے
کچھ فوائد خودبخود بھی اُن کو حاصل ہو گئے

اک فریبِ تازہ تر تیار تھا اپنے لیے
اور، ہم سمجھا کیے وہ ہم سے غافل ہو گئے

جو اصولوں کو بدل لیتے ہیں کپڑوں کی طرح
آخر اُن کی طرفگی کے ہم بھی قائل ہو گئے

پیش کیا کرتے ہیں، دیکھیں، اب نیا دستورِ دل
اگلے وہ دعوے محبت کے تو باطل ہو گئے

ہم نے جدوجہد کرنا تھی، ظفر، جن کے خلاف
وہ بھی آ کر ہماری صف میں شامل ہو گئے

☆

آدابِ محبت جو نبھانے کے لیے تھے
ثابت ہُوا آخر کہ دکھانے کے لیے تھے

معیارِ متانت کے جو تھے اُس کی زباں پر
اُس کے لیے کب تھے، وہ زمانے کے لیے تھے

جو اپنے لیے تھے ثمراتِ شجرِ خواب
دراصل کہیں اور ہی جانے کے لیے تھے

تقسیمِ فرائض تھی کچھ اس طرح کی اُن میں
یا چور تھے، یا شور مچانے کے لیے تھے

وہ سازشِ رُسوائی ہو یا حُسنِ تلافی
حیلے وہ سبھی پیر جمانے کے لیے تھے

اظہار کے صد رنگ وسیلے سحر و شام
آواز کے آثار مٹانے کے لیے تھے

حق وہ ہے، ظفر، چھین لیا جائے جو بڑھ کر
یہ پھیلے ہُوئے ہاتھ اُٹھانے کے لیے تھے

☆

شور ہے زیرِ زمیں ، چشمہ اُبلتا کیوں نہیں
بول ، اے خاکِ وطن ! پانی نکلتا کیوں نہیں

کس نے پہنایا دلوں کو سرد لوہے کا لباس
خوں پگھلتا کیوں نہیں ، موسم بدلتا کیوں نہیں

اُن کا پانی بھی بھڑک اُٹھتا ہے ، یہ کیا بات ہے
اور ، اپنا تیل بھی ، اے دوست ، جلتا کیوں نہیں

ہم نے ساتھ اُس کا دیا تھا کیا اسی دن کے لیے؟
معدنِ خوابِ تمنا لعل اُگلتا کیوں نہیں

یہ شکایت ایک دن ہونا ہی تھی مجھ سے اُنھیں
ساتھ چلتا کیوں نہیں ، سانچے میں ڈھلتا کیوں نہیں

اپنے ہاتھوں اس قدر نقصان کر کے بھی ، ظفر
بے حسی کیسی ہے یہ ، تو ہاتھ ملتا کیوں نہیں

☆

نقشِ ہوس دلوں پہ مکرر بٹھا دیا
ہر دشمنِ وفا مرے سر پہ بٹھا دیا

کس کی مجال ہے کہ اُٹھے اُس کے سامنے
جو بیٹھتا نہیں تھا پکڑ کر بٹھا دیا

بیٹھا نہ میں تو موڑ کے رُخ سیلِ خوف کا
دو چار ہی دنوں میں مرا گھر بٹھا دیا

تاریخ لکھ رہے ہیں عروج و زوال کی
جس کو اُٹھا لیا اُسے اکثر بٹھا دیا

چھوٹے بڑے کا فرق اُٹھا اُس کے عہد میں
چوروں کو ڈاکوؤں کے برابر بٹھا دیا

نانِ جویں پہ نام ہمارا بھی تھا ، مگر
تقسیم کے لیے کوئی بندر بٹھا دیا

خالی فریب ہی دیے رکھتا ہمیں ، ظفر
اندر بُلا لیا کبھی باہر بٹھا دیا

☆

کیا پُوچھ رہے ہو نام اُس کا
بس دیکھتے جاؤ کام اُس کا

مدہوش ہے بن پیے ہی محفل
چلتا ہے فریب جام اُس کا

اے صیدِ ہوس ! ابھی تو شاید
پھیلا بھی نہیں تھا دام اُس کا

یہ شہر ہے جائیداد اُس کی
ہر شخص ہے اب غلام اُس کا

کستا ہے وہ کس طرح طنابیں
دیکھے کوئی انتظام اُس کا

اتنا بھی نہیں کہ کچھ نہ سمجھیں
پیچیدہ سہی کلام اُس کا

جاگے تو ہیں اہلِ شوق ، اے دل
سونا تو ہُوا حرام اُس کا

تھوڑے ہیں ، ظفر ، جناب کے دن
مشہور ہے انتقام اُس کا

-☆-

شکوۂ سختی بے جا نہیں کرنے دیتے
ایسے اُلٹے ہیں کہ سیدھا نہیں کرنے دیتے

کہتے ہیں کام کا یہ وقت ہے ، باتوں کا نہیں
اس لیے آپ کو جلسہ نہیں کرنے دیتے

رکھا جائے گا حساب اس کا بھی پُورا ، یعنی
خود وہ کیا کرتے ہیں ، اور کیا نہیں کرنے دیتے

حشر کرتے ہیں تمناؤں کا جو ، ظاہر ہے
یہ غلط ہے کہ تمنا نہیں کرنے دیتے

سر پہ رکھتے ہیں سدا سایۂ شفقت اپنا
کوئی بھی کام وہ تنہا نہیں کرنے دیتے

سب کو اُلجھائے بھی رکھتے ہیں وہ آپس میں ظفر
یہ بھی سچ ہے کہ وہ جھگڑا نہیں کرنے دیتے

-☆-

یہ شہر چھوڑ دے کہ شرافت اسی میں ہے
اس کے علاوہ اب تری عزت اسی میں ہے

بندش اگر بیانِ حقیقت پہ ہے تو کیا
سمجھو تو اعترافِ حقیقت اسی میں ہے

کرتے ہیں اپنا کام وہ لے کر ہمارا نام
سچ پوچھیے تو ساری شرارت اسی میں ہے

روکے وہ کس طرح سے بھلا کاروبارِ ظلم
اس چشمِ ناز کی بھی شراکت اسی میں ہے

اس عہدِ نامراد سے ناخوش نہ ہو، ظفر
آخر بھلے دنوں کی بشارت اسی میں ہے

☆

اصل میں صرف سُلانے کے لیے آیا تھا
جو ہمیں خواب دکھانے کے لیے آیا تھا

دولتِ شہر پہ اُس کا بھی تو حق تھا، وہ بھی
اپنا حصّہ ہی چکانے کے لیے آیا تھا

رنگ جتنے تھے دکھانے کے لیے تھے، وہ تو
اپنا ہی رنگ جمانے کے لیے آیا تھا

میری تائید میں طوفان اُٹھانے والا
میری آواز دبانے کے لیے آیا تھا

کام تھا مجھ سے اُس احسان فراموش کو جب
خود مجھے گھر سے نکالنے کے لیے آیا تھا

جا رہا ہے تو عجب کیا ہے، کہ آخر وہ بھی
دُوسروں کی طرح جانے کے لیے آیا تھا

ماندہ تختے بھی، ظفر، بیچ کے بیٹھا ہے جو شخص
ٹوٹی کشتی کو بچانے کے لیے آیا تھا

☆

جو پہلے کہہ چکا اس سے مُکرنا چاہتا ہے
اسی خاطر وہ ہم سے بات کرنا چاہتا ہے

کچھ اس انداز سے اُس نے تسلّی دی کہ ہم بھی
یہی سمجھے کہ وہ کچھ کر گزرنا چاہتا ہے

رگوں میں قید ہے اِک عمر سے جو موجۂ خوں
رہا ہو کر وہ سڑکوں پہ بکھرنا چاہتا ہے

بہت بیزار ہے دیوار بھی ، اِس کے علاوہ
پرانا پوسٹر خود بھی اُترنا چاہتا ہے

وہ ہاتھوں میں لیے پھرتا ہے کالک کا کنستر
یہاں ہر خواب کا چہرہ بکھرنا چاہتا ہے

ظفر اقبال ، کچھ سود و زیاں بھی دیکھ اپنا
بھلے مانس ! یہ تُو کِس موت مرنا چاہتا ہے

-☆-

ہمارے ساتھ وہ ظاہر ہے جو کچھ کرنے والا ہے
اور اُس کے ساتھ ہی الزام جس پہ دھرنے والا ہے

شمارِ عام میں تو مُنہ کی کھائی ہے بہ پے اُس نے
بساطِ خاص پہ بھی وہ یہ بازی ہرنے والا ہے

زمیں کروٹ بدلنے کے لیے تیار ہو جیسے
گھڑی رُکنے کو ہے ، جنگل میں آہو ڈرنے والا ہے

بہت نیندیں نچھاور کر چکے ، اب چین سے سونا
کہانی ختم پہ آئی ہے ، مجنوں مرنے والا ہے

ظفر ، کِس کِس کو دکھلاتے پھروگے ، اور پھر کب تک
کہ یہ زخمِ تماشا کوئی دن میں بھرنے والا ہے

-☆-

ایک بیوی ہے ، چار بچے ہیں
عشق جھوٹا ہے ، لوگ سچے ہیں

ہمیں دینے کے واسطے اُس پاس
لاکھ دھوکے ، ہزار غچے ہیں

کیا خریدیں ، کہ وصل کے انگور
تھوڑے کھٹے ہیں ، تھوڑے کچے ہیں

آپ شاکی ہیں آج کل جن کے
آپ ہی کے وہ تائے چچے ہیں

وہ تو اب مانتا نہیں ، اے دل
آپ جیسا بھی ناچ نچے ہیں

تالیاں ہیں یہ تیرنے کے لیے
ڈوبنے کے لیے چوبچے ہیں

چلنا رُکنا اب اُن کے بس میں کہاں
یہ تو چھکڑے ہی بے کلچے ہیں

گھر میں جو بچ رہا ہے چوروں سے
کچھ جرابیں ہیں ، چند کچھے ہیں

اُن کا برتاو ہی بُرا ہے ، ظفر
ویسے وہ آدمی تو اچھے ہیں

-☆-

مجھ سے تو پوچھتا ہے وہ ، انکار کیوں ہوا
خود بھی ذرا بتائے کہ اصرار کیوں ہوا

شوقِ سفر پہ اُس کے مجھے شک نہیں ، مگر
اپنے ہی راستے کی وہ دیوار کیوں ہوا

تقسیم کر دیا مجھے ٹکڑوں میں کس لیے
بتلاؤ ، میرے حق میں وہ تلوار کیوں ہوا

رہتا ہوں میں تو اُس کی شرائط پہ شہر میں
اس پر بھی سرگراں وہ کئی بار کیوں ہوا

اب یہ نیا فریب ہے کیا ، میرے حال پر
اُس کی طرف سے رنج کا اظہار کیوں ہوا

نالاں تھی جس کے نام سے خلقِ خدا ، ظفر
دنیا میں تُو ہی اُس کا طلب گار کیوں ہوا

-☆-

ابھی تبدیل کر لیں جو طریقہ آپ کا ہے
وگرنہ خاتمہ بالخیر پکّا آپ کا ہے

وہ دن آیا ہی سمجھیں جب یہاں دیکھیں گے خود آپ
کہ دُنیا ہے تماشائی ، تماشا آپ کا ہے

کسی بھی دُوسرے کو بیچ میں مت ڈالیے گا
کہ یہ جھگڑا ہے جتنا بھی ، ہمارا آپ کا ہے

یہی کیڑے مکوڑے لوگ یکجا ہو گئے جب
تو سمجھیں اُن کے کاندھوں پر جنازہ آپ کا ہے

یہ دریا آپ نے اعمال سے کھودا ہے اپنے
اسی میں آپ ڈوبیں گے ، یہ دریا آپ کا ہے

کبھی کہتے تھے کچھ ، اور ، آج کرتے اور کچھ ہیں
ذرا کھل کر دکھائیں ، کیا یہ چہرہ آپ کا ہے

کسی بھی اور کا حصّہ ہو کیا کوئی بھی اس میں
کہ جو ہے سامنے ، سارے کا سارا آپ کا ہے

مجھے اک بات یاد آئی ہے یُونہی بیٹھے بیٹھے
یہ سب کچھ تھا کبھی کا جس پہ قبضہ آپ کا ہے

ظفرؔ کو کیوں نہ مار آستیں کہیے کہ ظالم
ملا ہے دُشمنوں سے ، اور ، بندہ آپ کا ہے

☆

لوگ تو ایک ہی جیسے ہیں
پھر یہ جھگڑے کیسے ہیں

اُن کی نسل ہے خاص الخاص
ہم ہی ایسے ویسے ہیں

اُس کا ہے انصاف یہاں
جس کی جیب میں پیسے ہیں

خوب مویشی خانہ ہے
بھینس نہیں اور بھینسے ہیں

ہونے دیتے نہیں خبر
وہ چالاک ہی ایسے ہیں

پھر ناراضی ہے کیسی
جھگڑے تو سب طے سے ہیں

اپنے رشتے ناتے سب
ایک لچکتی لے سے ہیں

گھر چھڑوائے گی ہم سے
تنگ بہت ہے ہے سے ہیں

اس دُنیا میں ہم بھی ، ظفرؔ
ہیں ، بس جیسے تیسے ہیں

☆

بات سچ کہتا ہوں، اب تجھ سے تو کچھ پردہ نہیں ہے
وہ بُرا تھا ہی، مگر، تُو بھی بہت اچھا نہیں ہے

آپ دونوں نے جو یہ چکّر چلا رکھا ہے مِل کر
لوگ اس سے بے خبر تھے، لیکن، اب ایسا نہیں ہے

تُو ہی تقدیریں بدلنا چاہتا ہے غمزدوں کی
یعنی خُوش فہمی میں کوئی مُبتلا اتنا نہیں ہے

جو تُجھے لائے تھے مِل کر اِس مقامِ مُعتبر تک
آج اُن کے ساتھ تیرا کوئی بھی رشتہ نہیں ہے

تیرے گرداگرد جیسے لوگ ہوتے ہیں ہمیشہ
بیٹھ کر تُو اُن میں تنہا بھی ہے اور تنہا نہیں ہے

یہ نظامِ زر، مُبارک ہو، تُجھے بھی راس آیا
جس میں ناداروں، غریبوں کا کوئی رَولا نہیں ہے

تُو نے سمجھوتا کِیا، اور، خلق حیراں رہ گئی تھی
سب یہی سمجھے ہُوئے تھے یُوں کبھی ہوتا نہیں ہے

اور ہی اب ہاتھ دِکھلانا پڑیں گے اہلِ دل کو
سلسلہ یہ بھی زیادہ دیر تک چلتا نہیں ہے

جو اُصُولوں کو بدل لیتے ہیں مَوسموں کی طرح سے
اپنا اُن کے ساتھ ذاتی تو کوئی جھگڑا نہیں ہے

-☆-

مرے بیاباں میں کس بھلا کیا اسی لیے تھا
وہ صبح دم موجہ ہوا کیا اسی لیے تھا

یہی تھی خواہش ہماری سب کی جو زُودُو ہے
جو ہم نے دیکھا تھا خواب سا، کیا اسی لیے تھا

ترس گئی ایک لفظِ اُلفت کو ساری مخلوق
وہ خاک و خُوں کا مُعاشقہ کیا اسی لیے تھا

کہ سانس بھی کوئی لے نہیں پائے اس فضا میں
وہ اِک ہوادار سِلسِلہ کیا اسی لیے تھا

بجائے منزل جو موت کی کھائی سامنے ہے
یہ رہ نوردی، یہ راستہ کیا اسی لیے تھا

یہ روشنی سب کی تھی، اسے کون لے اُڑا ہے
کِیا تھا سب نے جو فیصلہ، کیا اسی لیے تھا

یہ رزق تھا کِس کا، اور، اِسے کون کھا رہا ہے
ہر ایک لُطف اور ذائقہ کیا اسی لیے تھا

دلوں کی حالت یہ کیا سے کیا ہو گئی دنوں میں
وہ دلبری، وہ مُعاملہ کیا اسی لیے تھا

ظفرؔ، اب اس ہجر گاہ سے جائیں بھی کہاں ہم
کہ وصل کا تھا جو واہمہ، کیا اسی لیے تھا

-☆-

پہلے کالے ایک اگر ہو جائیں تو
کرماں والے ایک اگر ہو جائیں تو

طاقت ہیں دُنیا میں سب سے بڑی غریب
لیکن ، سالے ایک اگر ہو جائیں تو

نئے نرالے تو کچھ سوچیں سمجھیں گے
دیکھے بھالے ایک اگر ہو جائیں تو

عیاروں کی دال نہیں گل سکتی ہے
بھولے آلے ایک اگر ہو جائیں تو

مل کر دریا اور سمندر بن جائیں
ندیاں نالے ایک اگر ہو جائیں تو

قوّت بنیں جوانوں اور بزرگوں کی
لڑکے بالے ایک اگر ہو جائیں تو

کھود نکالیں کھویا ہُوا خزانہ بھی
کسیاں پھالے ایک اگر ہو جائیں تو

دم بھر میں چھٹ جائے پُرانی تاریکی
نئے اُجالے ایک اگر ہو جائیں تو

ایرے غیرے نتھو خیرے ، اور ، ظفر
سبھی حوالے ایک اگر ہو جائیں تو

-☆-

شاعر جو بھی یہاں پر چھوٹے بچے ہیں
سارے کے سارے ہی مجھ سے اچھے ہیں

کچھ موقع تو دیجیے ، گود میں سر رکھ کر
سو جائیں گے ، ہم تو آپ کے بچے ہیں

صحنِ گاہِ سخن میں بھیڑ بچی ہے کیا
اوپر نیچے بچے ہیں ، اور ، زچے ہیں

لفظوں کے رنگین غبارے ہیں ہر سُو
اور ، باتوں کے بنے بنائے لچھے ہیں

اوپر سے کپڑے بھی شعر کو پہناؤ
نیچے تو بنیانیں ہیں ، اور کچھے ہیں

کودتے پھرتے ہیں والانِ محبت میں
ایک ہی بات ہے ، بچھڑے ہیں یا بچھے ہیں

اشرف بننے میں کچھ وقت لگے گا انھیں
پہلے اتھو ہوتے تھے ، اب اچھے ہیں

چلیے کچھ تو دوسروں کو دیتے ہیں آپ
بے شک وہ سب دھوکے ہیں اور غچے ہیں

کرتے ہیں کیا بات ظفر صاحب کی آپ
دھن کے پکے اور کانوں کے کچے ہیں

-☆-

مسائل ہو تو سکتے ہیں، مگر، تفہیم بھی ہو گی
کبھی کے درمیاں اُس حُسن کی تقسیم بھی ہو گی

وفورِ شوق ہو سکتا نہیں کارِ دلِ تنہا
سو، اس یلغار کے پیچھے کوئی تنظیم بھی ہو گی

ہوائے ہجر ہو گی اک طرف، اور دوسری جانب
لرزتی سی کوئی شاخِ اُمید و بیم بھی ہو گی

وہ آدابِ محبت آپ سکھلائیں گے اب ہم کو
ہمارے واسطے یہ لازمی تعلیم بھی ہو گی

ہمارا حال آخر بزم میں کیوں کر نہ پُوچھیں گے
اگر تاخیر ہو گی تو کبھی تقدیم بھی ہو گی

ہمارے دوستوں سے وہ ہمیں مروائیں گے، لیکن
توقع ہے کہ اس تجویز میں ترمیم بھی ہو گی

کبھی یہ آپ کے اعلان کردہ خواب اچھے ہیں
مگر، ان میں سے کیا ایک آدھ کی تجسیم بھی ہو گی

ظفرؔ جن کاوشوں پر آج خاص و عام کے ہاتھوں
تری تذلیل ہوتی ہے، کبھی تعظیم بھی ہو گی

☆

[illegible] آرام دینا چاہیے تھا
بھٹکتا ہوں تو کوئی کام دینا چاہیے تھا

میں اُلٹا واجبِ تعزیر ٹھہرایا گیا ہوں
مجھے جس بات پر انعام دینا چاہیے تھا

مجھے تفویض کرنی چاہیے تھی خوش گمانی
کہیں کوئی خیالِ خام دینا چاہیے تھا

یہ خواہش کیا ہے، اس کی ماہیت معلوم کر کے
کوئی اچھا سا اس کو نام دینا چاہیے تھا

کبھی آرام کے دوران پہنچائی ہے تکلیف
تو، اب تکلیف میں آرام دینا چاہیے تھا

یہاں کوئی نیا ہی گُل کھلانے کے بجائے
اسی آغاز کو انجام دینا چاہیے تھا

محبت جس قدر بھی تھی، چھپاتے کیوں رہے ہم
حوالہ یہ تو صبح و شام دینا چاہیے تھا

یہ طرزِ خاص کیا مجھ کو ودیعت کر دیا ہے
مجھے تھوڑا قبولِ عام دینا چاہیے تھا

ظفرؔ، شاعر اگر ہوتے تو اپنی شاعری میں
کوئی اس قوم کو پیغام دینا چاہیے تھا

☆

طریقہ وہی دیکھا بھالا تو ہے
مجھے دوسرے دن پہ ٹالا تو ہے

سہولت اُسے بھی میسّر نہیں
بہت اُس نے مشکل میں ڈالا تو ہے

کرے اپنے سانچے کی بھی فکر وہ
مجھے اُس نے سانچے میں ڈھالا تو ہے

چھپاتے تو ہیں آپ بھی کوئی بات
کہیں دال میں کالا کالا تو ہے

میں ضائع جو کرتا ہوں اس عمر کو
کوئی اس کا مصرف نکالا تو ہے

محبت میں ہو گی نہ کیوں احتیاط
ہتھیلی پہ اپنی یہ چھالا تو ہے

خیال اپنی صحت کا رکھنے لگا
کوئی اس نے بھی روگ پالا تو ہے

سروں سے گزرنے لگی اپنی بات
ہمارا بھی کچھ بول بالا تو ہے

یہاں زندگی اور کیا ہو، ظفر
یہی بس اندھیرا اُجالا تو ہے

☆

کون ہے جس کے سوا کوئی نہیں تھا
جانتے تھے، مانتا کوئی نہیں تھا

کچھ نہ ہونے کے ہیولے کے علاوہ
درحقیقت جو بھی تھا، کوئی نہیں تھا

غیب میں کچھ پھول سے کھلتے تھے ہر سُو
چلتی رہتی تھی ہوا، کوئی نہیں تھا

ڈھونڈتی پھرتی تھی کچھ ساری خدائی
خاک تھی، لیکن، خدا کوئی نہیں تھا

جس جگہ آ کر بہم ہونا تھا ہم کو
اُس سے آگے راستہ کوئی نہیں تھا

سُن رہے تھے، اور، سمجھتے کچھ نہیں تھے
کہہ رہے تھے، سوچتا کوئی نہیں تھا

شعبدے بازوں کے تھے وارے نیارے
معجزوں کو پوچھتا کوئی نہیں تھا

کہنے والوں کے لیے انعام تھے سب
کرنے والوں کا صلہ کوئی نہیں تھا

آنکھ خالی تھی، ظفر، رنگِ طلب سے
ہونٹ پہ حرفِ دعا کوئی نہیں تھا

☆

مٹا ہے رنگِ دل، تصویر آدھی رہ گئی ہے
ہمارے خواب کی تعبیر آدھی رہ گئی ہے

یہ کڑیاں ایک اِک کر کے نکلتی جا رہی ہیں
محبت ہے، مگر زنجیر آدھی رہ گئی ہے

مجھے ہر عرض کرنی پڑ گئی ہے دُوسری بار
کہ اپنی بات کی تاثیر آدھی رہ گئی ہے

ادھورا تو نہیں تھا میری قسمت کا ستارہ
مگر، پھر بھی مری تقدیر آدھی رہ گئی تھی

محبت کا مکاں اب کس طرح ہو گا مکمل
کہ خرچہ ختم ہے، تعمیر آدھی رہ گئی ہے

میں اپنا مدعا کھل کر بیاں کر تو چکا ہوں
مگر، شاید مری تقریر آدھی رہ گئی ہے

میں ہر غم کو اُڑا دینے لگا ہوں کیا ہنسی میں
دنوں میں ہی مری جاگیر آدھی رہ گئی ہے

مرا جذبہ ابھی پُورے کا پُورا ہے اُسی طور
مگر، لڑتے ہوئے شمشیر آدھی رہ گئی ہے

ظفر، بوسیدگی نے کام دکھلایا ہے ایسا
مرے دیوان کی تحریر آدھی رہ گئی ہے

-☆-

مسافت کے اندھیروں میں اُجالا راستہ ہے
جو خُود منزل ہی منزل ہے، یہ کیسا راستہ ہے

ہم اپنے راستوں پر چل پڑے ہیں، ورنہ اب بھی
حُسینی راستہ ہی ایک سچا راستہ ہے

وہ دن کب آئے گا جس روز ہم یہ کہہ سکیں گے
تُمھارا راستہ ہی اب ہمارا راستہ ہے

ہمیں نے تُجھ اسے آساں سمجھ رکھا ہے، ورنہ
حقیقت میں بہت مشکل تُمھارا راستہ ہے

ہم اس کو چھوڑ بیٹھے ہیں تو یہ قسمت ہماری
وگرنہ یہ تو اپنا دیکھا بھالا راستہ ہے

کبھی توفیق ہو تو دیکھنا اُس پر بھی چل کر
بہت سے راستوں میں جو اکیلا راستہ ہے

کئی بل پیچ ہم نے ڈال رکھے ہیں خُود اس میں
وگرنہ یہ تو سادہ اور سیدھا راستہ ہے

چلیں اتنا کہ ہم اس راستے کی خاک ہو جائیں
اگر سچ پُوچھیے تو یہ اک ایسا راستہ ہے

ظفر، یہ تو ابھی آغاز ہے رنجِ سفر کا
ابھی سے پُوچھتے ہو، اور کتنا راستہ ہے

-☆-

حساب اب کیجیے تسلی کے ساتھ کتنے کی روٹیاں ہیں
جو کھا رہے ہیں وہاں پہ بیٹھے، ہمارے حصے کی روٹیاں ہیں

یہ پانچ فی صد لگے ہوئے ہیں جو چیرنے اور پھاڑنے میں
یہ درحقیقت پچانوے فیصدوں کے آنے کی روٹیاں ہیں

ہمیں تو ملتی نہیں ہے وہ وقت رُوکھی سُوکھی بھی قاعدے سے
مگر، جو سالن میں تر بتر ہیں، یہ اُن کے گھٹنے کی روٹیاں ہیں

ہماری پہچان میں ہے سارا سجا ہُوا اُن کا خوانِ نعمت
تمام چوری کے ہیں یہ چاول، یہ ساری ڈاکے کی روٹیاں ہیں

تُمھارے گندم کی بدعتوں سے بچا رہے ہیں وہ خُوب ہم کو
اسی لیے تو کچھ ایسا لگتا ہے اینٹ روڑے کی روٹیاں ہیں

ہماری چھابی میں آج رونق نظر جو آتی بھی ہے تو ایسے
کہ پیاز ہے قرض کا ہمیشہ سے، اور، اُدھارے کی روٹیاں ہیں

وہ کھا رہے ہیں ہماری قسمت تو ہم بھی فارغ نہیں ہیں بیٹھے
کہ لکھتے جاتے ہیں، یہ ہمارے ہی پیسے پیسے کی روٹیاں ہیں

عجب نہیں ہے جو اُٹھ کے گندم کے سارے گودام ہی جلا دیں
کہ اپنی تقدیر میں تو پہلے ہی مانگے تانگے کی روٹیاں ہیں

گُزارہ اُن کا بھی چلتا رہتا ہے، اے ظفر، ساتھ ساتھ سب کے
کہیں کمیشن کا دال دلیہ، کہیں منافعے کی روٹیاں ہیں

-☆-

معاملات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں
کہ واجبات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

دبوچتا کوئی پھر بھی نہیں انھیں، ورنہ
یہاں پہ ہاتھ زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

تُم آگے بڑھ کے انھیں ناپتے نہیں کیوں کر
کہ اب تو ساتھ زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

کدھر کدھر انھیں لٹکائیں گے درختوں سے
یہاں جہات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

کہاں سے کیجیے پُورا یہ جمع و خرچ، اُن کی
نوازشات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

چھُرے، کُلھاڑیاں، پستول، رسیاں، پنجے
لوازمات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

صلیب، سُولیاں، مرگھاٹ، پھانسیاں، پھندے
تلازمات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

شبانہ روز بھی کاٹیں تو کچھ زیادہ نہیں ہے
دن اور رات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

حساب کر کے بھی دیکھا ہے بار بار، ظفر نے
مطالبات زیادہ ہیں، گردنیں کم ہیں

-☆-

نہیں حل ہو رہا یہ مسئلہ حال آں کہ چھوٹا ہے
ہماری بھوک ذِگنی ہے کہ اُن کا پیٹ موٹا ہے

یہ باتوں سے کہاں مانیں گے ، ہیں یہ بھوت لاتوں کے
علاج اِن کا اگر کچھ ہے تو خالی ڈانگ سوٹا ہے

اُگلوائیں گے تُم نے مال جو کھایا ہے سب اپنا
ہمارے نام پر ہم کو ہی جو لُوٹا کھسوٹا ہے

ہمارا ہی لہو پٹرول بن کر ہے رواں اس میں
یہ فراٹے بھرا کرتی تمہاری جو ٹیوٹا ہے

تمہارا جو بھی ہے ہرگز تمہارا ہو نہیں سکتا
اُتاریں گے کسی دن ، یہ جو سارا پھول گوٹا ہے

اِسی مٹّی کی پیداوار تُم بھی ہو ، مگر ، یہ کیا
ہمیں بوٹی نہیں ملتی ، تمہارے پاس بوٹا ہے

تمہارا پیٹ ہی پھاڑیں گے تو نکلے گی شے کوئی
کہ پُورا ہو رہا ہے صبر کا اپنا جو کوٹا ہے

تمہارا جھوٹ بھی بازار میں بکتا ہے سچ ہو کر
مگر ، ساری دُکانوں پر کھرا بھی اپنا کھوٹا ہے

☆

اپنا تو مذہب ہی اس بُنیاد پہ قائم ہے
جو جتنا مقتول ہے ، اُتنا ہی مُجرم ہے

باڑھ ہی سارا کھیت کھا گئی ، اب کس سے پُوچھیں
مہا چور ہے جو بھی ، وُہی ہمارا حاکم ہے

جو جتنا بھی فاسق اور منافق ہے ، دیکھو
اُس کا لب و لہجہ اُتنا ہی نرم و ملائم ہے

چلیے کچھ بہروپ تو بدلا ہے بے چارے نے
اندر سے جاہل پُورا ، باہر سے عالم ہے

غور سے اُس کا چہرہ دیکھو ، اور قیاس کرو
جو پہلے ہوتا تھا ، کیا یہ وُہی ملازم ہے

یہ فرسودگی اب اپنے انجام کو پہنچے گی
ظاہر میں پہلے کی طرح جو قائم و دائم ہے

پکڑو اُس کو ، اور خود ہی اُس کی تفتیش کرو
جو موٹی گردن والا ہے ، تمہارا ملزم ہے

کچھ بھی کہنا چاہتے ہو تو کھل کر کہو ، ظفر
ان حالات میں سچّی سیدھی بات ہی لازم ہے

☆

بڑھ کر جینا ہے یا گھٹ کر مرنا ہے
مرنا ہے تو سامنے ڈٹ کر مرنا ہے

مُولی گاجر ہو جائیں گے ہم اور وہ
کاٹ کے مارنا ہے، اور، کٹ کر مرنا ہے

اُن کو مار کے واپس تو آ جانے دو
ہم نے مرنا ہے تو پلٹ کر مرنا ہے

کھیل یہ اب جاری نہیں رہ سکتا ہے اور
آج بساطِ ناز اُلٹ کر مرنا ہے

اِس تاریک سفر میں ہم نے بالآخر
سُورج کے ٹکڑوں میں بٹ کر مرنا ہے

مرنے کی محتاجی بھی اب نہیں رہی
اپنے ہی دامن سے لپٹ کر مرنا ہے

کوئی ہمیں کیا مار سکے گا دُنیا میں
ہم نے اپنے زور میں پھٹ کر مرنا ہے

پل بھر کی اِس روشنی اور اندھیرے میں
پھیل کے جینا، اور، سمٹ کر مرنا ہے

ہم نے مر کر زندہ بھی ہونا ہے، ظفر
دیکھی بھالی راہ سے ہٹ کر مرنا ہے

☆

بھوکے ہو تو کھلیانوں پر ٹوٹ پڑو
ننگے ہو، ان ایوانوں پر ٹوٹ پڑو

چوروں اور ڈکیتوں کے مارے لوگو
اُٹھو، اور اُٹھ کر تھانوں پر ٹوٹ پڑو

کنکر پتھر جو بھی ہاتھ لگے، لے کر
ان سب آئینہ خانوں پر ٹوٹ پڑو

نوابوں، سیٹھوں، پیروں پر ڈالو ہاتھ
چودھریوں، ملکوں، خانوں پر ٹوٹ پڑو

ایک یہی صُورت ہے اب چھٹکارے کی
جعلی اصلی زندانوں پر ٹوٹ پڑو

محلوں کی یلغار کو ہو جاؤ تیار
پہلے اُن کے دربانوں پر ٹوٹ پڑو

ہم سے پُوچھو، یہ سب مال تُمھارا ہے
سارے سازوں، سامانوں پر ٹوٹ پڑو

اُٹھو، اور، ناکام بنا دو یہ سازش
اور، اِس کے تانے بانوں پر ٹوٹ پڑو

مانو بات ظفر جیسوں کی مِل جُل کر
یا پھر ایسے دیوانوں پر ٹوٹ پڑو

☆

بہت بدحالیاں جھیلی ہیں ، خوشحالوں پہ چڑھ دوڑو
یہی جڑ ہیں خرابی کی ، اُٹھو ، سالوں پہ چڑھ دوڑو

دھری رہ جائے یہ ریشہ دوانی سب کی سب اُن کی
کہ سارے اُن کے پھیلائے ہوئے جالوں پہ چڑھ دوڑو

اب اُن کے راستے سب روک لینا چاہیے ہوں گے
اکٹھا ہو کے اُن سارے بداعمالوں پہ چڑھ دوڑو

نہ کوئی کام کرتے ہیں ، نہ کوئی فکر ہے ان کو
سب ایسے کھاتے پیتے فارغ البالوں پہ چڑھ دوڑو

خبر ہو جائے اُن کو بھی حقیقی زندگی کیا ہے
اگر اُن ناز و نعمت کے کبھی پالوں پہ چڑھ دوڑو

یہ سارا تانا بانا منہدم ہو گا اُسی صورت
کہ اُن کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے دلّالوں پہ چڑھ دوڑو

یہاں کارِ ثواب اس سے زیادہ اور کیا ہو گا
جو پھولے پیٹوں ، موٹی گردنوں والوں پہ چڑھ دوڑو

جہاں سے اُن کی جاگیریں پڑی سیراب ہوتی ہیں
کبھی دریاؤں ، نہروں اور ندی نالوں پہ چڑھ دوڑو

ظفر بھی ہم کو اصلی انقلابی تو نہیں لگتا
نہ جانے پائے یہ بھی ، ایسے نقالوں پہ چڑھ دوڑو

-☆-

ان بڑے لوگوں کو آگے بڑھ کے سیدھا کیوں نہیں کرتے
تم اگر ان کے مخالف ہو تو ایسا کیوں نہیں کرتے

خود اگر اُن کی طرح کے ہو نہیں سکتے کسی صورت
امر کیا مانع ہے ، اُن کو اپنے جیسا کیوں نہیں کرتے

کچھ اگر کھایا پیا اُن سے اُگلوانا بھی ہے تم کو
تو خدا کا نام لے کر اُن کو اُلٹا کیوں نہیں کرتے

خود بخود تو کچھ بھی ہو پایا نہیں کرتا کہیں پر بھی
کچھ اگر کرنا ہے تو اس کا تہیّہ کیوں نہیں کرتے

اس طرح کیسے یہاں انصاف بھی مل جائے گا تم کو
سامنا کرتے ، اُلجھتے ، اور ، جھگڑا کیوں نہیں کرتے

یہ تمھارا ہی لہو اُن کی رگوں میں دوڑے جاتا ہے
اُن سے واپس کیوں نہیں لیتے ، تقاضا کیوں نہیں کرتے

چور بھی ہیں اور معزز بھی وہی سب سے زیادہ ہیں
تم سرِ بازار اُن کو لا کے رُسوا کیوں نہیں کرتے

یہ حکومت بھی تمھی پر کرنے آ جاتے ہیں جب دیکھو
کوئی اپنے آپ میں سے تم بھی پیدا کیوں نہیں کرتے

اس شرافت سے ، ظفر ، کچھ بھی تمھیں حاصل نہیں ہو گا
کیوں لگا رکھا ہے دل سے اس کو چلتا کیوں نہیں کرتے

-☆-

کیا دُبدھا ہے ، بھائی ڈکیت
گیٹ کھلا ہے ، بھائی ڈکیت

اس روزی پر آپ کا بھی
حق بنتا ہے ، بھائی ڈکیت

تاکا بھی کچھ دور نہیں
وہ تھانہ ہے ، بھائی ڈکیت

کھانے کا فرمائیں شوق
میز لگا ہے ، بھائی ڈکیت

آخر کس مجبوری سے
مُنہ ڈھانپا ہے ، بھائی ڈکیت

سوئے ہیں پہرے دار سبھی
سب اچھا ہے ، بھائی ڈکیت

وردی میں آنے کا کچھ
اور مزہ ہے ، بھائی ڈکیت

پہلے آنے والوں سے
یہی بچا ہے ، بھائی ڈکیت

بات ظفرؔ کی بھی سُن لیں
کیا کہتا ہے بھائی ڈکیت

☆

زندگی پانو کی زنجیر نہیں ہو سکتی
اُس کی خواہش مری تقدیر نہیں ہو سکتی

خواب وحشت سے بھلا دل کی تسلی کیا ہو
اصل جو شے ہے وہ تصویر نہیں ہو سکتی

اپنے انجام کو پہنچوں گا بہت جلد ، کہ اب
اور اِس کام میں تاخیر نہیں ہو سکتی

بیش و کم جھوٹ بھی سچ میں نہ ملاؤں جب تک
اُس میں پیدا کوئی تاثیر نہیں ہو سکتی

لکھتا رہتا ہوں بہت کچھ ، مگر افسوس ہے یہ
بات جو اصل ہے ، تحریر نہیں ہو سکتی

خاک دل کو نظر انداز تو کرتا ہوں ، مگر
اِس سے بڑھ کر کوئی اکسیر نہیں ہو سکتی

شاملِ حال ہے نیت کی خرابی جب تک
کوئی تدبیر بھی تدبیر نہیں ہو سکتی

انہدام اپنا ہی اب پیشِ نظر ہے کہ ظفرؔ
اِس سے پہلے کوئی تعمیر نہیں ہو سکتی

☆

جتنی ہو جیسی چھترول
ہوتی ہے اچھی چھترول

اس کی اپنی حکمت ہے
یوں ہی نہیں ہوتی چھترول

خوش جو فریقِ ثانی ہے
اُس کی بھی ہو گی چھترول

کرتی ہے یہ دودھ کا دودھ
پانی کا پانی چھترول

لیٹے ہی رہیے فی الحال
رہتی ہے آدھی چھترول

پیسے چار لگاتے ہی
ختم ہوئی کیسی چھترول

بعد میں ہوئی علیک سلیک
پہلے اُس نے کی چھترول

کپڑے جھاڑ کے اُٹھ بیٹھے
جھیل گئے ساری چھترول

تھانہ ہے گھر میں ہی، ظفر
رہتی ہے خاصی چھترول

-☆-

اگر توڑ ہے اور مگر توڑ ہے
یہ منہگائی کتنی کمر توڑ ہے

کئی عیب کھولے تو جا کر کھلا
کہ یہ کام کیسا ہنر توڑ ہے

اُڑائے خبر کوئی اُس کی کہاں
وہ سب سے بڑا خود خبر توڑ ہے

نہیں شوق کی کوئی قیمت، مگر
محبت کی پرواز پر توڑ ہے

نتیجہ نہ نکلے یہ ہے اور بات
ہماری تو کوشش بھی سر توڑ ہے

گرہ کھول سکتی ہے گرداب کی
یہی لہر ایسی بھنور توڑ ہے

اُسی کے مضافات میں ڈھونڈیے
یہاں کوئی اُس کا اگر توڑ ہے

کوئی خاک باندھے گا رختِ سفر
کہ خود ہی یہ منزل سفر توڑ ہے

مَیں اس بار ہوتا نہ کیوں پاش پاش
کہ یہ شاعری ہی ظفر توڑ ہے

-☆-

جہاں تمھارے رشوت خور
وہیں ہمارے رشوت خور

وہی کنائے معنی خیز
وہی اشارے رشوت خور

گنتی میں ہی نہیں آتے
لاکھ ہزارے رشوت خور

انتظار میں بیٹھا ہے
پانو پسارے رشوت خور

بس کا کرایہ رہنے دے
میرے پیارے رشوت خور

اپنے سر لے لیتا ہے
جھنجھٹ سارے رشوت خور

بگڑے ہوئے ہمیشہ کے
کام سنوارے رشوت خور

سب کی نظر میں رہتے ہیں
یہ بے چارے رشوت خور

کم پڑتے ہی اس نے ظفر
لیے اُدھارے رشوت خور

☆

پیسے مانگتا ہے ڈھلوائی کرنے والا
پیچھے ہی آتا ہے صفائی کرنے والا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور بھی خرچہ کر بیٹھا ہوں
ملا نہیں مجھ کو مہنگائی کرنے والا

فائدے بھی ہوتے ہیں اس میں چھوٹے موٹے
اچھا لگتا ہے رسوائی کرنے والا

صلح کی بات ذرا چلتی ہے تو اُس لمحے
آ جاتا ہے کوئی لڑائی کرنے والا

کب سے، اور، کہاں سے آیا ہے یہ آخر
ساری محفل میں تنہائی کرنے والا

یہ تو ہمیشہ اندر ہی بھیجا کرتے ہیں
ہو گا کوئی اور رہائی کرنے والا

آگے بڑھنے کی نیت کر کے ہی اکثر
پیچھے ہٹتا ہے پسپائی کرنے والا

بھجوایا پیغام انگوٹھی جس کے ہاتھوں
خود وہ نکلا مار کٹائی کرنے والا

کہو، ظفر، کیسا لگتا ہے خود بھی تم کو
یہ پیرایہ حال دہائی کرنے والا

☆

آدھی رات منگائی روٹی
تھوڑی تھوڑی کھائی روٹی

پاس آنے پر ڈانٹا ڈپٹا
دور سے آپ دکھائی روٹی

جان گئے ، پہچان گئے ہم
جس نے جہاں چھپائی روٹی

کاش کبھی وہ وقت ہمیں بھی
ملتی پکی پکائی روٹی

سامنے سب کے انھی چوروں نے
دنیا بھر کی چرائی روٹی

کھانے لگے تو اس نے آ کر
خود آگے سے اٹھائی روٹی

کاغذ کو اس نے قینچی سے
کاٹا ، اور ، بنائی روٹی

کتنی دیر پتنگ بنا کر
ہم نے آج اڑائی روٹی

پوچھا تو ناچار ظفر نے
اپنی ذات بتائی روٹی

☆

کسی تازہ سفر کے واسطے تیار ہونا ہے
مگر ، پہلے پرانے خواب سے بیدار ہونا ہے

ہمیں حاصل ہے کافی نیک نامی اس سے پہلے بھی
سو ، کم عزت کمانی ہے زیادہ خوار ہونا ہے

نہیں اچھے برے کا فرق ہی باقی ، تو ہم نے بھی
کسی سے سرخ رو ہونا ہے ، اور ، بے کار ہونا ہے

بظاہر تو یہی اسلوب خاص و عام ہے اس کا
کہیں ہمدرد بنتا ہے ، کہیں غم خوار ہونا ہے

ابھی تو بندشِ لطف و کرم تک بات ہے ورنہ
ابھی اس نے ہمارے درپے آزار ہونا ہے

ابھی سے درمیاں میں ایسے ہمت ہارنا کیسا
یہ رستہ اور ابھی اپنے لیے دشوار ہونا ہے

طرفداری ہی اس کی اب نہیں پیشِ نظر اپنے
کچھ اپنے ساتھ بھی ہم نے دیانت دار ہونا ہے

کچھ اب کے فیصلے ہو جائیں گے چپ چاپ ہی سارے
کوئی اعلان باقی ہے نہ کچھ اظہار ہونا ہے

نظر کے سامنے رہتا ہے نقشہ اس عمارت کا
ظفر ، جس کے لیے ہم نے کبھی مسمار ہونا ہے

☆

کوئی پکارا، کچھ تو کر
آج ہمارا کچھ تو کر

باتوں سے ٹرخا نہ ہمیں
کبھی خدارا کچھ تو کر

جھوٹی اُمیدیں ہی بندھا
لپا، لارا، کچھ تو کر

ٹوٹ بھی سکتی ہے یہ کمر
بوجھ اُتارا کچھ تو کر

اتنی تیز طبیعت کیا
بات گوارا کچھ تو کر

اس گھر میں حصہ تو ڈال
مٹی، گارا، کچھ تو کر

دردِ سر میرا ہی سہی
ساتھ سہارا کچھ تو کر

بدلے گا یہ وقت کبھی
ابھی گزارا کچھ تو کر

پھیکا ہے یہ بیان، ظفر
اسے کرارا کچھ تو کر

☆

کیوں اُس نے اشارہ نہیں کیا
اور، وہ بھی دوبارہ نہیں کیا

ہم نے بھی تساہل برتا ہے
اُس نے ہی نتارہ نہیں کیا

کچھ بیماری ہی ایسی تھی
کچھ آپ بھی چارہ نہیں کیا

اُس میں تو رواداری تھی بہت
ہم نے ہی گوارہ نہیں کیا

ہم ٹوٹ کے خود ہی بکھر گئے
جس شام ستارہ نہیں کیا

منظر تھا قابلِ دید، مگر
ہم نے ہی نظارہ نہیں کیا

بکھرایا تو ہم نے بھی لہو
اس کو فوارہ نہیں کیا

جتنی کہ ضرورت تھی دل کو
اُتنا ناکارہ نہیں کیا

اپنی اوقات میں رہے، ظفر
خواہش کو غبارہ نہیں کیا

☆

کہاں سے چل کے آیا ہے، کہاں ٹھہرا ہُوا ہے
یہ کیسا شور میرے درمیاں ٹھہرا ہُوا ہے

کوئی مطلب ادا ہونے نہ پائے اُس کے آگے
اِسی اِک بات پہ زورِ بیاں ٹھہرا ہُوا ہے

یہی ہے صورتِ احوال، اِسے اب جو بھی کہیے
ہوائیں چل رہی ہیں، اور، دُھواں ٹھہرا ہُوا ہے

بڑا ہے جتنا، ہے اُتنی ہی اُس میں استقامت
زمیں چل پھر رہی ہے، آسماں ٹھہرا ہُوا ہے

یہی سُنتے ہیں، آگے راستہ ہی بند ہے اب
کُھلے صحرا میں اپنا کارواں ٹھہرا ہُوا ہے

کُچھ اُس کی آپ ہی کوئی وضاحت کر سکے گا
جو اُس کے راستے میں رائیگاں ٹھہرا ہُوا ہے

ہم اِس میں رہ رہے ہیں اور خبر رکھتے نہیں کُچھ
کہ پانی پہ یہاں اپنا مکاں ٹھہرا ہُوا ہے

کئی تبدیلیاں بھی آ چُکیں، لیکن یہاں پہ
ابھی تک موسمِ عہدِ زیاں ٹھہرا ہُوا ہے

ظفرؔ، خود بھی پہنچ پائے نہیں ہوں گے وہاں ہم
لہُو میں جس جگہ زہرِ زُباں ٹھہرا ہُوا ہے

☆

گورے شاہ بھی کالے شاہ
کاروں کوٹھیوں والے شاہ

موٹے تازے صاحب، سیٹھ
سب تازوں کے پالے شاہ

بچ کر کوئی نہ جانے پائے
سارے دیکھے بھالے شاہ

بھائی بھتیجے رشتے گیر
بہنوئی اور سالے شاہ

جھوٹ فریب عوامی راج
دھوکے باز جیالے شاہ

مُرغ کڑاہی کے شوقین
بوتل کے متوالے شاہ

ہڈحرام ، نکمّے ، سُست
سب ہی ڈھیلے ڈھالے شاہ

تیرے میرے گھر میں کیوں
بھوک نے ڈیرے ڈالے ، شاہ

ڈانگ ، ڈنگوری ، پتھر ، اینٹ
جو بھی ملے ، اُٹھا لے شاہ

دُشمن داری پُوری کر
جو آواز نکالے ، شاہ

تیرے گھر جو اندھیرا ہے
باقی سبھی اُجالے . شاہ

چُپ رہ کر تسلیم نہ کر
کُچھ دن شور مچا لے ، شاہ

اُس کے ہوتے محمل کے
ننگے پانو کے چھالے شاہ

ہو جائے جب گھیرا تنگ
کرنا آل دوالے شاہ

رُوکھی سُوکھی ہی مِل جائے
مکھن ، مرچ مسالے شاہ

ٹاٹ کی بوری کافی ہے
کمبل ، شال دوشالے شاہ

اِن سے پیٹ نہیں بھرتے
سب مضمون مقالے شاہ

جینے کی کوشش میں ہی
پڑ گئے جان کے لالے شاہ

خالی برتن بولتا ہے
چُپ ہیں بھرے پیالے ، شاہ

پیلے زرد اُٹھیں گے اب
اور ، ہرے ہریالے شاہ

لوک لہر آتی ہے ، ظفرؔ
توڑ غزل کے جالے ، شاہ

-☆-

موٹے جھوٹے مُردہ باد
دل کے کھوٹے مُردہ باد

نعرے مارو ، اور ، دکھاؤ
ڈانگیں سوٹے مُردہ باد

سب سے ڈبلے نے یہ کہا
سب سے موٹے مُردہ باد

بڑے بڑے ہوں گے اِک دن
چھوٹے چھوٹے ، مُردہ باد

کھا جائیں جو ہمارے بھی
راشن کوٹے ، مُردہ باد

کھدر بھی کمیاب ہُوا
ململ گوٹے مُردہ باد

ہلکے دل والے مردود
بھاری پوٹے مُردہ باد

رنڈووں نے آواز لگائی
جوڑے ، جوٹے مُردہ باد

گھومتے رہتے ہیں جو ، ظفر
یہ سب لوٹے مُردہ باد

-☆-

جاگیروں والے تھوہ
زنجیروں والے تھوہ

شُو گُل زندہ باد
تقدیروں والے تھوہ

سب خواب ہمارے ہیں
تعبیروں والے تھوہ

گمنام ہی اچھے ہیں
تشہیروں والے تھوہ

ہم آلے بھولے ٹھیک
تدبیروں والے تھوہ

حق مانگنا جرم نہیں
تعزیروں والے تھوہ

گستاخی اپنا دین
تکفیروں والے تھوہ

تاریکی اپنی ذات
تنویروں والے تھوہ

گو شکر بھلے ، ظفر
انجیروں والے تھوہ

-☆-

آنے والا ہے اِک موڑ
آگے بڑھ یا رستہ چھوڑ

کیسی امانت، کس کا راز
چوراہے میں بھانڈا پھوڑ

مجھے نہیں کچھ بھی درکار
جا کر اُس کی ہانڈی توڑ

گورے گورے پانو تلے
کالی اینٹیں، کالے روڑ

میرے ہی کرتے ہیں سپرد
کوئی نہیں ہے جس کا توڑ

میٹھی بات نہ کر بے شک
مُنہ تو میری جانب موڑ

دل پہ جب پڑتا تھا داغ
دانت میں اب آتی ہے کھوڑ

کام آئے گا دوبارہ
ٹوٹے پھوٹے دل کو جوڑ

دے بیٹھا ہے بیان ظفر
تُو اب اِس کو توڑ مروڑ

☆

بُرا ہو یا کہ اچھا ہونے والا
نہیں ہے فرق اتنا ہونے والا

یہاں ہوتا رہے گا اور سب کچھ
نہیں ہو گا تماشا ہونے والا

معزز ہو کے جب بھی بیٹھتا ہوں
تبھی ہوتا ہوں رُسوا ہونے والا

بہت کوشش بھی کر دیکھی ہے، لیکن
نہیں اپنا گزارہ ہونے والا

بھلا ہونے سے رُکتا اور کب تک
اگر اب بھی نہ ہوتا ہونے والا

فلک پہ لہر سی رکھتا ہے روشن
سمندر میں ستارہ ہونے والا

نظر آنے لگا ہے صاف اب تو
کوئی نقصان اپنا ہونے والا

گلی میں پھیلتا جاتا ہے، دیکھو
ہمارے گھر میں جھگڑا ہونے والا

ظفر، مُنہ سے کوئی کہتا نہیں ہے
سمجھتے ہیں کہ ہے کیا ہونے والا

☆

کوئی صورت نکلتی کیوں نہیں ہے
یہاں حالت بدلتی کیوں نہیں ہے

ہمارا امتحاں ہے اور کتنا
گھڑی سر سے یہ ٹلتی کیوں نہیں ہے

یہ سمجھا کیوں نہیں ہے اُن کا سورج
ہماری شمع جلتی کیوں نہیں ہے

ہوا رہتی ہے کیوں اپنے مخالف
ہمارے ساتھ چلتی کیوں نہیں ہے

اگر ہم جھیل ہی بیٹھے ہیں اس کو
تو پھر یہ رات ڈھلتی کیوں نہیں ہے

کوئی شے واقعی موجود ہے تو
مری تہ سے اُچھلتی کیوں نہیں ہے

محبت سر کو چڑھ جاتی ہے اکثر
مرے دل میں مچلتی کیوں نہیں ہے

تماشا بھی تر و تازہ ہے، لیکن
طبیعت بھی بہلتی کیوں نہیں ہے

ظفر، جب پھولتی بھی ہے زیادہ
تو اپنی شاخ پھلتی کیوں نہیں ہے

☆

طبعِ رواں کو لوگوں کی اپنی راہوں پر ڈال دیا
یوں تصویرِ سخن سے میں نے اپنا آپ نکال دیا

اندر کی گرمی ویسے تو بہت زوروں پر تھی، لیکن
بیت کیا تو اُس نے بھی بس لہو کو ایک اُبال دیا

الگ الگ ہم ان دونوں کی خیر مانگتے رہتے ہیں
گھر دینے کے ساتھ ہی اُس نے ایک ہمیں بھونچال دیا

ہمیں ہی چپ سی لگی رہی، ورنہ تو اُس کی محفل میں
کسی نے اپنی کتھا سُنائی، کسی نے اپنا حال دیا

موسم کو تبدیل کر دیا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہیں
باتوں ہی باتوں میں اُس نے اک پودا سا پال دیا

ہوتی کوئی توجہ پہلے تو کچھ کر بھی سکتے ہم
اب کیا کہتے ہو جب اُس نے اک سانچے میں ڈھال دیا

اپنا اپنا طور ہے، اور، طبیعت ہے اپنی اپنی
ہم نے رو کر عرض گزاری، اُس نے ہنس کر ٹال دیا

ادلے کا بدلہ کر کے بھی ہم سارے گھاٹے میں رہے
ہم نے اُس کو خواب دیے تھے، اُس نے ہمیں خیال دیا

میں پانی سا بہتا پھرتا تھا پانی کے ساتھ، ظفر
کوئی بہت منہ زور لہر تھی جس نے مجھے اُچھال دیا

☆

رکتا نہیں وقت ہمارا بھی
چلتا ہے کام تمھارا بھی

دیتے ہیں دہائی بھی ہر دم
کرتے بیٹھے ہیں گزارہ بھی

اس راہ کی خاک بھی اپنی ہے
اور ساتھ رہے گا ستارہ بھی

خس خانہ بھی ہے بھرا پُرا
ہے نامعلوم شرارہ بھی

ایمان ہے اپنی مجبوری
وہ کفر تھا ہم کو پیارا بھی

ڈرنا اُس وقت سے، جس لمحے
تنگ آ جائے گا بیچارہ بھی

کرتے ہو کاروبار اپنا
ہم پر رکھتے ہو اجارہ بھی

یہ پہلی بار سہی، لیکن
گزریں گے یہاں سے دوبارہ بھی

اب کیا کرنے والے ہیں، ظفر
دیتے نہیں کوئی اشارہ بھی

☆

دیکھتے ہی رہیے، باہر سے کیسے ہیں
شکلیں کیسی ہیں، اندر سے کیسے ہیں

آپ کے چشمۂ شفقت پر یہ پیاسے لوگ
بوند بوند کی خاطر ترسے کیسے ہیں

جاتے ہیں کس آئینہ خانے کی طرف
سب کے ہاتھوں میں پتھر سے کیسے ہیں

سب کمزور ہوئے جاتے ہیں طاقتور
اب کی بار دلوں میں ڈر سے کیسے ہیں

منزل ہے درپیش نئی کیا خلقت کو
اور، سروں پر رختِ سفر سے کیسے ہیں

پیچھے چلنے پر کر لیتے ہیں مجبور
اُن کے ہاتھوں میں یہ ہنر سے کیسے ہیں

رکنا ہے یا اندر داخل ہونا ہے
دیواریں سی کیا ہیں، در سے کیسے ہیں

مایوسی میں یہ اُمید سی ہے کیسی
تپتے صحرا میں یہ شجر سے کیسے ہیں

دل میں سارا کھوٹ بھرا ہے پُورم پُور
آپ، ظفر صاحب، اُوپر سے کیسے ہیں

☆

کہہ دیں گے ہو کر مجبور
ہر قانون ہے نامنظور

آپ کے جی میں جب آئی
جھاڑ دیا شاخوں سے بُور

پھٹ سکتے ہیں بم کی طرح
رَہا کرو ہم سے کُچھ دُور

ہم نشتر بن گئے تمام
جب سے آپ ہُوئے ناسُور

آپ کی گردن مارنی ہے
یہی ہے بس اپنا منشور

کرتا ہو گا ظاہر بھی
جو کُچھ رکھتے ہو مستور

اِک دن پکڑے جاؤ گے
رہتے ہو کب تک مفرُور

روڑا پتھر سب کُچھ ہے
خالی ہاتھ نہیں مزدُور

شیشے کی یہ شام ، ظفرؔ
اِک دن ہو گی چکنا چُور

☆

دھوپ ہی دھوپ ہے پھیلی ہوئی ، سایا کم ہے
ابر موجود ہے ، لیکن ، ابھی چھایا کم ہے

دُوسروں کی جنھیں کرنا تھی کفالت داری
بوجھ اُنھوں نے یہاں اپنا بھی اُٹھایا کم ہے

آئے دن کیوں نہ ہو شورش کی شکایت پیدا
یہاں سردار زیادہ ہیں ، رعایا کم ہے

ابھی کس طرح زیادہ ہو مری بات میں لُطف
جھوٹ کو سچ میں ابھی مَیں نے مِلایا کم ہے

خود غرض مَیں بھی کوئی کم تو نہیں ہُوں کہ یہاں
خواب جو دیکھ چُکا ہُوں وہ دِکھایا کم ہے

جُستجو ہی کوئی ایسی تھی کہ جس میں اب تک
مَیں نے کھویا ہے بہُت کُچھ ، ابھی پایا کم ہے

موت کے بعد کی مُدّت بھی مِلا دے اِس میں
زندگی میرے لیے میرے خُدایا کم ہے

اب کہیں جا کے کُچھ احساس ہُوا ہے کہ یہ عُمر
خرچ کر دی ہے بہُت ، اور ، بچایا کم ہے

ایسے لگتا ہے کہ اِس آئنہ خانے میں ، ظفرؔ
مَیں نے توڑا ہی زیادہ ہے ، بنایا کم ہے

☆

ظفر، نے کی جگہ فریاد کو تبدیل کرنا ہے
عمارت کو نہیں، بنیاد کو تبدیل کرنا ہے

توجہ اپنی اہلِ آسماں پر بعد میں ہو گی
کہ پہلے میں نے آدم زاد کو تبدیل کرنا ہے

بغیر اس کے بدل سکتا ہے کب یہ ناروا موسم
کسی صورت اس ابر و باد کو تبدیل کرنا ہے

تسلی ہو نہیں پاتی ہے اس کی شادمانی سے
اسی خاطر دلِ ناشاد کو تبدیل کرنا ہے

جو کرنا ہے تو اوروں کے بجائے آپ ہی ہم نے
اس اپنی حالتِ برباد کو تبدیل کرنا ہے

مزاجِ بلبل و گل ہی بدل دینا نہیں ہم کو
تو خالی کس لیے صیاد کو تبدیل کرنا ہے

ہمیں ترمیم ہے مطلوب اپنے شوق میں کوئی
کہ جس کے بعد اُس کی یاد کو تبدیل کرنا ہے

تو کرنی ہو گی بات اب اور ہی انداز میں اُس سے
جو ہم نے ہجر کی میعاد کو تبدیل کرنا ہے

کب اس نظمِ نیاز و ناز کا دھیان آئے گا آخر
کب اس مجموعۂ اضداد کو تبدیل کرنا ہے

☆

اب کیا نہیں، گزرتی ہے گزران کس طرح
مشکل ہماری ہوتی ہے آسان کس طرح

سچ ہے کہ آسمان کو ہے اس کی کیا خبر
رہتے ہیں اس زمین پہ انسان کس طرح

پہلے ہی دن بچی نہیں اس گھر میں کوئی چیز
بھگتاؤں گا میں روز یہ مہمان کس طرح

کچھ ہم ہی جانتے ہیں کہ اس حال میں بھی ہم
اُس کے اُتارتے رہے احسان کس طرح

باہر کی سمت کھلتے ہیں کیوں کر گل و سمن
اندر کو پھیلتے ہیں بیابان کس طرح

کس وسوسے میں شام کو رُکتا ہے اور دل
ہوتی ہے طبع اور پریشان کس طرح

اک خواب میں گزار تو دی ہے تمام عمر
پورا، مگر، کروں گا یہ نقصان کس طرح

اُس پر تو کچھ اثر نہیں اس انقلاب کا
میں رہ گیا ہوں دیکھ کے حیران کس طرح

ہم تو چلے ہی جائیں گے پیدل بھی، اے ظفر
ہے مسئلہ کہ جائے گا سامان کس طرح

☆

کھویا ہے کہاں زمانہ اپنا
ملتا ہی نہیں خزانہ اپنا

دشوار گزار راستوں پہ
یہ قافلہ روانہ اپنا

کچھ اور حقیقتیں بھی ہیں ساتھ
اتنا ہی نہیں فسانہ اپنا

ہم کس کو قصور وار ٹھہرائیں
پیٹھ اپنی ہے ، تازیانہ اپنا

اس رنگ برنگ سرزمیں پہ
دام اپنا ہے ، اور ، دانہ اپنا

دنیا کے اندھیروں آندھیوں میں
روشن رہا خواب خانہ اپنا

اب زد پہ وہ آئے یا نہ آئے
پھر چوک گیا نشانہ اپنا

ہم اس کو ٹھہر کے بھی دکھاتے
ہوتا جو کہیں ٹھکانہ اپنا

سنتا کوئی دوسرا ، ظفر ، کیوں
تھا اپنے لیے ترانہ اپنا

-☆-

خاص کوئی نہیں ، عام کوئی نہیں
ہاتھ موجود ہیں ، کام کوئی نہیں

دھوپ ہی دھوپ رہتی ہے سر پر رواں
رات منسوخ ہے ، شام کوئی نہیں

صرف کوتاہیوں پر سزا ہے یہاں
کارناموں پہ انعام کوئی نہیں

یہ عمارت کھڑی ہے بڑی شان سے
لیکن اس میں در و بام کوئی نہیں

سحر سا ایک چھایا ہوا دیکھیے
سب گرفتار ہیں ، دام کوئی نہیں

داستاں چل رہی ہے بیاں در بیاں
جس کا آغاز و انجام کوئی نہیں

واقعات اک تسلسل میں ہوتے ہیں اب
کرنے والے تو ہیں ، نام کوئی نہیں

کوئی بھی دن گزرتا نہیں خیر سے
جس میں دشنام و الزام کوئی نہیں

شاعری بات ہے سامنے کی ، ظفر
اس میں وحی اور الہام کوئی نہیں

-☆-

لبوں پہ مُہر لگی ہے حکایتیں اب کیا
لڑائی ہے تو پھر اس میں رعایتیں اب کیا

لہو کی لُوٹ مچی ہے، کبھی تو لائے گی رنگ
زیانِ جاں ہے تو اس میں کفایتیں اب کیا

یہ عشق مقصدِ موہوم تو نہ تھا، اے دل
وہ ہم سے پُوچھنے آتے ہیں غایتیں اب کیا

نہیں مریضِ صداقت، مریضِ دل ہُوں فقط
گزر چکا ہُوں دوا سے، ہدایتیں اب کیا

بلا ہمیں تھے جو ہے یہ برائے دفعِ بلا
وہ پڑھ کے پھُونکتے رہتے ہیں آیتیں اب کیا

شکست و ریخت کی منزل میں کیا نہیں شب و روز
بچائیے گا یہاں پر روایتیں اب کیا

سروں پہ ٹوٹ پڑا ہے جو آسماں، تو جناب
گھروں سے ناپیے اس کی نہایتیں اب کیا

ہمارے واسطے جس نے کیا نہیں کچھ بھی
جتا رہا ہے وہ خالی حمایتیں اب کیا

حدِ حساب سے باہر ستم بھی ہیں جس کے
شمار کیجیے اُس کی عنایتیں اب کیا

جہاں خود آئے ہیں، لائے نہیں گئے ہیں، ظفر
کریں ہم اُن سے وہاں کی شکایتیں اب کیا

☆

وہ کانچ کانچ بدن چور چور کس کا تھا
سزا سنائیں گے کس کو، قصور کس کا تھا

اُڑی جو خاک وہ موسم کی موج تھی، لیکن
پسِ غبار اشارہ، حضور، کس کا تھا

وہ ہاتھ جس نے دوپٹے سروں سے نوچ لیے
جو ہو سکے تو بتانا ضرور، کس کا تھا

کہاں بچی گئی صیاد کی یہ سازش
دماغِ بلبل و گل میں فتور کس کا تھا

بیان دیتا رہا کون صلح جوئی کے
ارادہ اور ہی بین السطور کس کا تھا

دلوں کے وسط میں دیوار کھینچ دی کس نے
تمہی کہو، یہ نفاق و نفور کس کا تھا

ہم اپنی داد رسی چاہتے وہاں، کیا خوب
وہ بزم کس کی تھی، صدر الصدور کس کا تھا

اگر وہاں پہ تھی صبر آزمائی کی خواہش
تو پھر یہاں بھی دلِ ناصبور کس کا تھا

ہماری خاک پہ عکس اتنا تھا کس کا، ظفر
ہمارے خوں سے یہ غسلِ غرور کس کا تھا

☆

جو کارِ خاص مکرر دیا گیا ہے مجھے
مرے حدود سے بڑھ کر دیا گیا ہے مجھے

بجائے خوں مری رگ رگ میں بہی ہے اگر
تو کیوں یہ زہر برابر دیا گیا ہے مجھے

سمجھتا سوچتا خود بھی ہوں، یہ بھی یاد رہے
دماغ رکھتا ہوں میں، سر دیا گیا ہے مجھے

غلط ہے، اور میں اسے مسترد بھی کرتا ہوں
یہی کہ میرا مقدر دیا گیا ہے مجھے

یہ درسِ امن و اماں کیا ہے، خوب جانتا ہوں
کہ یہ فریب تو اکثر دیا گیا ہے مجھے

بہت ہے اس خس و خاشاکِ زرگری کے لیے
وہ شعلہ جو مرے اندر دیا گیا ہے مجھے

جو پیش گوئی کروں گا، درست نکلے گی
جبھی مقامِ پیمبر دیا گیا ہے مجھے

کچھ اور ہے مرا اندازِ احتجاج، ظفر
اسے قبول نہیں، پر دیا گیا ہے مجھے

☆

دامانِ شب سے دستِ گدا کتنی دُور ہے
اے قصرِ شیشہ! سنگ سزا کتنی دُور ہے

اندازہ کوئی کر ہی نہیں پائے گا یہاں
کیا کیا زمیں ہے تخت، خدا کتنی دُور ہے

پھینکا ہے جس نے خرمنِ خاموش میں شرر
اُس کو خبر نہ تھی کہ ہوا کتنی دُور ہے

تعویذِ تازہ منزلِ دریاب ہے اگر
تعبیرِ خواب و خوفِ خطا کتنی دُور ہے

دیکھو کہ آشیاں ہیں سلامت کہاں کہاں
کیا پُوچھتے ہو برقِ بلا کتنی دُور ہے

قوسِ قزار تک ہے، سُنا، کس کی دسترس
ابرِ اماں یہاں سے، بتا، کتنی دُور ہے

جس آب و تاب لمحے کی ہے منتظر یہ خاک
اے ناخنانِ عقدہ کشا، کتنی دُور ہے

یہ فیصلوں کا وصل ہے یا فاصلوں کی فصل
کتنا قریب ہے کوئی، کیا کتنی دُور ہے

اُس شہر کا تو ذکر ہی کیا ہے ابھی، ظفر
یہ پُوچھیے کہ شہر نما کتنی دُور ہے

☆

الزام ایک یہ بھی اُٹھا لینا چاہیے
اس شہرِ بے اماں کو بچا لینا چاہیے

یہ زندگی کی آخری شب ہی نہ ہو کہیں
جو سو گئے ہیں اُن کو جگا لینا چاہیے

وہ کس طرف چلا ہے، لگائے کوئی سُراغ
میں کس طرف رواں ہوں، پتا لینا چاہیے

یعنی قمارِ عشق میں کیا کچھ ہے داؤ پر
اس رازِ واشگاف کو پا لینا چاہیے

کیسا ہے کون، یہ تو نظر آ سکے کہیں
پردہ یہ درمیاں سے ہٹا لینا چاہیے

دل پر جو یادگار رہے اُس کے مکر کی
ایسا بھی کوئی نقش بنا لینا چاہیے

اس طرح بھی چلا ہے کبھی کاروبارِ شوق
رُوٹھے کوئی تو اُس کو منا لینا چاہیے

کچھ نہ کیوں مطالبۂ وصل، اے ظفر
کی ہے وفا تو اُس کا صلہ لینا چاہیے

☆

ہے تو خوب صورت وہ ، پر ، ذرا کھٹی ہے
ہاتھ بھی لگانے پر جھاڑ ہے ، وڑتی ہے

زُلف کے اندھیرے میں ڈھونڈیے رُخِ زیبا
ہے ، مگر ، نکّی سی آرزو کی بتّی ہے

شرم بھی نہیں آتی چائے مانگتے دل کو
دُودھ ہے نہ ایندھن ہے، کھانڈ ہے نہ پتّی ہے

قوم کے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں یہ
ایک بھائی بھکو ہے ، ساتھ مائی پھتّی ہے

ہیں وہی بڑے پھر بھی ، پڑ میں جو ہے سب اُن کا
اپنے پاس اٹھی ہے ، اُن کے ہاتھ ستی ہے

اِک مثال رکھتا ہے اپنا رنگ مضروبی
ختم ہے یہ فن اُس پر ، اور ، ابھی کہتی ہے

درمیاں میں چلتی ہیں سینڈل اور صلواتیں
فرش پر سٹا ہے ، کھاٹ پر سٹی ہے

رحم یا تھکاوٹ سے آخرش تشدّد میں
فرق تو ہُوا پیدا ، گرچہ پاؤ رتّی ہے

ہاتھ دھو کے سو جائیں خیر سے ظفر صاحب
اِس دفعہ تو ٹیڑھی ہے کھیر ، اور ، مٹّی ہے

☆

شاعر ہوں ، کتاب بیچتا ہوں
ہاں نان کباب بیچتا ہوں!

بکھرے ہُوئے خواب بیچتا ہوں
اپنے ہیں ، جناب ، بیچتا ہوں

زخموں کے گُلاب بیچتا ہوں
کرتا ہوں حساب ، بیچتا ہوں

ہے کارِ ثواب ، بیچتا ہوں
مَیں مُفت شراب بیچتا ہوں

ترکیب شباب بیچتا ہوں
لفظوں کا خضاب بیچتا ہوں

کچھ نکالی ہے، کچھ سمیری ہے
کوئی تو شے کہیں بیڑی ہے

ہم نے ہر داستان کے اندر
اک نئی داستان چھیڑی ہے

ہوئیں غائب ہماری سب سمتیں
جو میسر ہے وہ بھی ٹیڑھی ہے

جو نکالی تھی اُس نے بال کی کھال
ہم نے وہ کھال بھی اُدھیڑی ہے

کام اپنا تمام کر دے گی
وہ تھپیڑا ہے یا تھپیڑی ہے

سخن آرائی اجنبی نہیں کچھ
ہم نے یہ بھی مشین گیڑی ہے

اس مصیبت کو اور کچھ نہ کہو
ہم نے یہ آپ ہی سہیڑی ہے

بیچ میں ہی بھٹک رہے ہیں کہیں
اپنی چوٹی ہے اور نہ ایڑی ہے

بات اب اور ہے کہ ہم نے، ظفر
اینٹ بنیاد کی اُکھیڑی ہے

☆

جو کچھ ہے، شتاب بیچتا ہوں
کیا مال خراب بیچتا ہوں

آب و تب و تاب بیچتا ہوں
جھوٹا ہوں، سراب بیچتا ہوں

گونگا ہوں خطاب بیچتا ہوں
بہرا ہوں، جواب بیچتا ہوں

چہروں کے نقاب بیچتا ہوں
بے حیل و حجاب بیچتا ہوں

آواز لگائی ہے ظفر نے
راوی و چناب بیچتا ہوں

☆

ہزار حُسن کے صُورت کدوں میں رہتا ہُوں
ڈرا ہُوا ہُوں، مَیں اپنی حدوں میں رہتا ہُوں

یہ مَیں کہ نعرۂ مستانہ تھا شعار مرا
صدا کے سہمے ہُوئے گنبدوں میں رہتا ہُوں

نئی پُرانی یہاں دفن ہیں سبھی قدریں
مَیں صبح و شام انہی مرقدوں میں رہتا ہُوں

بھرم اسی لیے قائم ہے میرے قامت کا
جہاں بھی رہتا ہُوں کوتہ قدوں میں رہتا ہُوں

ملا ہُوا ہُوں مَیں در پردہ دلبروں سے، مگر
بظاہر اشک فشاں دل زدوں میں رہتا ہُوں

کبھی چڑھے گا خزاں خواہشوں کا رنگ ظفر
مَیں نیک ہی سہی، آخر بدوں میں رہتا ہُوں

☆

مدّتیں گُزریں پر اب بھی وہی عالم ہے یہاں
تُم تو کہتے تھے کہ ہر زخم کا مرہم ہے یہاں

سحر و شام پہ وہ مُہر لگی ہے کہ نہ پُوچھ
وہی بے مہر ہوا ہے وہی موسم ہے یہاں

اب بھی ہے لوحِ جبیں حرفِ تمنا کی امیں
دیکھنے والوں کو فرصت ہی بہُت کم ہے یہاں

اُن کو آتا ہی نہیں اپنی وفاؤں کا یقیں
ہم ہیں اور کب سے اسی بات کا ماتم ہے یہاں

ہم ہی اُمّید کے گُلزار کھلانے والے
اپنی ہی ذات ملامت کشِ عالم ہے یہاں

☆

ہزار حُسن کے صورت کدوں میں رہتا ہوں
ڈرا ہُوا ہوں، مَیں اپنی حدوں میں رہتا ہوں

یہ مَیں کہ نعرۂ مستانہ تھا شعار مرا
صدا کے سہمے ہوئے گنبدوں میں رہتا ہوں

نئی پُرانی یہاں دفن ہیں کبھی قدریں
مَیں صبح و شام انہی مرقدوں میں رہتا ہوں

بھرم اسی لیے قائم ہے میرے قامت کا
جہاں بھی رہتا ہوں کوتہ قدوں میں رہتا ہوں

ملا ہُوا ہوں مَیں در پردہ دلبروں سے، مگر
بظاہر اشک فشاں دل زدوں میں رہتا ہوں

کبھی چڑھے گا خزاں خواہشوں کا رنگ ظفر
مَیں نیک ہی سہی، آخر بدوں میں رہتا ہوں

☆

مدّتیں گزریں پر اب بھی وہی عالم ہے یہاں
تُم تو کہتے تھے کہ ہر زخم کا مرہم ہے یہاں

سَحَر و شام پہ وہ مُہر لگی ہے کہ نہ پُوچھ
وہی بے مہر ہوا ہے وہی موسم ہے یہاں

اب بھی ہے لوحِ جبیں حرفِ تمنّا کی امیں
دیکھنے والوں کو فرصت ہی بہُت کم ہے یہاں

اُن کو آتا ہی نہیں اپنی وفاؤں کا یقیں
ہم ہیں اور کب سے اسی بات کا ماتم ہے یہاں

ہم ہی اُمّید کے گُل زار کھلانے والے
اپنی ہی ذات ملامت کشِ عالم ہے یہاں

☆

سینوں میں موج خیز ہیں ارماں نئے نئے
ہم ہیں تو آئیں گے ابھی طوفاں نئے نئے

پلکوں پہ جم رہی ہے جلے جنگلوں کی راکھ
آنکھوں میں کھل رہے ہیں خیاباں نئے نئے

جب بھی گئے ہیں چارۂ غم کے لیے وہاں
دامن میں بھر کے لائے ہیں پیکاں نئے نئے

مانگے ہوئے چراغ کی مرتی ہوئی سی لو
ہوتے ہیں اہلِ شام پہ احساں نئے نئے

صبحِ وصال ہی سے یہ عالم ہے اے ظفرؔ
سمجھو نہ ہم کو سوختہ ساماں نئے نئے

-☆☆-

اُٹھ، اور پھر سے روانہ ہو، ڈر زیادہ نہیں
بہت کٹھن سہی منزل، سفر زیادہ نہیں

بیاں میں اپنے صداقت کی ہے کمی، ورنہ
یہ راز کیا ہے کہ اُس پر اثر زیادہ نہیں

مجھے خراب کیا اُس نے، ہاں کیا ہو گا
اُسی سے پوچھیے، مجھ کو خبر زیادہ نہیں

سنا ہے وہ مرے بارے میں سوچتا ہے بہت
خبر تو ہے ہی، مگر معتبر زیادہ نہیں

یہ جستجو تو رہے، کون ہے، وہ کیسا ہے
سراغ کچھ تو ملے گا، اگر زیادہ نہیں

ابھی روانہ ہوں یکسوئی سے میں دشت بہ دشت
کہ رہگزارِ سفر میں شجر زیادہ نہیں

جبھی تو خارِ دلِ دوستاں نہیں ہوں ابھی
کہ عیب مجھ میں بہت ہیں، ہنر زیادہ نہیں

دنوں کی بات ہے اب کیمیا گری اپنی
کہ رہ گئی ہے ذرا سی کسر، زیادہ نہیں

ظفرؔ، ہم آپ کو گمراہ تو نہیں کہتے
یہی کہ ہیں بھی اگر راہ پر، زیادہ نہیں

-☆-

تیرے ہی راستے سہی ، دل سے گزور گزور تو جا
منظرِ آرزو بھی دیکھ ، رُک تو سہی ، ٹھہر تو جا

ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ خوفِ خدا بھی چاہیے
اتنی سی بات بھی قبول تجھ کو نہیں اگر ، تو جا

تیرے ہی خیر خواہ کیوں کرنے لگے تجھے ذلیل
اُن سے یہ پُوچھ تو سہی ، اُٹھ کے ذرا اُدھر تو جا

اِس دلِ خستہ خواب کی اب تو فضا ہی اور ہے
دیر کے خانماں خراب ، تُو بھی اپنے گھر تو جا

وعدۂ وصل تھا کوئی ، بھول گیا کہ یاد ہے
کچھ تو جواب دے مجھے اور نہیں اگر ، تو جا

☆

ہو لیے یکسُو بہت ، اب تو بکھرنا رہ گیا
جی چکے دل کھول کر ، گھٹ گھٹ کے مرنا رہ گیا

اور تو انداز سب اُس نے بدل ڈالے ، مگر
ایک پہلے کی طرح کہہ کر مُکرنا رہ گیا

چاہتے بھی تھے اُسے ، ڈرتے بھی تھے اُس سے ، مگر
اب تو یُوں لگتا ہے جیسے صرف ڈرنا رہ گیا

اس کو ناکامی کہوں یا کامیابی ، کیا کہوں
اور تو سب کچھ ہُوا ، دل میں اُترنا رہ گیا

جانتا ہُوں اب وہاں پہ منتظر کوئی نہیں
روز کا اُس راہ سے ، لیکن ، گزرنا رہ گیا

کارفرمائی کی اُس نے انتہا کر دی ، ظفر
پھر بھی یُوں ہے جیسے کوئی کام کرنا رہ گیا

☆

یہ بات الگ ہے مرا قاتل بھی وُہی تھا
اس شہر میں تعریف کے قابل بھی وُہی تھا

آساں تھا بہُت اُس کے لیے حرفِ مُروّت
اور ، مرحلہ اپنے لیے مُشکل بھی وُہی تھا

تعبیر تھی اپنی بھی وُہی خوابِ سفر کی
افسانۂ محرومیِ منزل بھی وُہی تھا

اک ہاتھ میں تلوار تھی ، اک ہاتھ میں کشکول
ظالم تو وہ تھا ہی ، مرا سائل بھی وُہی تھا

ہم آپ کے اپنے ہیں ، وہ کہتا رہا مُجھ سے
آخر صفِ اغیار میں شامل بھی وُہی تھا

مَیں لوٹ کے آیا تو گُلستانِ ہوس میں
تھا گُل بھی وُہی ، شورِ عنادل بھی وُہی تھا

دعوے تھے ، ظفر ، اس کو بہُت باخبری کے
دیکھا تو مرے حال سے غافل بھی وُہی تھا

☆

پردہ یہ مصلحت کا ہٹا کیوں نہ دیجیے
جو اصل بات ہے وہ بتا کیوں نہ دیجیے

میرا حساب کھول دیا اس لیے کہ یہ
مُجرم نہیں تو اس کو سزا کیوں نہ دیجیے

مَیں خواب ہوں تو کیجیے گا پارہ پارہ کب
مَیں خاک ہوں تو مُجھ کو اُڑا کیوں نہ دیجیے

ملنا نہیں تو بات بھی کرنا ہے کیا ضرور
اب یہ تکلّفات اُٹھا کیوں نہ دیجیے

ڈرنا ہی تھا ، جناب ، تو مرنے چلے تھے کیوں
اس کا جواب کیوں نہ دیا ، کیوں نہ دیجیے

اب شعر و شاعری کا زمانہ نہیں ، ظفر
کہیے تو یہ دُکان بڑھا کیوں نہ دیجیے

☆

دلائل اُن کے اپنے ہیں نہ حُجت اُن کی اپنی ہے
فقط اک سوءِ ظن رکھنے کی عادت اُن کی اپنی ہے

ہمارا کیا تعلق تھا جو یوں رُسوا کیا ہم کو
کہ جھگڑے اُن کے اپنے ہیں، سیاست اُن کی اپنی ہے

اُچھالا ہے اُنھوں نے اتنی بے دردی سے خود جس کو
ہم اب تک یہ سمجھتے تھے کہ عزت اُن کی اپنی ہے

ہمیں ناپیں نہ وہ پیمانۂ اخلاص سے اپنے
ہمیں معلوم ہے جیسی کہ حالت اُن کی اپنی ہے

وہ آخر نیتوں کا حال بھی تو جانتے ہوں گے
ہماری بے زبانی پر وضاحت اُن کی اپنی ہے

ظفرؔ اقبال کو اقبال ہے جرمِ صداقت سے
سُناتے ہیں سزا کتنی، یہ ہمت اُن کی اپنی ہے

☆

شامِ وحشت میں کہیں سنگِ صدا آیا تو ہے
شکر کر، اے خوابِ دل، یہ مرحلہ آیا تو ہے

رُت بدلنے کے نظر آتے تو ہیں آثار کچھ
بازوؤں میں زور، دل میں حوصلہ آیا تو ہے

جھنڈیاں بھی منتظر، بینر بھی تھے سب فرشِ راہ
دیر سے آیا سہی، وہ بے حیا آیا تو ہے

☆

واپس لہو کی اپنے شفق مانگتے ہیں لوگ
اپنا ہی مانگتے ہیں جو حق مانگتے ہیں لوگ

سالم تو زندگی کہیں دیکھی سُنی نہیں
مرتے ہیں ، زندگی کی رمق مانگتے ہیں لوگ

اس خامشی میں سنگ سماعت کہیں سے آئے
یہ دل ہی توڑیے کہ کھنک مانگتے ہیں لوگ

گھر مانگتے ہیں کوئی ، مگر ، جیل کے سوا
پولیس کے بغیر سڑک مانگتے ہیں لوگ

اظہار آرزو کی چمک چاہیے انھیں
گلزار گفتگو کی مہک مانگتے ہیں لوگ

دالان و دل میں چاہتے ہیں دھوپ اور ہوا
دیوار و در پہ ایک دمک مانگتے ہیں لوگ

تھوڑی سی اس زمین پہ رم جھم کا ہے سوال
چھوٹی سی آسماں پہ دھنک مانگتے ہیں لوگ

زخموں پہ ان کے چھڑکا گیا ہے جو آج تک
کیا ہے جو اپنا حق نمک مانگتے ہیں لوگ

ناداں ہیں ، چھین سکتے ہیں بڑھ کر جو شے ، ظفر
بے جا سحر سے شام تک مانگتے ہیں لوگ

☆

پھر زندگی کے نام پہ مروا دیا گیا
جو ہارتے نہ تھے اُنھیں ہروا دیا گیا

آنکھوں میں خوں بھی اُترا ہُوا دیکھتے ، اگر
چہروں پہ رنگ زرد بکھروا دیا گیا

جس سے چمک حیا کی تھی پتھر کی آنکھ میں
وہ ماندہ پیرہن بھی اُتروا دیا گیا

منزل تو خود ہماری طرف تھی رواں ، ہمیں
جیسے بھی راستوں سے گُزروا دیا گیا

قیمت بجا تھی اُن کی بقول اُن کے ، پر ، ظفر
کرنا نہ تھا جو کام وہ کروا دیا گیا

☆

روٹی کپڑا بھی دے ، مکان بھی دے
اور ، مجھے جان کی امان بھی دے

مجلس آرائی کا صِلہ ہی نہیں
داد و تحسین کا لگان بھی دے

اور ساری سہولتیں بھی بجا
سر برہنہ ہُوں ، آسمان بھی دے

زہر کیسا ہے ، مَیں بتا بھی سکوں
ذائقہ تو دیا ، زبان بھی دے

طوقِ لعنت بدلتا رہتا ہے
اب کوئی مُستقل نشان بھی دے

سبز پوشی ہی پھب رہی ہے بہت
اب ضروری نہیں اذان بھی دے

شعر کوئی ، ظفر ، نہیں کافی
یعنی اخبار میں بیان بھی دے

☆

اگرچہ منع بھی کرتا نہیں مُروّت میں
بلائے رکھتا ہے انکار بھی اجازت میں

سُنی نہ اُس نے ہماری ، کھُلا تھا دفترِ حُسن
اگرچہ دل اُسے دے بھی چکے تھے رشوت میں

اُسے تو آج بھی جلدی ہے ظلم ڈھانے کی
یہ مَیں ہُوں اب بھی جسے عذر ہے شکایت میں

یہی سیاست دل ہے تو دیکھنا اِک دن
بیان دیجیے گا اپنی ہی مذمت میں

اس آئنے پہ نہیں عکسِ آرزو کا طلسم
ابھی تو دل ہے کسی اور ہی مُصیبت میں

یہ شہر خاک بسر کیوں ہے ، اور ، کب سے ہے
کبھی نکل کے ذرا دیکھ شامِ فُرصت میں

مرے حواس پہ چھایا ہُوا ہے ابر سا کیوں
ترا وُجود اگر وہم ہے حقیقت میں

اب اُس کی سوچ کے ساحل سے آلگا ہُوں ، ظفر
کہ ایک عُمر رہا ہُوں بھنور کی صُحبت میں

☆

غم بھی قُربانی ہے ، آزار بھی قُربانی ہے
زخمِ پابندیِ اظہار بھی قُربانی ہے

یعنی تنسیخِ سخن میں بھی ہے ایثار کا رنگ
ضبطیِ دولتِ دیدار بھی قُربانی ہے

دُور تر ہی سہی شائستۂ منزل ہونا
سفرِ وادیِ دُشوار بھی قُربانی ہے

نغمۂ جاں سوز ہے پابندِ سلاسل ہونا
اور ، یہ بندشِ بازار بھی قُربانی ہے

جبر نے جیت کے معنی ہی بدل ڈالے ہیں
ہار کہتے ہیں تو یہ ہار بھی قُربانی ہے

آج اس پستیِ پندار کی بدرنگی میں
رنگِ مضبوطیِ کردار بھی قُربانی ہے

حق تو یہ ہے کہ اس ایوانِ خوشامد میں یہاں
ایک آوازۂ انکار بھی قُربانی ہے

رائیگاں ہی سہی ، اس عہدِ زیاں میں ، اے دوست
یہ مری جرأتِ گفتار بھی قُربانی ہے

خونِ دل کا ، ظفر ، اُس شوخ کو دیتا ہوں خراج
کوئی سمجھے تو مرا پیار بھی قُربانی ہے

-☆-

خلافِ قاعدہ اب کے دلوں کا مس کیا تھا
غلط سہی ، مگر ، اُس میں کسی کا بس کیا تھا

اُڑا کے لے گئی سب ضابطے وہ موجِ ہوس
ہوائے تُند کے آگے یہ خار و خس کیا تھا

وفائے وعدہ نہیں اُس کی دسترس میں اگر
تو پُوچھنا کہ وہ دعوائے دسترس کیا تھا

کھُلا تو دیر میں جا کر کھُلا یہ نکتۂ راز
کہ اصل دُشمنِ جاں تھا وہ ہم نفس کیا تھا

جہانِ جبر میں تھا اُس کا جبر کیوں شامل
ظفر ، قفس میں وہ ایک اور ہی قفس کیا تھا

-☆-

غریبِ شہر ہوں ، سڑکوں پہ ہے سفر میرا
ہوا کی طرح کوئی گھاٹ ہے نہ گھر میرا

ہیں میری گھات میں کب سے کرایے کے قاتل
سُراغ رکھتا ہے کُچھ تو وہ بے خبر میرا

مَیں اصل چہرہ دکھاتا ہوں اُس کا دُنیا کو
قصُور کوئی اگر ہے تو اس قدر میرا

ضمیر بیچ دیا جانِ ناتواں کے عوض
کبھی سُنو تو فسانہ ہے مختصر میرا

مَیں اُس کے جھوٹ کو جاری کروں گا بیچ کی سند
کہ رات دن یہی ٹھہرا ہے اب ہُنر میرا

وہ نوکِ تیغ پہ رکھ لائے تھے ، ظفر ، دستار
قبُول کر کے ہی آخر بچا ہے سر میرا

-☆-

مچلی ہے جہاں زُلفِ خیالات کی خُوش بُو
پھیلے گی کبھی عطرِ مُلاقات کی خُوش بُو

دو چار برس اور ابھی آشفتہ سروں کو
ناساز ہے پیراہنِ حالات کی خُوش بُو

کھولے گی صبا خُود ہی درِ نافۂ فردا
اور ، ہو گی رواں دورِ مُساوات کی خُوش بُو

ہے حاصلِ حیرت کدۂ عنبرِ امروز
چُپ چاپ گُزرتے ہُوئے لمحات کی خُوش بُو

مَیں آہ کے جھونکے سے کِھلا ہُوں سرِ صحرا
ہے چاروں طرف ایک مری ذات کی خُوش بُو

-☆-

نگار و نقشِ گلستاں تو کیا بکھارو گے
رُخِ بہار سے یہ رنگ بھی اُتارو گے

یہ لوگ، پانو کی ٹھوکر بنا رہے ہو جنھیں
اِنھی کے سامنے کل جھولیاں پسارو گے

جہاں جہاں بھی بچھاؤ گے موت کے کانٹے
وہاں وہاں خلشِ زندگی اُبھارو گے

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہی کھٹک رہے ہیں تُمھیں
ہمیں بھی کوئی بُرا نام دے کے مارو گے

بنی رہے گی تُمھاری بھی جان پر شب بھر
یہ رات تُم بھی بڑے قہر کی گزارو گے

-☆-

قدر قائم رہی معیار بدل دینے سے
سر بدلتے نہیں دستار بدل دینے سے

بَس کو دیتے ہیں اسیروں کی رہائی کا فریب
آپ زنجیر کی جھنکار بدل دینے سے

اصل اِس کھیل کی ظاہر ہے بھری دُنیا پر
فرق پڑتا نہیں کردار بدل دینے سے

بات گفتار سے پیکار تک آ پہنچی ہے
یعنی بدلیں گے یہ آثار، بدل دینے سے

سادگی دیکھیے، وہ اب بھی سمجھتے ہیں، ظفر
وقت رُک جائے گا رفتار بدل دینے سے

-☆-

یہ رات، یہ گھن گرج، یہ برسات
دیکھو مری صبح کے نشانات

ہونٹوں پہ بھی آئیں گے کسی دن
آنکھوں میں چھپے ہوئے سوالات

اِک شعلے کی راہ دیکھتے ہیں
یہ شام، یہ خواب، یہ خیالات

ہر دن ہے تری اُمید کا دن
ہر رات ہے تیرے ہجر کی رات

کس دن یہ سفر تمام ہو گا
کب ہو گی مری تری ملاقات

☆

بدلے ہوئے موسم کی فضا سب کے لیے ہے
یہ ابر، یہ گلشن، یہ ہوا سب کے لیے ہے

گم گشتہ خزینے کا پتا سب کے لیے ہے
ہمت ہو تو دروازہ کھلا سب کے لیے ہے

رہ جائے نہ پیچھے کوئی اثنائے سفر میں
اب جرمِ تساہل کی سزا سب کے لیے ہے

فرعون جہاں پر بھی ہیں، جیسے بھی ہیں، جو بھی
یہ خوب سمجھ لیں کہ عصا سب کے لیے ہے

بالائے محبت نہیں عشاق میں کوئی
پابندیِ آئینِ وفا سب کے لیے ہے

سب مستحقِ جلوۂ جاناں ہیں برابر
بیماریِ ہجراں کی دوا سب کے لیے ہے

مشترکہ ہے میراثِ محبت، ظفر، اب کے
اُس حُسن کی ایک ایک ادا سب کے لیے ہے

☆

پھاڑ پھینکی مری تحریرِ شکایت اُس نے
اِس میں بھی دیکھیے ، کی کتنی رعایت اُس نے

ظلم کرتا ہے تو جی جان پہ بہ جا یہ بھی
مہربانی بھی کبھی کی تھی نہایت اُس نے

سرِ اجلاس ہُوا میرا قضیّہ فیصل
سامنے سب کے سُنی دل کی حکایت اُس نے

اجتہاد اُتنا ہی مضمونِ محبت میں ہُوا
توڑ دی پاس بٹھانے کی روایت اُس نے

حاکمِ شہر نے انصاف کیا میرا بھی
کی بہُت اہلِ محلّہ کی حمایت اُس نے

اِس مہارت سے کیا تھا کہ مَیں خود حیراں ہُوں
خُون میں خواب کے مانند سرایت اُس نے

وہ بھی دل شاد ہیں ، دیکھو تو سہی اُس کا فریب
جن پہ ڈالا ہی نہیں عکسِ عنایت اُس نے

☆

جواب دیجیے اُس کو اگر تو کیا کہہ کر
جو ہم سے جان چھُڑواتا ہے بے وفا کہہ کر

کہاں سے ڈھونڈیے ، کیوں کر منایئے اُس کو
کہ وہ تو جا بھی چکا ہے بُرا بھلا کہہ کر

ہزار شکوے تھے اُس یارِ بدگماں سے ، مگر
کوئی تو سامنے اُس کے بھی دیکھتا کہہ کر

کھُلے گا اُس کی مسیحائی کا بھرم تُجھ تو
وہ زہر دے تو سہی خلق کو دوا کہہ کر

لباس اور ، بدن اور ہے ، مگر ، ہے وہی
پُکارتے ہو اُسے یُونہی دُوسرا کہہ کر

اُسی کی گرد میں گُم ہے زرِ عیارِ ہنر
جو خاک ہم نے اُڑائی تھی کیمیا کہہ کر

وُہ کیوں خفا ہے ، ظفرؔ ، مَیں تو پُوچھتا ہی رہا
پہ ، ایک لفظ بھی اُس نے نہیں دیا کہہ کر

☆

کرتے ہیں اپنے ترکِ تمنا کا اعتبار
دُنیا میں ہیں تو کیوں نہ ہو دُنیا کا اعتبار

ہم تو شریف آدمی تھے، ہم سے پُوچھتے
کرتا نہ تھا اگر دلِ رُسوا کا اعتبار

چُپ رہ کے اُس سے مُنصفی چاہیں گے ہم، کہ اب
باقی نہیں رہا لبِ گویا کا اعتبار

دل پر یہ لوگ بند نہیں باندھتے کبھی
کرتے ہیں آنکھ میچ کے دریا کا اعتبار

شک نے کیا شکار ہمیں، ورنہ آج تک
تھا سب کو اپنی ہستیِ یکتا کا اعتبار

بیمار ہوں گے سوچ سمجھ کر ہی اب، ظفر
اچھا ہے، اُٹھ گیا ہے مسیحا کا اعتبار

-☆-

سحر ہوئی ہے، سفینے خطر سے نکلے ہیں
ہزار خواب سفر بام و در سے نکلے ہیں

دل اُس کے دام میں اُلجھا تو چھپ گئے اخبار
کئی فسانے ذرا سی خبر سے نکلے ہیں

بھلا نہ وہ تو کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے ہم
یہ شرط باندھ کے اِس بار گھر سے نکلے ہیں

طلسمِ تازہ کوئی منتظر نہ ہو اپنا
کئی دنوں میں تو اُس کے اثر سے نکلے ہیں

جواب دے کے سُبک دوش وُہ ہُوا خود بھی
بہت قصُور ہمارے بھی سر سے نکلے ہیں

جُدا نہیں ہیں محبت سے نفرتیں، اے دل
یہ راستے بھی اُسی رہگزر سے نکلے ہیں

اب اُن کو مجھ سے لڑاتے ہیں، اہلِ دہر، ظفر
جو شاخسار مرے ہی شجر سے نکلے ہیں

-☆-

یہ میری اپنی ہمت ہے جو میں دُنیا میں رہتا ہُوں
مگر مجھ سے نہیں بنتی، مگر، دریا میں رہتا ہُوں

پتا میرا نیا ہے، ڈھونڈنے والو، کہ میں کب سے
دلِ رُسوا کو رو بیٹھا، لبِ گویا میں رہتا ہُوں

مجھے یکسو بھی رکھتا ہے نشانِ نقشِ نظارہ
پریشانِ تماشا بھی اِسی اثنا میں رہتا ہُوں

نہ کوئی ہم سفر میرا، نہ ہم منزل کوئی صُورت
بیابانِ سفر کے گوشۂ تنہا میں رہتا ہُوں

اُٹھاتا تھا کبھی میں بھی صدائے احتجاج اکثر
مگر، اب تو خمارِ تختیِ بے جا میں رہتا ہُوں

ظفر، ہوگا کہ ہوتے ہوتے پھر رہ جائے گا اب کے
ستاتی ہے یہی اُلجھن، اِسی دُبدھا میں رہتا ہُوں

☆

دوستیاں ہیں بے حساب، دوستیوں کی بات کیا
ہم تو اُسی کے ساتھ ہیں، وہ بھی ہے اپنے ساتھ کیا

اور ہیں جب حقیقتیں، پھر یہ توہمات کیوں
موت ہے سامنے اگر، پھر یہ تکلّفات کیا

بزمِ ہوس میں اہلِ دل اہلِ غرض ہو گئے
بیٹھ بھی جایئے تو ہے اپنی وہاں بساط کیا

وہ ہے بُرا تو اور ہیں آپ سے زیادہ ہی بُرے
تُم ہی بتاؤ کیجیے قطعِ تعلّقات کیا

ملتے رہیں تو اِس طرح حل کوئی مسئلہ بھی ہو
دُور رہو تو ہو سکیں طے یہ تنازعات کیا

اپنی شناخت جو بھی ہو، تُجھ سے جُدا نہیں ظفر
ہم ترا نقشِ خواب ہیں، اور ہماری ذات کیا

☆

دروازہ بھی کھولے گا، پذیرائی بھی ہو گی
لازم نہیں یہ بات کہ شنوائی بھی ہو گی

بچنا بھی ہے یلغارِ طلب سے کسی صورت
دشمن ہے مقابل تو صف آرائی بھی ہو گی

یورش ہے ابھی شوق فراواں کی شب و روز
جاتا ہے کوئی دن ہی کہ پسپائی بھی ہو گی

جس شہر کی عزت ہے فقط آپ کے دم سے
اس شہر میں اب آپ کی رسوائی بھی ہو گی

دنیا تو سمجھتی ہے کہ ہم مرتے ہیں جس پر
اس شوخ سے کچھ اپنی شناسائی بھی ہو گی

کچھ شور مچاتی بھی زیادہ ہے یہ مخلوق
کچھ برق بلا شہر پہ لہرائی بھی ہو گی

بے رنگ تو ہوں گے کبھی منظر بھی زمیں کے
بے آب کبھی چشم تماشائی بھی ہو گی

سوچا نہیں کرتے ہیں ظفر ڈوبنے والے
پانی اگر اتنا ہے تو گہرائی بھی ہو گی

☆

یہ شہر وہ ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں
دادِ ستم نہ دے کہ ستمگر بھی خوش نہیں

رشتوں کا ہو رہا ہے تعیّن پھر ایک بار
مالک جو سرگراں ہے تو نوکر بھی خوش نہیں

سایہ بھی جس نے ناپ لیا اپنے ساتھ ساتھ
ہو کر وہ میرے قد کے برابر بھی خوش نہیں

چلتی ہے ساتھ ساتھ اداسی کی لہر بھی
خوش ہوں تو جان لو کہ سراسر بھی خوش نہیں

کچھ بھی اگر نہیں ہے تو کیا رنج کھینچیے
سب کچھ یہاں ہے جس کو میسّر بھی خوش نہیں

غم اور خوشی تو بات ہے افتادِ طبع کی
جو گھر میں خوش نہیں ہے وہ باہر بھی خوش نہیں

اصرار تھا انھیں کہ بھلا دیجیے، ظفر
ہم نے بھلا دیا تو وہ اس پر بھی خوش نہیں

☆

ہر حجت حیلہ چھوڑ دیا
لفظوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا

سورج کی طرح غروب ہوئے
دھرتی کو گیلا چھوڑ دیا

کہیں جھاڑو دیا صفائی سے
کہیں تنکا تیلا چھوڑ دیا

پھیکے پکوان کی حسرت میں
سالن مرچیلا چھوڑ دیا

تفصیل ذرا کیا مانگی تھی
اُس نے تفصیلہ چھوڑ دیا

اُس تیز ہرے ہریالے پہ
کچھ پیلا پیلا چھوڑ دیا

اُوپر تاریکی سی کر کے
نیچے چمکیلا چھوڑ دیا

گھر میں تو خوب کفایت کی
باہر خرچیلا چھوڑ دیا

بجھتا ہی رہا دن رات، ظفر
کیا شعر نکیلا چھوڑ دیا

-☆-

میں پیسے دھیلے کی سوچتا ہوں
نہ میلے ٹھیلے کی سوچتا ہوں

مرے لہو میں ہے کوئی جھگڑا
کسی جھمیلے کی سوچتا ہوں

کپاس کے پھول کے بجائے
میں اُس کے تھیلے کی سوچتا ہوں

میں ساکنِ شہر ہوں سراسر
اور، اُس میں بیلے کی سوچتا ہوں

یہی ہے مٹی سے میرا رشتہ
ہمیشہ ڈھیلے کی سوچتا ہوں

جو ہے سروں سے گزرنے والا
اِک ایسے ریلے کی سوچتا ہوں

کہیں سرہانے کی جستجو ہے
کہیں گدیلے کی سوچتا ہوں

مرا ہے سب کاروبار اُسی سے
گرو ہوں، چیلے کی سوچتا ہوں

ظفر، گدھوں میں ہے جینا مرنا
جبھی طویلے کی سوچتا ہوں

-☆-

فرش پر بے بسی بچھاتا ہوں
جتنی کہیے ، ابھی بچھاتا ہوں

پیچھے پیچھے فغاں کا شور تو ہے
آگے آگے ہنسی بچھاتا ہوں

چارۂ کار اور کچھ بھی نہیں
خواب پر خواب ہی بچھاتا ہوں

چارپائی اگر نہیں یہ پسند
ٹھہریے ، دوسری بچھاتا ہوں

بستر اپنا لپیٹ لوں گا ابھی
اک ذرا سرسری بچھاتا ہوں

جب سے ہے رات کا سفر درپیش
راہ میں روشنی بچھاتا ہوں

شاعری کام دے رہی ہے بہت
اوڑھتا ہوں کبھی بچھاتا ہوں

تانتا ہوں خیال کا خیمہ
گفتگو کی دری بچھاتا ہوں

گھاس اُگاتا ہوں آسماں پہ ، ظفر
خاک پر چاندنی بچھاتا ہوں

☆

پھر غزل آ رہی ہے ، بسم اللہ
شاعری جا رہی ہے ، بسم اللہ

دن نکلتے ہی میرے چاروں طرف
رات سی چھا رہی ہے ، بسم اللہ

بھوک اُڑنے لگی ہے ، شکر الحمد
نیند شرما رہی ہے ، بسم اللہ

دل کو دیمک سی لگ رہی ہے کہیں
اپنا ہی کھا رہی ہے ، بسم اللہ

یہ مصیبت نہیں اکیلی بھی
ساتھ کچھ لا رہی ہے ، بسم اللہ

دھوپ سڑکوں ، گھروں ، درختوں پر
آگ برسا رہی ہے ، بسم اللہ

بے یقینی بھرے پُرے گھر میں
پانو پھیلا رہی ہے ، بسم اللہ

آشیانے سے تنگ تھا میں بھی
برق لہرا رہی ہے ، بسم اللہ

خیر مقدم کو میں پڑا ہوں ، ظفر
موت منڈلا رہی ہے ، بسم اللہ

☆

یہاں مت پوچھیے کیا مسئلہ درپیش رہتا ہے
کہ سب کو ایک جیسا مسئلہ درپیش رہتا ہے

محلّے میں بپا رہتا ہے پھر ہنگامہ ہر لمحے
کسی کو پھر کسی کا مسئلہ درپیش رہتا ہے

جو سارے مسئلے نمٹا بھی لیں تو بھائی لوگوں کو
ہمیشہ کوئی تازہ مسئلہ درپیش رہتا ہے

اگر سب مسئلے حل ہو گئے تو کیا کریں گے وہ
سو، یہ سب کے علاوہ مسئلہ درپیش رہتا ہے

انھیں پھر آڑے آ جاتی ہے اب مصروفیت کوئی
ہمیں بھی ایسا ویسا مسئلہ درپیش رہتا ہے

فقط اُلجھائے رکھتا ہے ہمیں ہی مسئلہ اُس کا
کہ اُس کو بھی ہمارا مسئلہ درپیش رہتا ہے

جو وہ تھوڑی توجہ اس طرف کر بیٹھتے بھی ہیں
تو پہلے سے زیادہ مسئلہ درپیش رہتا ہے

ہم اپنے مسئلوں سے روز ہو جاتے ہیں جب فارغ
تو پھر ہم کو تمھارا مسئلہ درپیش رہتا ہے

ظفرؔ، یہ اور سے کچھ اور ہی کیوں ہوتے جاتے ہو
کہو، تم کو یہ کیسا مسئلہ درپیش رہتا ہے

-☆-

وہ جاگے ہوں کہ سوتے، کھا رہے ہیں
اِدھر ہم صرف غوطے کھا رہے ہیں

انھیں کھانے سے فرصت ہی نہیں کچھ
کہ ہنستے ہیں نہ روتے، کھا رہے ہیں

چلو، تم خود نہیں کھاتے ہو، پھر کیا
تمھارے ہوتے سوتے کھا رہے ہیں

تمھارا نام رٹنے کے بہانے
ہمارا رزق طوطے کھا رہے ہیں

خوشامد سے چلاتے ہیں جو دھندا
تمھارے پانو دھوتے، کھا رہے ہیں

تمھارا اصطبل جب سے ہے قائم
سبھی کچھ گھوڑے کھوتے کھا رہے ہیں

بچا تھا جدِّ امجد سے اگر کچھ
وہی سب داد پوتے کھا رہے ہیں

نہیں کھاتے تھے وہ پہلے پہل تو
مگر، اب ہوتے ہوتے کھا رہے ہیں

ظفرؔ، قسمت ہے اپنی، روز ڈنڈے
کسی کا بوجھ ڈھوتے، کھا رہے ہیں

-☆-

رنگ دنیا بدل نہیں سکتا
ورنہ کیا کیا بدل نہیں سکتا

اور سب کچھ بدلتا رہتا ہے
حال اپنا بدل نہیں سکتا

نہیں بدلے گی کوئی شے، جب تک
یہ طریقہ بدل نہیں سکتا

کچھ تو بدلے گا اب یہ نقشِ شہر
ابھی اتنا بدل نہیں سکتا

کوشش اب کیجیے گا سارے کی
تھوڑا تھوڑا بدل نہیں سکتا

طرز اپنی بدلنے سے پہلے
طور اُن کا بدل نہیں سکتا

سبھی مل کر چلے ہیں اُس کی طرف
کوئی رستہ بدل نہیں سکتا

خود نہ بدلیں اگر اسے اٹھ کر
یہ زمانہ بدل نہیں سکتا

یہ روش تو یونہی رہے گی، ظفرؔ
یہ رویہ بدل نہیں سکتا

جینا بھی وہاں کیوں نہ ہو مرنے کے برابر
کرنا ہو جہاں کچھ بھی نہ کرنے کے برابر

اس شہر کی حالت کا پتا کچھ نہیں چلتا
ڈرنے سے زیادہ ہے کہ ڈرنے کے برابر

کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ خواب میں چلنا
ہے بس کے برابر سے گزرنے کے برابر

اس دشت میں یہ خاک اُڑانا ہے کم و بیش
چاروں طرف اپنے ہی بکھرنے کے برابر

کہسار کی تسخیر ہے اب اور طرح کی
چڑھنے کے برابر نہ اُترنے کے برابر

وہ بھوک مچلتی ہوئی خرمن کے پس و پیش
اک پیاس کی تصویر سی جھرنے کے برابر

اس رنج سے خالی بھی نہیں ظرفِ تماشا
پہنچا بھی نہیں ہے کہیں بھرنے کے برابر

اب فرق ہی باقی نہیں چیزوں میں کسی طور
اب یاد بھی رکھنا ہے بسرنے کے برابر

یہ کیسی مسافت ہے، ظفرؔ، کچھ نہیں کھلتا
چلتا ہوں، سو، وہ بھی ہے ٹھہرنے کے برابر

کام ہوتے نہیں سارے میرے
یہی جھگڑے ہیں تمھارے میرے

ابھی اتنا بھی تڑو نہ کرو
ابھی چلتے ہیں گزارے میرے

بیٹھتا جاتا ہوں تہ میں کہیں آپ
چڑھتے جاتے ہیں غبارے میرے

رات نے گھیر رکھا ہے مجھ کو
ہیں کہاں چاند ستارے میرے

میری ظاہر ہے ضرورت اُس پہ
وہ سمجھتا ہے اشارے میرے

اُٹھتا رہتا ہے دھواں آٹھ پہر
کبھی اڑتے ہیں شرارے میرے

پھر مٹا ہی دیا اُس نے یکسر
پہلے خود نقش نکھارے میرے

ایک ہی دوسرے کو شام و سحر
کاٹتے رہتے ہیں دھارے میرے

پھیل جاتا ہوں، ظفرؔ، چاروں طرف
ٹوٹ جاتے ہیں کنارے میرے

☆

عرش پاتال ہو گئے میرے
لوگ بدحال ہو گئے میرے

شہر ویران ہو گیا یکسر
باغ پامال ہو گئے میرے

کوئلیں میری ہو گئیں خاموش
مور بے چال ہو گئے میرے

کوئی منظر کہیں بچا ہی نہیں
خواب کنگال ہو گئے میرے

رات دن بوجھ بانٹنے والے
فارغ البال ہو گئے میرے

گرہ کٹ، چور، اُٹھائی گیر بھی
قافلے وال ہو گئے میرے

دل کے اندر گرا تھا خون، مگر
فرش کیوں لال ہو گئے میرے

کوئی پہچان ہی نہیں پاتا
کیا خدوخال ہو گئے میرے

گرم گفتار ہوں، ظفرؔ، کتنا
حرف سیال ہو گئے میرے

☆

سراج منیر مرحوم میری ایسی کاوشوں کو سیاسی معاملہ بندی کی غزلیں کہا کرتے تھے۔ جب کہ میں اسے اپنی ناکام شاعری قرار دیتا ہوں۔ اگرچہ اپنی باقی ماندہ شاعری کو بھی میں کامیاب نہیں کہہ سکتا، یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ غزلیں کچھ زیادہ ہی ناکام واقع ہوئی ہیں، اس لیے بھی کہ ان میں وہ تناسب اور توازن برقرار نہیں رکھا جا سکا، جو موضوع اور شعریت کے مابین قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے، بہ صورتِ دیگر وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو آپ کے سامنے ہے۔

میں مسلسل اُس پیرایے کی تلاش میں ہوں جو صحیح معنوں میں شاعری کے شایانِ شان ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہے، اور صورتِ حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں کہ:

میں بھاگتا پھرتا ہوں بے سُود تعاقب میں
یہ شعر کی تتلی ہے جو ہاتھ نہیں آتی

اور یہ تلاش وتشویش ہی میرے شعر کہتے رہنے کا جواز بھی ہے، جب کہ میں مایوس بھی ہوں، اور پُرامید بھی۔ شاید اسی لیے کچھ ایسا لگتا ہے کہ میری ہر تازہ تصنیف کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ میں گویا اپنے پچھلے تمام کلام کو منسوخ کر چکا ہوں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ میں اپنا ہر نیا مجموعہ بالآخر منسوخ اور مسترد ہی کرنے کے لیے ترتیب دیتا ہوں، یعنی:

ٹوٹ جانے کے لیے جُڑتا ہوں
شعر لکھتا ہوں مٹانے کے لیے

اللہ تعالیٰ میری حالت پر رحم فرمائے، جس کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں ہیں۔

پیشِ نظر مجموعے کو ایک آؤٹ برسٹ ہی کہا جا سکتا ہے جو کہ بجائے خُود کوئی ایسی قابلِ فخر بلکہ قابلِ ذکر چیز نہیں ہوتی، ماسوائے اس کے کہ کچھ الگ سے مُشترکہ مسائل پر عامۃ الناس سے براہِ راست مُخاطب ہُوا جائے، یا اُنھیں بھی اس واویلا میں شریک کیا جائے، جس دوران موضوع کا پلڑا بھاری اور شاعری کا ہاتھ ہلکا پڑ جاتا ہے، بات دوٹوک ہو جاتی ہے اور خاصی حد تک عامیانہ، عرش اور فرش میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، اور:

میں ہی پیچھے آتا ہوں

کی شرط پُوری کرنے کے بعد ہی اس ڈائیلاگ کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ معاشرے کو تبدیل کرنے اور اس میں موجود گند کو صاف کرنے کی کوشش یا خواہش غالباً انفرادی سطح پر بھی کی جا سکتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب یہ شعر کی شکل میں ڈھل کر اجتماعی شعور کا حصہ بن جانے کا امکان بھی رکھتی ہو، ورنہ یہ ایک خواہش اور اس کا اظہار تو ہے ہی، جو کہ بذاتِ خُود ایک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک ابتدائی صورت ہے، بہرحال امید ہے کہ یہ شاعری اُن لوگوں کو ضرور پسند آئے گی جو اس قسم کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

ظفر اقبال

فرح، نجیبہ، ارحم اور ارسل کے لیے

بوسہ بے ادبم بر تو پنہاں کرد ہجوم
کہ لب لعل ترا فرصت دشنام نبود
(مولانا گرامی)

پیش لفظ

غالب نے آموں کے سلسلہ میں یہ عجب شرط لگائی تھی کہ بہت سے ہوں اور میٹھے ہوں۔ بہت سے ہونے کی بات تو خیر ٹھیک ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط کہ وہ لازماً سب میٹھے ہوں، کچھ ایسی ہے کہ اس کا پورا ہونا مشکل تو ہے ہی، مگر یہ آموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ آج کل کے آموں پر مت جائیے، یہ تو مصنوعی طریقوں سے پیدا کیے جاتے ہیں، مصنوعی طریقوں سے پکائے جاتے ہیں اور مصنوعی طریقوں سے کھائے جاتے ہیں، اس لیے یہ قطعی ممکن ہے کہ میز پر جتنے آم چنے رکھے ہیں، وہ سب میٹھے ہوں۔

مگر آموں کے جس کلچر میں غالب نے آنکھ کھولی تھی اُس کا رنگ اور تھا، وہ رنگ کسی نہ کسی صورت اپنے بچپن کے زمانے تک قائم تھا۔ وہ قلمی آموں کا نہیں، دیسی آموں کا کلچر تھا۔ آم گدھوں کے حساب سے خریدے جاتے تھے کہ جتنے گدھے پر لدے ہوئے ہیں، وہ خرید کر ناند میں بھر دیے۔ وہ بہت سے تو ہوتے تھے لیکن میٹھے ہونے پر بھی سب دانے میٹھے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی کھٹا، کوئی گلا سڑا، کوئی ادھ کچرا، کوئی بالکل کچی کیری، اور اچانک ایسا آم نکل آتا کہ بقول غالب انگبیں کا سر بمہر گلاس۔ اور اسی میں آموں کا لطف بھی تھا۔ یہ نہیں کہ ایک ہی ذائقے کے آم کھائے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے آم کتنے کھائے جا سکتے ہیں۔ ذائقہ کی رنگا رنگی، اور پھر ہر آم کے ساتھ ایک نئی اُمید کہ شاید میٹھا نکلے، یا دھڑکا کہ کہیں کھٹا نہ نکل آئے۔

تو آم اُن دنوں بہت سے ہوتے تھے اور ذائقوں کی رنگا رنگی کے امین ہوتے تھے۔ اب آپ کہیں گے کہ مارُوں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ پیش نظر ظفر اقبال کی غزل ہے اور یہ شخص ذکر لے بیٹھا آموں کا۔ اصل میں آموں کا یہ سارا مضمون مجھے ظفر اقبال کی غزل ہی نے سمجھایا ہے۔ میں جب ظفر اقبال کی غزلیں پڑھ رہا تھا، تو بہت دیر تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بالعموم شاعری کے کسی مجموعے کو پڑھتے ہوئے چند غزلوں اور چند نظموں کے ساتھ ہی پتا چل جاتا ہے کہ ہم کس درجہ کی شاعری پڑھ رہے ہیں اور کبھی کبھی تو ایک دانے سے ذائقے کا پتا چل جاتا ہے۔ مگر ظفر اقبال کے سلسلے میں پہلے ہی میرے ساتھ ایسا ہی ہوا اور اس مجموعہ کو پڑھتے ہوئے پھر یہ ہوا کہ دیر تک میں گڑبڑایا ہوا رہا۔ پھر مجھے میر کے سلسلے میں کسی بزرگ کا یہ مشہور فقرہ یاد آیا کہ "بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست"۔ ابھی میں یہاں تک سوچ پایا تھا کہ اچانک میرے تصوّر نے پیچھے کی طرف ایک زقند لگائی اور میں اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ گیا۔ بس جیسے رم جھم بارش ہو رہی ہے، ناند میں بھرے پانی میں تر بتر آم رکھے ہیں، میں آم چوس رہا ہوں: ایک کھٹا، دوسرا کھٹا، تیسرا کچھ گلا ہوا، چوتھا کچی کیری اور پھر جو آم میرے ہاتھ میں آتا ہے تو تالو اور زبان کے بیچ رس گھل جاتا ہے۔ اور اب مجھے ظفر اقبال کی شاعری میں لطف آنے لگا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس شاعر کو کیسے پڑھنا چاہیے۔ اب میں دوسروں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی اسے ایسے مت پڑھیے جیسے اور شاعروں کو پڑھتے ہو۔ ظفر اقبال کی غزلیں ایسے پڑھو جیسے آم کھا رہے ہو۔ کھیل پر بیٹھ کر چھری کے ساتھ قلمی آم نہیں، بلکہ جیسے کھٹے میٹھے دیسی آموں سے بھری ناند آپ کے سامنے رکھی ہے اور آپ آستینیں چڑھا کر اطمینان سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں۔

ناصر کاظمی کی ایک بات مجھے یاد آ گئی: کہا کرتا تھا کہ اچھا شاعر وہ ہے جو بُرا لکھنے سے نہیں ڈرتا۔ کیا شاعر، کیا افسانہ نگار، بعض لکھنے والے اس چکر میں پڑے رہتے ہیں کہ جو لکھیں بے عیب ہو، کوئی اُنگلی نہ رکھ سکے۔ تاج محل تعمیر کرنے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں، مگر عمر گزر جاتی ہے اور کچا پکا گھر بھی نہیں بنا پاتے۔ ایسے لکھنے والے جو لکھتے ہیں اُس میں بالعموم آمد سے زیادہ آورد کا رنگ ہوتا ہے۔

ظفر اقبال کا رویّہ مختلف ہے۔ اس چکر میں شاید ہی کبھی پڑے ہوں کہ جو لکھیں وہ شاہکار ہو۔ اُن کے پہلے مجموعے کا نام شاید "آبِ رواں" تھا۔ مگر آبِ رواں تو دھیرے بہتی ندی بھی ہو سکتی ہے۔ اُن کی شاعری آبِ رواں نہیں، سیل ہے۔ ندیاں برسات میں چڑھ جاتی ہیں مگر اُن کی ندی تو ہر موسم میں چڑھی رہتی ہے۔ آمد کا زور بارہ مہینے رہتا ہے، آمد ہی آمد۔ بس منہ زور دھارا ہے کہ بہے چلا جا رہا ہے۔ پہلی ہی غزل دیکھیے: شعر ہیں کہ اُبلے چلے آ رہے ہیں۔ غزل جیسی صنف کہ اختصار کی طالب ہے، مگر ظفر اقبال کی آمد کے سامنے بے بس ہے۔ غزل ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔ غالب کو تو قصیدہ کہتے ہوئے بھی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ لمبا کھنچ گیا:

توسنِ طبع چاہتا ہے لگام

سو پٹڑی بدلی اور غزل کی راہ پر ہو لیے۔ ظفر اقبال کے یہاں توسنِ طبع بگٹٹ دوڑتا ہے، پٹڑی بدلنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ شاعری کے میدان میں ایسا سوار اور ہمارے زمانے میں! توسنِ طبع ہوا سے باتیں کرتا ہے، بلا کا شہسوار ہے، گرنے سے مطلق نہیں ڈرتا۔ ایک دفعہ گر بھی چکا ہے، اس موقع پر جب زبان کو راہ میں رکاوٹ جان کر اُسے روند کر نکل جانے کی کوشش کی تھی۔ پھر تو گرنا ہی تھا۔

یار کہتے ہیں کہ ظفر اقبال نئی لسانی تشکیلات والوں کے بہکانے میں آ گیا اور چال سے بے چال ہو گیا۔ اچھی بھلی غزل کہتے کہتے اول جلول لکھنے لگا۔ ہاں اُس زمانے میں نئی لسانی تشکیلات کا بھی تو اشتلم اُٹھا ہوا تھا۔ اور اشتلم میں گرنے والے ظفر اقبال کے ہمعصر ہی تھے، تو اُس کا بھی اثر ہوگا۔ مگر کسی کے کہنے سے کون بہکتا ہے۔ وہی بہکتا ہے جس کے اندر بہکنے کا مادّہ ہوتا ہے۔ اور یہ مادّہ لکھنے والے کے اندر ہونا چاہیے۔ ناک کی سیدھ میں چلتے رہنا اور روایت کے بتائے ہوئے رستے پر آنکھیں بند کر کے دوڑتے چلے جانا کوئی جسارت کی بات نہیں ہے۔ لکھنے والا وہ ہے جس میں روایت سے بغاوت کی ہمت ہو اور جو تجربے کے خطرے میں اپنے آپ کو ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ مگر ساتھ میں یہ ہوشیاری بھی تو ہو کہ سلامت واپس آ جائے۔ یہ نہ ہو کہ راستہ ہی میں کھیت ہو جائے۔ نئی لسانی تشکیلات والوں کے ساتھ بالعموم یہی ہوا۔ بے چارے رستے ہی میں کھیت ہو گئے۔ باہمت تھے، مگر ہوشیار نہیں تھے۔ بغاوت کی راہ پر روانہ تو ہو گئے، واپس نہیں آ سکے۔ ظفر اقبال واپس آ گیا۔

ظفر اقبال کے لیے اس راہ سے مفر نہیں تھا۔ توسنِ طبع جب اتنا رواں ہو تو راہ میں ہر آنے والی رکاوٹ کو تہس نہس کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فارم کی اپنی سخت گیریاں ہوتی ہیں، اور زبان کا اپنا ڈسپلن ہوتا ہے۔ فارم اور زبان مل کر شاعر پر اتنی پابندیاں عاید کر دیتے ہیں کہ تخلیقی جوہر کسمسانے لگتا ہے۔ کتنے ہی کسمسا کر رہ جاتے ہیں۔ پھر پابندیوں ہی کے اندر رہ کر اظہار کا رستہ نکال لیتے ہیں۔ صنوبر کی طرح کہ:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پابہ گِل بھی ہے

مگر وہ طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو بغاوت پر کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ ظفر اقبال کسمسا کر رہ جانے والوں میں نہیں تھے۔ اس شاعر کو بغاوت کرنی ہی تھی۔ مگر زبان کے ڈسپلن سے ٹکر لینا جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔ اس میں ہڈی پسلی تڑوا کر بیٹھ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لگتا یہی تھا کہ ظفر اقبال کے ساتھ یہی کچھ ہوگا۔ لیکن پتا نہیں کس طرح، شاید اس نے واپسی کا کوئی خفیہ انتظام کر رکھا تھا۔ کشتیاں جلائیں مگر کوئی ایک کشتی بچا کر رکھ لی ہوگی۔ ہمسفر ڈوب گئے، وہ جان بچا کر نکل آیا۔

اب شاعر آرام سے غزل کہہ رہا ہے۔ لیکن یہ غزلیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ اُس سفرِ بغاوت کے اثرات چل رہے ہیں، یا انھیں ثمرات کہہ لیجیے۔ زبان کے ڈسپلن کو دوبارہ قبول کر تو لیا ہے، لیکن اس طرح کہ پوری اطاعت قبول نہیں کی ہے۔ جہاں جی چاہا، زبان سے، اُس کے محاورے سے بے تکلف ہو گئے، اور جیسی ضرورت ہوئی، اُس کے حساب سے اُسے توڑ دیا۔ اگر مجھ میں نقاد والا سلیقہ ہوتا تو میں ان غزلوں سے مثالیں لے کر آپ کو بتاتا کہ ظفر اقبال نے کہاں کہاں زبان کے ساتھ، محاورے کے ساتھ بے تکلفی برتی ہے، اور یہ کہ اس سے کہاں شعر کی زبان میں ایک نیا لطف پیدا ہوا ہے، اور ایک تازگی آئی ہے، اور کہاں یہ بے تکلفی شعر کو لے بیٹھی ہے۔

بس میں نے تو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کیا اور آگے بڑھ گیا۔ پیچھے کون جائے اور ایسے مقامات کی نشان دہی کرے۔ ویسے بھی یہ کام نقادوں کا ہے، مجھ ایسے لاپروا قاری کا نہیں۔ میں نے تو یہاں بس اتنا سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ شاعر ہے کس قماش کا۔ اور یہ جو اس کا قلم اتنا تیز دوڑتا ہے تو اس کے پیچھے ہے کیا۔۔۔ ! یہ محض بسیار نویسی ہے جیسا کہ بعض دوستوں نے سمجھ رکھا ہے، یا یہ تخلیقی جوہر کا اُبال ہے کہ اُس نے چڑھی ندی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ادب میں ایسے تخلیقی جوہر سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ ایسے تخلیقی جوہر کو غلط بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ظفر اقبال نے اپنی طرف سے یا اپنی اُفتادِ طبع کے اثر میں ایسا اہتمام کر رکھا ہے کہ اچھے بھلے قاری کو آزمایش میں ڈال دیتا ہے۔

لیجیے! مجھے پچھلے زمانے کا ایک شاعر یاد آ گیا۔ اپنا کلام سُنانے سے پہلے سُننے والے کو آزماتا تھا:

کوئی نووارد خدمت میں حاضر ہو کر کلام سُنانے کی فرمایش کرتا تو پہلے یہ شعر سُناتا:

ٹوٹی دریا کی کلائی زُلف اُلجھی بام میں
مورچہ مخمل میں دیکھا، آدمی بادام میں

سُننے والا اگر اس شعر پہ واہ واہ سبحان اللہ کہتا تو شاعر سمجھ لیتا کہ آدمی مذاقِ سخن سے عاری ہے۔ ایسا ہی کلام سُنا کر ٹرخا دیتا۔ سُننے والا یہ سُن کر چُپ ہو جاتا تو سمجھ لیتا کہ آدمی صاحبِ فہم ہے۔۔۔اور پھر اپنا اصل کلام سُناتا۔

نئی شاعری والوں میں کتنے تھے جن کے پاس سُنانے کے لیے تھا ہی کچھ۔ اور جیسی رُوح ویسے فرشتے۔ ایسے قاری بھی پیدا ہو گئے جنھوں نے ایسی شاعری پر و نیز ایسے افسانے پر بہت سر دُھنا۔ بس اُسے ہی نئی شاعری اور نیا افسانہ سمجھا گیا۔

ظفر اقبال نے بھی ایسا نیا مال تیار کر رکھا تھا مگر اُس کے پاس کام کا مال بھی تھا، پر گاہک تھے اکثر بے خبر، تو ظفر اقبال نایاب مال باقی مال میں رلا ملا دیتا ہے۔ مضامین تو کے تو وہاں انبار لگے ہوئے ہیں۔ خریدار کے پاس نظر ہونی چاہیے۔ اور لیجیے پھر مجھے آموں کا خیال آ گیا۔ ظفر اقبال پال ڈالنے اور مسالے سے پکانے کے قائل نہیں ہیں۔

ڈال سے جس طرح ٹپکتا ہے اُسی طرح ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔۔ تو آپ کو اُن کے یہاں ڈال کا ٹپکا ملے گا۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں سمجھ لیجیے کہ رندے کا استعمال قطعی نہیں کرتے۔ آمد پہ بھروسا کرتے ہیں۔ آورد کو راہ نہیں دیتے۔ تو وہ جو شاعر ہوتے ہیں، جو ایک ایک مصرعے کو پالتے ہیں، اُن میں سے نہیں ہیں۔ اور پتا نہیں آپ کا کیا ردِ عمل ہے۔ مسالا لگے آم مجھے تو زیادہ بھاتے نہیں۔ ڈال کے ٹپکے کی بات ہی اور ہے۔۔۔

انتظار حسین

شرمندہ بہت ہیں ظفرؔ اس عیبِ سخن پر
اور، اس کے سوا کوئی ہُنر بھی نہیں رکھتے

نفس نذرانہ ہے اُس کا
لہو کاشانہ ہے اُس کا

یہ دل ، یہ بُت کدہ اب بھی
عجائب خانہ ہے اُس کا

بڑا عاقل وہی ہے ، جو
بہت دیوانہ ہے اُس کا

فروغِ شمع سے بڑھ کر
بہ پروانہ ہے اُس کا

حقیقت سربسر ہے وہ
بھی افسانہ ہے اُس کا

قیموں ، بے نواؤں سے
بہت یارانہ ہے اُس کا

یگانہ کِس کا ہے کوئی
اگر بے گانہ ہے اُس کا

خزانے دفن ہیں سارے
جہاں ویرانہ ہے اُس کا

ظفر ، یہ شاعری میری
فقط شکرانہ ہے اُس کا

☆

جو ناروا تھا اُس کو روا کرنے آیا ہوں
مَیں قرض دُوسروں کا ادا کرنے آیا ہوں

اک تازہ تر فتور مرے سر میں اور ہے
جو کر چُکا ہوں اُس سے سوا کرنے آیا ہوں

خود اک سوال ہے مرا آنا ہی اِس طرف
اب کیا بتایئے کہ مَیں کیا کرنے آیا ہوں

کہنی ہے دُوسروں سے الگ مَیں نے کوئی بات
مَیں کام کوئی سب سے جُدا کرنے آیا ہوں

اک داغ ہے کہ جس کا لگانا ہے اب سُراغ
اک زخم ہے کہ جس کو ہرا کرنے آیا ہوں

انجامِ کار دل کا یہ دروازہ توڑ کر
مَیں سارے قیدیوں کو رہا کرنے آیا ہوں

رکھتا ہوں اپنا آپ بہت کھینچ تان کر
چھوٹا ہوں ، اور ، خود کو بڑا کرنے آیا ہوں

جو کر رہے ہیں ، ایسے ہی کرتے رہیں گے سب
مَیں تو فضول چُون و چرا کرنے آیا ہوں

خیرات کا مجھے کوئی لالچ نہیں ، ظفر
مَیں اس گلی میں صرف صدا کرنے آیا ہوں

☆

خاص بھی ہونا ہمارا عام رہ جانے سے ہے
پختگی ساری یہ اپنے خام رہ جانے سے ہے

رات جگمگ کر اٹھی ہے، کچھ اندھیرا سا، مگر
دل کے اندر تھوڑی شام رہ جانے سے ہے

تازگی بھی ہے سفر کی داستاں در داستاں
کچھ تھکن بھی تشنۂ انجام رہ جانے سے ہے

کیا سبب کس چیز کا ہے، کچھ پتا چلتا نہیں
دل کی آسایش کہ بے آرام رہ جانے سے ہے

کوئی حیرانی یہاں دیوار گرنے سے نہیں
کچھ اگر ہے بھی تو مجھ کو بام رہ جانے سے ہے

کچھ پریشانی انھیں اپنی بھی کم فہمی سے تھی
کچھ ہماری بات میں ابہام رہ جانے سے ہے

دل میں کچھ اُس کے، اسیری کا ارادہ ہو نہ ہو
مقصد اپنا بھی تو زیرِ دام رہ جانے سے ہے

میری جملہ نیک نامی، اور ساری آبرو
میرے سر اُس شوخ کا الزام رہ جانے سے ہے

اے ظفر، سچ پوچھیے تو کامیابی عشق میں
سربسر جتنی بھی ہے، ناکام رہ جانے سے ہے

☆

تماشا نہیں، تازیانہ ہے اب
جہاں شوق تھا، شاخسانہ ہے اب

نہ وہ ہے کہیں پر، نہ مَیں ہوں یہاں
ملاقات بس غائبانہ ہے اب

رواں تو ہوئی ہے کہیں طبعِ خام
چلو، جس طرف بھی روانہ ہے اب

کبھی شاعری تھی ہماری شناخت
طبیعت فقط شاعرانہ ہے اب

ہماری تو میعاد پوری ہوئی
زمانہ تمھارا زمانہ ہے اب

حقیقت ہماری کھلی خلق پر
بس اتنا ہی اپنا فسانہ ہے اب

اب ایسے میں باہر کہاں جائیں ہم
سو، کمرے میں ہی کارخانہ ہے اب

یہی وقت ہے دشمنی کے لیے
کہ ماحول کچھ دوستانہ ہے اب

جلا کر کیا خاک جس کو، ظفر
اُسی شہر میں آب و دانہ ہے اب

☆

دل میں جو محبت کا تماشا نہیں لگتا
لگتا ہے، مگر دور سے ایسا نہیں لگتا

بہتا ہے نہ رہتا ہے کناروں میں سمٹ کر
دریا ہی کچھ ایسا ہے کہ دریا نہیں لگتا

ہو سکتا ہے اس گردِ تغافل سے کسی دن
ایسا بھی نکل آئے وہ جیسا نہیں لگتا

فی الحال تو میں خود بھی نہیں جانتا شاید
کیسا مجھے لگتا ہے وہ، کیسا نہیں لگتا

اُس کے دلِ پُرپیچ کی گلیوں میں کئی بار
پہنچا بھی ہوں لیکن، ابھی پہنچا نہیں لگتا

رُکتا نظر آتا نہیں اک سلسلۂ خواب
اک رنگِ رواں ہے کہ ٹھہرتا نہیں لگتا

اُس شوخ پہ مرنا تو بڑی بات ہے، لیکن
کہتے ہیں کہ اس عمر میں اچھا نہیں لگتا

اُلجھا ہوں کچھ اس طرح سے افلاک در افلاک
مجھ کو تو ستارہ بھی ستارہ نہیں لگتا

رونق ذرا چل پھر کے ہی دیکھ آئیں ظفر، آؤ!
ہر روز تو بازار جمتا نہیں لگتا

-☆-

خوش ہیں الفاظ معانی کے بغیر
مچھلیاں پھرتی ہیں پانی کے بغیر

ایک آغاز ازل سے بھی پرے
ایک انجام کہانی کے بغیر

رنگِ پرواز سے خالی تھے وہاں
چال دیکھی ہے روانی کے بغیر

کوئی دے گا نہ سراغ اُس کا یہاں
ڈھونڈیے اُس کو نشانی کے بغیر

دل کو اب یاد بھی آتا نہیں وہ
ٹھیک سی یاددہانی کے بغیر

توڑ میرا بھی ہے موجود کہیں
یعنی میں بھی نہیں ثانی کے بغیر

خود کو پہچان نہیں سکتا ہوں
اپنی آشفتہ بیانی کے بغیر

اپنے دل میں بھی نہیں جا سکتا
اب تو میں نقل مکانی کے بغیر

سر پہ ہے بوجھ محبت کا، ظفر
لیکن اس بارِ گرانی کے بغیر

-☆-

لفظ موہوم ہیں ، لفظو خواب ہے
درمیاں کچھ نہیں ، چار سُو خواب ہے

تُو کہاں ہے ، مجھے اے اصلِ ہستی ، بتا
مَیں جہاں ہُوں ، مرے رُوبرُو خواب ہے

آئنے اُگ رہے ہیں ہوا در ہوا
آئنوں میں وہ عکسِ نمو خواب ہے

سامنے یہ جو پھیلا ہے شہرِ یقیں
ہے گماں سربسر ، ہُوبہُو خواب ہے

اِک خیالِ خراماں ہے یہ جسم و جاں
دوڑتا بھاگتا یہ لہو خواب ہے

دیکھنا بھی ہے اور جاگنا بھی نہیں
زندگی اس قدر ڈوبڈو خواب ہے

برف جمنے لگی ہے لہو میں بہت
اور ، ابھی دھوپ کی جستجو خواب ہے

اِتنے مُحکم ارادے نہیں چاہییں
دیکھ ! مَیں وہم ہُوں ، اور تُو خواب ہے

آنکھ کھلنے کا بھی منتظر ہے ، ظفر
کس طرح کا ، تری آرزو خواب ہے

☆

آنکھوں کے آسماں پہ جو یہ ابر پارہ ہے
شاید ہماری خاکِ طلب کا اشارہ ہے

شاخوں سے دُور دُور چمکتا ہُوا طلسم
پہلے بھی تھا کبھی ، مگر اب کے دوبارہ ہے

آنکھوں کو اعتبار بھلا کیسے آئے گا
کہتے رہو کہ پھول نہیں ہے ، شرارہ ہے

دن کا ہے ایک دشت مری راہ میں ابھی
اور ، اُس کے بعد شام کا پہلا کنارہ ہے

اُس کی بھی سرزمیں پہ اکیلا ہے ایک پھول
میرے بھی آسمان پہ تنہا ستارہ ہے

دُنیا سے ہم نے کچھ نہیں چاہا کبھی یہاں
اپنے ہی آب و رنگ پہ اپنا گزارہ ہے

آخر کو اس غبار نے غائب کیا ہمیں
بس کاروبارِ خاک پہ اپنا اجارہ ہے

آگے بھی دے چکے ہیں کتاب و حسابِ دل
یہ بھی اسی برس کا نیا گوشوارہ ہے

لکڑی کی شاعری ہی تراشا کیے ، ظفر
چلتا ہُوا ہمارے بھی ہاں ایک آرہ ہے

☆

یہ راکھ سے جو شرارے بناتا رہتا ہوں
سمجھ سکو تو اشارے بناتا رہتا ہوں

دراصل جو مجھے خود بھی نظر نہیں آتے
ہواؤں پر وہ نظارے بناتا رہتا ہوں

تمھارے ساتھ بنائی تھی مل کے جو تصویر
وہی بغیر تمھارے بناتا رہتا ہوں

نہیں ہے جاں سے بھی ہر وقت کھیلنا ممکن
سو، لفظ غبارے بناتا رہتا ہوں

بگڑتے جاتے ہیں جو کام ایک اک کر کے
بزعمِ خویش وہ سارے بناتا رہتا ہوں

کھڑا ہوں پانو پہ اپنے تو کس لیے آخر
یہ ساتھ ساتھ سہارے بناتا رہتا ہوں

مواد جو بھی میسّر ہوا، غنیمت ہے
میں خاک سے ہی ستارے بناتا رہتا ہوں

مجھے بہاو میں بہنا نصیب کیا ہوتا
کہ میں تو اپنے ہی دھارے بناتا رہتا ہوں

کچھ اختیار بھی رکھوں، ظفر، روانی پر
ہمیشہ اپنے کنارے بناتا رہتا ہوں

-☆-

ابر کے ٹکڑے ہیں شاخوں پر، تو پتّے آسماں پر ہیں
جس جگہ چیزوں کو ہونا چاہیے تھا، اور کہاں پر ہیں

وہم کے پتلوں کا رقص رہگزر ہے جاری و ساری
خواب میں برسی ہوئی بارش کے چھینٹے داستاں پر ہیں

کیا سفر درپیش ہے ہم کو، ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے
صرف اتنا ہے کہ سب کے ساتھ اس دشت رواں پر ہیں

اب وہ کھٹ مٹھی محبت قصّۂ ماضی سہی، لیکن
سو طرح کے بھولے بسرے ذائقے اب تک زباں پر ہیں

سو شکایت اس تنِ نازک سے اس دل کو تو رہتی ہے
کچھ گلے لیکن ہمیں اپنے بھی اس رنجِ گراں پر ہیں

ایک اُس کے وصل کی خوش بو کے پیچھے پھرنے والوں کا
یہ شرف بھی کون سا کم ہے کہ رخشِ رایگاں پر ہیں

خود بھی ہم ہر سو بکھرنے کے لیے تیار ہیں اب تو
اے ہوا! شاید تری نظریں بھی خاکِ آشیاں پر ہیں

جو بھی ملنا ہے، اسی درگاہ سے ہم کو عطا ہو گا
کتنی مدّت سے پڑے اپنے ہی سنگِ آستاں پر ہیں

اے ظفر، کچھ بھی پتا چلتا نہیں اس کا کہ آپ آخر
بیٹھے بیٹھے کون سے لمحے یہاں ہیں یا وہاں پر ہیں

-☆-

ہوا کے ہاتھ پہ رکھا ہُوا مُعاملہ ہے
سو ، یہ ہمارا تُمھارا بھی کیا مُعاملہ ہے

کبھی ملیں بھی تو موسم کی بات کرتے ہیں
ہمارا اُس کا تعلُّق ہی لامُعاملہ ہے

ہمیں تو اُس سے محبت ہے ، یہ تو مانتے ہو
اُسے نہیں ہے تو یہ اک جُدا مُعاملہ ہے

ہمارے واسطے منزل مُعاملہ نہیں عشق
سو ، جس قدر بھی ہے ، بس راستہ مُعاملہ ہے

یہاں ہمارے نہ ہونے میں ، اور ، ہونے میں
زیادہ فرق نہیں ، ایک سا مُعاملہ ہے

مُجھے اُس کی بزم میں جانے سے تو نہیں انکار
بس اُس کے ساتھ ہمارا ذرا مُعاملہ ہے

ہمارا کام تو یلغار ہے محبت کی
رہا بچاو ، تو یہ آپ کا مُعاملہ ہے

ابھی یہ راز کسی پر نہیں کھلا کہ یہ کھیل
بشر مُعاملہ ہے یا خُدا مُعاملہ ہے

فساد ہوتا ہی رہتا ہے اُس گلی میں ، ظفر
پر ، اِس دفعہ تو کوئی دُوسرا مُعاملہ ہے

☆

اُس کے سفر میں زادِ سفر دیکھنا نہیں
خُود بھی ملے تو ایک نظر دیکھنا نہیں

کرنا ہے اور طرح سے محسوس اب اُسے
پھرنا ہے آس پاس ، مگر ، دیکھنا نہیں

کوئی سوار ہی نہ نکل آئے ، اِس لیے
ہم کو غُبارِ راہگذر دیکھنا نہیں

جب دیکھنے چلے تو ہمیں کچھ پتا نہ تھا
کس سمت دیکھنا ہے ، کدھر دیکھنا نہیں

آنکھوں میں ایک بار ہی بھر لیں گے اُس کی شکل
دیکھا اُسے تو بارِ دگر دیکھنا نہیں

اک لفظ جو لبوں پہ لرزتا ہے رات دن
کہنا ہے ، اور ، خواب اثر دیکھنا نہیں

اچھا ہے ، روکیے نہ ہمیں آپ بھی ، کہ ہم
دیکھیں گے اُس طرف ہی جدھر دیکھنا نہیں

تُم کُچھ بھی ہو ، ہم آئیں گے بس دیکھنے تمھیں
مقصد تُمھارے عیب و ہُنر دیکھنا نہیں

اُس کی طرف سے بیٹھے ہو مُنہ موڑ کر ظفر
آئے ہی کس لیے تھے اگر دیکھنا نہیں

☆

کھینچ لے جاتی ہے سب کو، یہ ہنر خاک میں ہے
آسماں زاد ہوں، لیکن، مرا گھر خاک میں ہے

ڈھول پر پھیلتا جاتا ہے کوئی خواب محال
جو کسی پر نہیں کھلتی وہ خبر خاک میں ہے

خشک و تر سے ہے بس اتنا سا تعلق باقی
پانو پانی میں ہیں میرے بھی سر خاک میں ہے

پرورش پاتا ہوا دل میں یہ پودا سا کوئی
پھوٹ نکلے گا کسی روز اگر خاک میں ہے

گرد باد اس کو بھی کوئی لیے پھرتا ہے کہیں
اور اسی طرح سے اپنا بھی سفر خاک میں ہے

جسے رکھا تھا ابھی جھاڑ پھٹک کر میں نے
خواہش وصل ہے، اور، بار دگر خاک میں ہے

پھول مرجھانے لگے کھلنے سے پہلے اس بار
فرق موسم کا ہے یا کوئی کسر خاک میں ہے

کوئی افلاک سے اترے گا نہ ان کی خاطر
شب نشینوں کی اگر ہے تو سحر خاک میں ہے

کشتیاں لوٹ کے واپس نہیں آتی ہیں، ظفر
کوئی ایسا ہی زبردست بھنور خاک میں ہے

☆

رعب دکھا کر اس کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں
مشکل کام کو اور زیادہ مشکل کرنا چاہتا ہوں

خواہش کو اس حال میں سر سے گزر جانے بھی دوں، لیکن
سچ پوچھو تو میں اس موج کو ساحل کرنا چاہتا ہوں

صرف محبت ہی نہیں، اس کی عزت بھی کرنی ہے مجھے
درمیان میں اور اک پردہ حائل کرنا چاہتا ہوں

یوں ہی تو خارج نہیں ہونا چاہتا اس منظر سے میں
کوئی تو شے کسی چیز میں داخل کرنا چاہتا ہوں

میں نے ساری عمر لگا کے جسے تصویر کیا تھا کہیں
اب اس خواب میں اپنے آپ کو شامل کرنا چاہتا ہوں

کافی وقت گنوا بیٹھا ہوں صلح صفائی میں رہ کر
خود کو آخر کار کسی کے مقابل کرنا چاہتا ہوں

خود سے یہ انکار مرے اپنے ہی تک محدود نہیں
یہ اعلان بغاوت محفل محفل کرنا چاہتا ہوں

مجھ پر کھلنے والے ہیں اسرار اک نئی حقیقت کے
اپنے سارے لکھے ہوئے کو باطل کرنا چاہتا ہوں

جیسی پہلے تھی دنیا، اس سے تو وہی بہتر تھی ظفر
رفتہ رفتہ اپنے اثر کو زائل کرنا چاہتا ہوں

☆

جا، بے جا کہنے والا
کہاں ہے کیا کہنے والا

ایک ہی تھا، اب وہ بھی نہیں
بھلا بُرا کہنے والا

باقی نہیں رہا، افسوس
کوئی دُعا کہنے والا

بچی کھچی محفل میں ہے
رہا سہا کہنے والا

سُننے والوں کو آخر
ڈھونڈے گا کہنے والا

کسی کو اندازہ ہی نہیں
کون ہے کیا کہنے والا

ظاہر ہونے کو ہے کہیں
کوئی نیا کہنے والا

کوئی تو ہوگا، سب سے الگ
اور، جُدا کہنے والا

ساون کا اندھا ہوں، ظفر
اور، ہرا کہنے والا

محبت کے زمانے کون سے ہیں
نئے کیا تھے، پُرانے کون سے ہیں

ہوا کا جال پھیلا ہے کہاں تک
ہوس کے تانے بانے کون سے ہیں

دکھانے کون سے ہیں زخم اُس کو
اور، ان میں سے چھپانے کون سے ہیں

وہ زُلفیں ہونا چاہیں بھی پریشاں
تو اپنے پاس شانے کون سے ہیں

پرندے پُوچھتے ہیں بجلیوں سے
ہمارے آشیانے کون سے ہیں

ہمارا قتل واجب ہے اگر، تو
نئے اب کے بہانے کون سے ہیں

زمیں، تُجھ میں کشش کیسی ہے آخر
ترے اندر خزانے کون سے ہیں

بس اک ضد ہے جسے دیتے ہیں پانی
وگرنہ عاشقانے کون سے ہیں

ظفر، باقی نہیں عیبِ سخن بھی
ہُنر اب آزمانے کون سے ہیں

عیب کو محفوظ کرنے سے ہنر جاتا نہیں
اور ، چلا بھی جائے تو اُس کا اثر جاتا نہیں

خود سے خالی ہو چکا ہوں ، اور ، پڑا ہوں منتظر
یہ سبُو اک بار پھر جب تک کہ بھر جاتا نہیں

بھاگتا ہوں جس سے ، آنکھوں کے اُفق پر بار بار
جم سا جاتا ہے وہی منظر ، گزر جاتا نہیں

ساز باز اُس کی ہوا کے ساتھ رہتی ہے عجب
پھول سا کھِلتا بھی ہے ، لیکن، بکھر جاتا نہیں

اب یہی ہو گا کہ اُس کو ڈھونڈنے نکلے اگر
ہم اُدھر پھرتے رہیں گے وہ جدھر جاتا نہیں

یُوں گزر جاتا ہے جیسے کچھ نہ ہو اُس کو خبر
اصل میں حال آں کہ اتنا بے خبر جاتا نہیں

خود ہی اپنی میٹھی مرضی سے وہ رُک جائے تو ہے
ورنہ اپنے روکنے سے تو ٹھہر جاتا نہیں

کچھ نہ کچھ آثار رہ جاتے ہیں اُس کے جابجا
وہ یہاں سے جائے بھی تو اِس قدر جاتا نہیں

مجھ سا بُزدل جائے گا بزمِ عدو میں کیا ظفر
میں تو مدّت ہو گئی اپنے بھی گھر جاتا نہیں

-☆-

خوش بہت پھرتے ہیں وہ گھر میں تماشا کر کے
کام نکلا تو ہے اُن کا مجھے رُسوا کر کے

روک رکھنا تھا ابھی اور یہ آواز کا رس
بیچ لینا تھا یہ سودا ذرا مہنگا کر کے

اِس طرف کام ہمارا تو نہیں ہے کوئی
آ نکلتے ہیں کسی شام تمھارا کر کے

بٹ گئی ہے کوئی مُڑتی ہوئی سی موجِ ہوا
چھپ گیا ہے کوئی تارا سا اشارا کر کے

فرق اتنا نہ سہی عشق و ہوس میں ، لیکن
میں تو مر جاؤں ترا رنگ بھی میلا کر کے

صاف و شفاف تھی پانی کی طرح نیتِ دل
دیکھنے والوں نے دیکھا اسے گدلا کر کے

شوق سے کیجیے ، اور دیر نہ فرمایئے گا
کچھ اگر آپ کو مل جائے گا ایسا کر کے

یُوں بھی سجتی ہے بدن پر یہ محبت کیا کیا
کبھی پہنو اسی ملبوس کو اُلٹا کر کے

مجھ سے چھڑوائے مرے سارے اُصول اُس نے ، ظفر
کتنا چالاک تھا ، مارا مجھے تنہا کر کے

-☆-

سوالِ وصل پہ کچھ دیکھتے نہ بھالتے ہیں
جو آج کرنا ہے وہ کام کل پہ ٹالتے ہیں

رنگے نہیں وہ ہمارے بھی رنگ میں اب تک
نہ خاص اپنے ہی سانچے میں ہم کو ڈھالتے ہیں

کئی دنوں سے عجب طور ہے محبت کا
کہ آتے جاتے ہیں، پر، بولتے نہ چالتے ہیں

کسی کے ذمے ہمارا بھی کچھ نکل آئے
اسی خیال سے کھاتا کوئی کھنگالتے ہیں

نکلتا آتا ہے اندر سے اور بھی تاریک
دلِ سیاہ کو جتنا بھی ہم اُجالتے ہیں

سوال اُٹھاتا ہے تعمیرِ شہر کا جو کوئی
تو شہریار اُسے شہر سے نکالتے ہیں

جو گرنے والے ہیں، اُن کے قریب آتے نہیں
جو ہیں ہی قائم و دائم اُنھیں سنبھالتے ہیں

یہ آنے والوں سے اچھے ہیں، جس طرح کے بھی ہوں
کہ مارتے ہیں، اگر، چھاؤں میں تو ڈالتے ہیں

ظفر، ہنر لیے پھرتے ہیں کیا ہتھیلی پہ
چھپانے والی ہے جو شے اُسے اُچھالتے ہیں

☆

مَیں کہہ سکتا نہیں جو بات کہنا چاہتا ہوں
نہ ایسی اُن کہی حالت میں رہنا چاہتا ہوں

یہ پتے پھوٹ نکلے ہیں مرے اندر ہی اندر
اسی خاطر کوئی شاخ برہنہ چاہتا ہوں

جو رُکتا ہوں تو اس کا بس یہی مطلب سمجھیے
کہ مَیں کچھ اور بھی زوروں سے بہنا چاہتا ہوں

تبھی شاید کوئی آ کر مجھے تعمیر کر دے
کچھ ایسی خستگی میں ہوں کہ ڈھہنا چاہتا ہوں

محبت کچھ مجھے تھی بھی بہت اس زندگی سے
سو، مَیں اس کو ابھی کچھ اور سہنا چاہتا ہوں

مجھے پہچان ہی پائے نہ کوئی شہر بھر میں
کوئی اس طرح کا ملبوس پہنا چاہتا ہوں

کوئی اپنے لیے ہتھیار ہے درکار مجھ کو
نہ مَیں اُس کے لیے ہی کوئی گہنا چاہتا ہوں

بہت برسا چکا ہوں چاندنی شہرِ سخن پر
اور، اب مَیں اپنی مرضی سے گرہنا چاہتا ہوں

ظفر، یہ کاہلی تو خیر عادت ہے پرانی
نیا ہی کوئی مَیں اب کے اُلہنا چاہتا ہوں

☆

جس کا بھی قصیدہ ہو، تشبیب تو میری ہے
مضموں نہ سہی میرا، ترتیب تو میری ہے

کیا ہے جو فلک میری پروا نہیں رکھتا کچھ
اے خاکِ سخن تجھ پر تنصیب تو میری ہے

تعمیر کریں جو کچھ، تشکیل کریں جو بھی
نقشہ تو ہے میرا ہی، ترکیب تو میری ہے

اندر ہی سے اُگتا ہے ہر عیب و ہنر مجھ میں
بگڑا ہوں کہ سنورا ہوں، تہذیب تو میری ہے

کیوں کر نہیں مانوں گا مَیں اپنے حریفوں کو
تسلیم نہ کرنے میں تکذیب تو میری ہے

مَیں کیسے گرانے دوں، گھر ہے مرے دشمن کا
اس میں بھی اگر سمجھو، تخریب تو میری ہے

لوگوں کو پکڑتے ہیں جس جرمِ تماشا پر
مجھ سے بھی کوئی پوچھے، ترغیب تو میری ہے

تعریف عدو کی وہ کرتے ہیں، سو، کرنے دو
اتنا تو، مگر، سوچیں، تقریب تو میری ہے

حصّہ ظفر، اپنا ہے اس داد و دہش میں بھی
انعام نہ ہو بے شک، تادیب تو میری ہے

☆

سوچتا رہتا ہوں کیا کیا نہیں کرنے والا
کر رہا ہوں جو تماشا نہیں کرنے والا

اپنی، ہر کام کے بارے میں یہی سوچ رہی
کرنے والا ہے بھلا یا نہیں کرنے والا

کیوں نہ پسپائی ہو تقدیر ہماری کہ یہاں
آگے بڑھ کر کوئی حملہ نہیں کرنے والا

کہنے والے تو بہت پھرتے ہیں اندر باہر
ہم نے، لیکن، کوئی دیکھا نہیں کرنے والا

بے عمل جتنے ہیں، سب شور اُنہی کا ہے یہاں
کر گزرتا ہے، سو، کہتا نہیں کرنے والا

اس تگ و دو میں بہت ہے مجھے اپنی ہی گرفت
مَیں کسی اور کی پروا نہیں کرنے والا

اپنے ہی زور میں پھٹ جاؤں گا، لگتا ہے مجھے
جب سے مَیں کوئی دھماکا نہیں کرنے والا

دل تو درویش ہے، تھوڑا بھی بہت ہے اس کو
کون کہتا ہے، گزارا نہیں کرنے والا

آپ نے بات بڑھا دی یونہی ضد میں، ورنہ
ظفر اقبال تو جھگڑا نہیں کرنے والا

☆

ہے وہی دل کو دُکھانے کی، ستانے کی ادا
کاش دکھلاتے کبھی تم بھی ٹھکانے کی ادا

ہر گھڑی کہہ کر مُکر جانے کا نخرا ہے الگ
اور پھر سب سے جُدا حیلے بہانے کی ادا

سب سے پہلے بات وہ میری ہی سُنتا ہے، مگر
یہ بھی ہے اک بزم سے مُجھ کو اُٹھانے کی ادا

خود ہی آ بیٹھے سہی اس گنبدِ ایماں میں ہم
رسمِ دربندی تو اُس کافر ادا نے کی ادا

اُس کے جانے کی خبر مُجھ کو کہاں ہوتی ہے اب
مار رکھتی ہے مُجھے تو اُس کے آنے کی ادا

کن فضاؤں کی جھلک بے چین رکھتی ہے مُجھے
کیا ہوا تھی، اور، اس کے سرسرانے کی ادا

جھلملاہٹ لفظ میں صبحوں کی اور شاموں کی ہے
اور لہو میں موسموں کے آنے جانے کی ادا

شور و شر میں ایک سنّاٹے کی لہریں سی رواں
اور کچھ خاموشیوں میں سنسنانے کی ادا

چاہیے اس عمر میں معشوق تو ایسا، ظفر
خوبیاں جس میں بہم سب ہوں، وفا، نیکی، ادا

-☆-

کھول کر بھی پاؤ گے بارِ دگر باندھا ہُوا
اس طرح سے ہے مرا دستِ ہنر باندھا ہُوا

کچھ سمجھ ہم کو ہی اس دل کی نہیں آتی کہ جو
سُو بہ سُو آزاد ہے، اور سربسر باندھا ہُوا

مَیں بھی اس بندش سے پُورے طور پر واقف نہیں
شاید اُس نے بھی ہے مُجھ کو بے خبر باندھا ہُوا

اک ہوا اس طرح سے پابند رکھتی ہے مُجھے
خاک سے ہوتا ہے جیسے ہر شجر باندھا ہُوا

توڑ دینا بھی تو آخر میرے اپنے بس میں ہے
یہ ارادہ سا بھی ہے مَیں نے اگر باندھا ہُوا

اُس طرف سے بھی کبھی ہو کر نکل جاتا وہ شوخ
مُدّتوں سے رنگ ہے مَیں نے جدھر باندھا ہُوا

کُھل کے پھیلا ہے تو دُنیا کو ہُوا کیسا مُحیط
ایک مضمونِ محبت مختصر باندھا ہُوا

کون سا رشتہ ہے جس نے اس قدر بکھراو میں
گرتے پڑتے بھی ہے گویا سارا گھر باندھا ہُوا

جانے کیا سُوجھی کہ اُٹھ کر چل دیے یونہی، ظفر
رہ گیا گھر میں ہی سامانِ سفر باندھا ہُوا

-☆-

جب یہ آنکھیں تری دہلیز سے چپکا سکتا
میں جو خاشاک تماشا نہیں بکھرا سکتا

شہر سارا ہی مرے گھر سے ترے گھر تک ہے
ایک دیوار نہیں ہے جسے میں ڈھا سکتا

میرے ہونٹوں پہ کوئی آگ سی کھل اٹھتی کہیں
تیری آنکھوں میں کوئی ابر سا لہرا سکتا

شاید آتا کسی پہلو سے تجھے بھی یہ پسند
میں جو ملبوسِ محبت تجھے پہنا سکتا

تجھے کھو دینے کو تیار بھی ہوں ہر لمحے
اور، یہ حسرت بھی نہیں ہے کہ تجھے پا سکتا

یوں بھی ہر روز تری دید کی عادت تھی اسے
آنکھ اب دل تو نہیں ہے جسے بہلا سکتا

ایسی ویسی کوئی امید نہ رکھنا مجھ سے
میں ترے ساتھ بہت دور نہیں جا سکتا

یوں بھی ہو سکتا کہ جب بھی مرا جی چاہتا میں
پیکٹوں میں تجھے بازار سے منگوا سکتا

خود خیال اس کو کبھی بھی نہیں آئے گا، ظفر
اور، ادھر میں ہوں کہ دامن نہیں پھیلا سکتا

☆

بت نئے اسلوب سے شام و سحر مشکل میں ہے
کیا کریں دل کو سہولت ہی اگر مشکل میں ہے

پہلے میں مشکل میں تھا اس بے مروت کے طفیل
اور، اب میرے سبب سے سارا گھر مشکل میں ہے

تھوڑی آسانی بھی پہنچی تھی محبت کو بہم
لیکن اب کچھ روز سے بار دگر مشکل میں ہے

اس تن آسانِ تغافل کو یہ کیا پروا کہ دل
کتنی آسائش میں تھا، اور، کس قدر مشکل میں ہے

بات ابھی کچھ بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود
میں یہاں الجھن میں ہوں اور وہ ادھر مشکل میں ہے

اس سے مل کر اور بھی ویران ہو جائے گا دل
سامنا ہونے سے پہلے ہی نظر مشکل میں ہے

کچھ ہوا حیران کر جاتی ہے اس کو بار بار
اور، کچھ بار ثمر سے بھی شجر مشکل میں ہے

سخت مشکل میں مجھے ڈالا تو ہے اس نے مگر
شاید اب وہ آپ بھی توفیق بھر مشکل میں ہے

مار ڈالے گی، محبت ہو کہ مہنگائی، ظفر
زندگی دونوں کے ہاتھوں سربسر مشکل میں ہے

☆

جو نہ آیا مرے بلانے سے
آئے گا اب کسی بہانے سے

اک نئی شے وجود میں آئی
خاک اور خواب کو ملانے سے

دھن اسی کی ہے رات دن مجھ کو
جو ہے باہر مرے نشانے سے

اب کہاں جائیے کہ شوقِ وصال
اور ظاہر ہوا چھپانے سے

کاش میں بھی کبھی نکل سکتا
خواہشوں کے نگار خانے سے

آگ باہر کہیں لگی ہے، مگر
دھواں اُٹھتا ہے آشیانے سے

خوف نے کر دیا مجھے قائم
جڑ پکڑتا ہوں تھرتھرانے سے

جسم کی روشنی بحال ہوئی
روح کی بتیاں بجھانے سے

شک، ظفرؔ، شام کی طرح اُترا
آسمانوں کے شامیانے سے

☆

رنگ جمانا بھی ہے، رنگ اُڑانا بھی ہے
زندہ بھی رہنا ہے، اور، جان سے جانا بھی ہے

اتنا تامل ہے پھر چہرہ دکھانے سے کیوں
ایک دن اُس نے اگر سامنے آنا بھی ہے

گھیر تو رکھا بھی ہے چاروں طرف سے اُسے
اس دلِ وحشی سے اب اُس کو بچانا بھی ہے

کرنی ہے اُس کے لیے انجمن آرائی بھی
اور کہیں سے اُسے ڈھونڈ کے لانا بھی ہے

گہرے سمندر میں ہے کشتیِ خوابِ وصال
اس کو ڈبونا بھی ہے، پار لگانا بھی ہے

دوست اگر ہے تو وہ، دشمن اگر ہے تو وہ
اُس کو گرانا بھی ہے، اور، اُٹھانا بھی ہے

جسم کی چادر تھی ایک، وہ بھی سلامت نہیں
اوڑھنا بھی ہے جسے، اور، بچھانا بھی ہے

زندگی جیسی بھی ہے کرنی تو ہو گی بسر
ٹوٹ کے رونا بھی ہے، جھوم کے گانا بھی ہے

دہری مصیبت ہے یہ رازِ محبت، ظفرؔ
اُس کو بتانا بھی ہے، اُس سے چھپانا بھی ہے

☆

دیکھا نہ ہم نے ، اور ، تماشے لگے رہے
لفظوں کے جوڑ توڑ میں ایسے لگے رہے

باہر نکل سکے نہ کبھی اپنی حد سے ہم
دریا کے دونوں سمت کنارے لگے رہے

دل پر تنی رہی کسی وہم و گماں کی دھوپ
سر میں خیال و خواب کے خیمے لگے رہے

کچھ اور کام بھی رہے درپیش جن دنوں
اپنے لہو میں آپ کے میلے لگے رہے

گملوں میں خواہشات کے پیلے، سیہ گلاب
جیسے کبھی لگائے تھے، ویسے لگے رہے

تھے اور ہی کسی کے تعاقب میں آپ تو
اور ، ہم فضول آپ کے پیچھے لگے رہے

اک مصلحت نے ساتھ ہمارے کیا تمھیں
ایسے ہی ساتھ ہم بھی تمھارے لگے رہے

روکا کسی نے بھی نہ تمھیں سارے شہر میں
اور، تم بھی اپنے کام میں اچھے لگے رہے

اک ربطِ خاص پھر بھی رہا عمر بھر، ظفر
کہنے کو درمیان میں پردے لگے رہے

-☆-

خبر کو خواب سے عاری نہ کرنا
ہوا پر حرف کو بھاری نہ کرنا

ڈبو دیں گے تمھیں اک دن اُسی میں
نیا چشمہ کوئی جاری نہ کرنا

مخالف بھی نہ ہونا بے شک اُس کے
مگر ، اُس کی طرف داری نہ کرنا

ابھی کچھ ہونے والا ہے ، خبردار
ابھی سونے کی تیاری نہ کرنا

محبت واجبی اچھی ہے ، اے دل!
اِسے اعصاب پر طاری نہ کرنا

اگر وہ زور و زر سے بھی نہ مانے
تو اُس کے سامنے زاری نہ کرنا

بہت نیکی ہے کافی اس قدر بھی
کبھی چوری ، کبھی یاری نہ کرنا

بھلے انکار ہی کر دو ، مگر تم
ہمارے ساتھ ہشیاری نہ کرنا

ظفر ، شاعر ہوں درباری ، سو مجھ کو
بہت مشکل ہے سرکاری نہ کرنا

-☆-

بالآخر کسی گھاٹ اُترنا تو ہے
جو کرنا نہیں ہے سو بھرنا تو ہے

صدا ہم نے کرنی نہیں بھی اگر
ترے راستوں سے گزرنا تو ہے

بکھرتے بکھرتے سمٹ لیں ذرا
سمٹتے سمٹتے بکھرنا تو ہے

ضرورت نہیں شاعری کی، مگر
کوئی کام ہم نے بھی کرنا تو ہے

غلط کام کرتے ہیں، اور، ساتھ ساتھ
غلط کام کرنے سے ڈرنا تو ہے

بہت یاد آتی ہے اُس کی تو کیا
بہت جلد اُس نے بسرنا تو ہے

بہت دھوپ کاٹی ہے، اے خوابِ دل
کسی چھاؤں میں اب ٹھہرنا تو ہے

یہ اعزاز ہوتا ہے کس کو نصیب
کہ یہ ڈوبنا ہی اُبھرنا تو ہے

اِسی پر نہ کیوں مر مٹیں، اے ظفرؔ!
کہ آخر کسی روز مرنا تو ہے

☆

چھوٹی موٹی کوئی تدبیر تو کر سکتے تھے
اور اگر کچھ نہیں، تاخیر تو کر سکتے تھے

بات کرنے سے اگر روک رکھا تھا اُس نے
ہم اسی بات پہ تقریر تو کر سکتے تھے

دوسروں کو بھی کوئی فائدہ ہوتا جن سے
اُن خیالات کی تشہیر تو کر سکتے تھے

کام آتا جو کبھی بے سر و سامانی میں
ہم کسی خواب کو تصویر تو کر سکتے تھے

نہ سہی اور کسی پر تو اجارہ اپنا
دلِ دیوانہ کو زنجیر تو کر سکتے تھے

اُس میں رہتے کہ نہ رہتے، یہ الگ بات ہے اب
گھر ہم اپنے لیے تعمیر تو کر سکتے تھے

کم نہ تھی اپنے لیے خاک تماشا بھی یہاں
ہم کم از کم اسے اکسیر تو کر سکتے تھے

پھر بھلا ہم اُسے کیا کرتے، کہاں لے جاتے
ورنہ اُس حُسن کو تسخیر تو کر سکتے تھے

ہم اگر قید نہ کر پائے قفس میں تو، ظفرؔ
اُس کو دیوار پہ تحریر تو کر سکتے تھے

☆

جینا ہے نہ مجھ کو مرنا ہے
کام اور ہی کوئی کرنا ہے

اس خواب سراب سفر میں اب
رُکنا ہے کہیں نہ ٹھہرنا ہے

مَیں خاک ہُوں کس ویرانے کی
مجھے کہاں پہنچ کے بکھرنا ہے

کچھ بھی معلوم نہیں کہ مجھے
ابھی مِٹنا ہے کہ اُبھرنا ہے

ابھی کالک چڑھنی ہے دل پہ
ابھی چہرہ اور نکھرنا ہے

کرنے سے بھلا ڈرنا کیسا
جب اور کسی کو بھرنا ہے

ہُوں لطفِ سخن سے دُور ابھی
اُس کو چھو کر بھی مُڑنا ہے

سب لکھتا جاتا ہُوں، مَیں نے
کل جن باتوں سے مکرنا ہے

لے ڈوبیں گے غم کو بھی، ظفر
ایسے ہی پار اُترنا ہے

☆

اس کی نہیں ہے فکر کہ عقبیٰ خراب ہے
فی الحال تو ظفر مری دُنیا خراب ہے

حق تو یہ ہے کہ آپ سمجھتے ہیں جس قدر
حالت ہماری اُس سے زیادہ خراب ہے

پہلے بھی تھا بہت، سو، مزید آپ نے کیا
دُہرا خراب یہ دلِ خانہ خراب ہے

جس دن سے ٹھیک ٹھاک ہے وہ دُشمنوں کے ساتھ
اُس روز سے ہی کام ہمارا خراب ہے

انکارِ وصل ہونا تھا اپنے خلافِ طبع
لیکن مزاج اُس کا ہی اُلٹا خراب ہے

آب و ہوائے دل نہیں اس بار سازگار
یا پھر وہی زمینِ تمنا خراب ہے

اس کا ہی فیصلہ نہیں کر پائے آج تک
آنکھوں میں ہے کسر کہ تماشا خراب ہے

کوئی تو بات ہے جو مچھیرے ہیں دربدر
مچھلی نہیں درُست کہ دریا خراب ہے

ہم خود خراب ہیں تو ہمارے لیے، ظفر
ساری خدائی، سارا زمانہ خراب ہے

☆

رہ گئی ہے شبِ سفر کچھ اور
ابھی ہونا ہے دربدر کچھ اور

ہم بھی خود کو بدل رہے ہیں مگر
نکل آیا وہی اگر کچھ اور

ہم لگائیں گے اور اندازہ
اُس کو پائیں گے سربسر کچھ اور

بادۂ بادِ ہجر سے پہنچا
شیشۂ شام کو ضرر کچھ اور

یوں تو کافی ہے یہ بھی دل کے لیے
تھرتھری چاہیے مگر کچھ اور

ہِل گئی اور جب خبر اپنی
ہو گئے خود سے بے خبر کچھ اور

شاعری ٹھیک ٹھاک ہے یہ بھی
ہاں ، اگر ڈالتے ہنر کچھ اور

رائے سب کی بہت بجا ، لیکن
اپنا ہے نقطۂ نظر کچھ اور

اپنا مقصد تو اور کچھ تھا ، ظفر
اور ، اُس پہ ہوا اثر کچھ اور

☆

خوابِ فراغت مشکل ہے
اور ، نہایت مشکل ہے

کبھی قیام نہیں آساں
کبھی مسافت مشکل ہے

دل کو اندازہ ہی نہیں
جتنی مہلت مشکل ہے

آئینہ بے آب ہوا
یعنی حیرت مشکل ہے

جتنی سوچی تھی ہم نے
اُتنی قربت مشکل ہے

نفرت کر نہیں سکتے ہم
اور ، محبت مشکل ہے

چومیں گے اُن ہاتھوں کو
لیکن ، بیعت مشکل ہے

شہر تو ہے مفتوح ، مگر
مالِ غنیمت مشکل ہے

جو بھی میسّر ہے سو ، ظفر
اُس پہ قناعت مشکل ہے

☆

یہ عمر ہے تو پھر اس کو بسر بھی کرنا ہے
قیام کرنے سے پہلے سفر بھی کرنا ہے

کچھ احتراز بھی کرنا ہے اس گلی سے ہمیں
کسی بہانے اُدھر سے گزر بھی کرنا ہے

کسی قدر ہمیں خود بھی تو کر سکے قائل
وہ بات جس نے کسی پر اثر بھی کرنا ہے

ابھی سے تھکنے لگا ہے یہ کیا رگوں میں لہو
ابھی تو میں نے اسے دربدر بھی کرنا ہے

اس اعتبار پہ شک ہے مجھے، سو، اب میں نے
کچھ اپنے آپ کو نامعتبر بھی کرنا ہے

زیادہ طول پکڑنے لگی ہے بات، سو، اب
کسی طرح سے اسے مختصر بھی کرنا ہے

یہ لفظ ہی تو مری کائنات ہیں ساری
یہ لفظ جن کو اِدھر سے اُدھر بھی کرنا ہے

ہم اپنی بات کو خود بھی سمجھ نہ پائیں کبھی
یہی بجا ہے، سو، اب یہ ہنر بھی کرنا ہے

ہزار اس سے تسلی بھی ہو چکی ہو، ظفر
وہ کام آپ نے بار دگر بھی کرنا ہے

☆

لکھیے تو غزل، ہو جیسی بھی
کبھی ایسی بھی، کبھی ویسی بھی

مضمون کوئی باندھیں گے نیا
مضمون کی ایسی تیسی بھی

کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے
کچھ آپ کی کاسہ لیسی بھی

مہلت جو ملے تو دیر نہ کر
ہو کتنی بھی اور کیسی بھی

موجود تو ہو گی اِدھر اُدھر
کہیں کھوئی ہوئی کسی شے سی بھی

اس طرح بھی ہو گا حال اپنا
کبھی نوبت آئے گی ایسی بھی

ہے جسم کے بندی خانے میں
اک چیز لپکتی لے سی بھی

نکلے بھی نہیں مسافت پر
لگتی ہے بظاہر طے سی بھی

فاقے سے ظفر، جھوم اٹھتا ہوں
مستی ہے یہ مستی مے سی بھی

☆

جواب اُس نے دیا ہے ملال کرتے ہُوئے
مجھے بھی شرم نہ آئی سوال کرتے ہُوئے

بچا نہ شیشۂ دل دستِ بُرد سے اُس کی
رکھا تھا اس کو بہت دیکھ بھال کرتے ہُوئے

جو عمر کٹ نہ سکی اُس کی بات بھی کرنا
وہاں پہ تذکرۂ ماہ و سال کرتے ہُوئے

قصور میرا بھی اس میں بتا رہا تھا بہت
جو شرمسار تھا میرا یہ حال کرتے ہُوئے

گلہ گزارِ شبِ ہجر ہوں کبھی کروٹ
کبھی شکایتِ شامِ وصال کرتے ہُوئے

کہیں کیے ہُوئے شوقِ فضول کی تحسین
کبھی ستائشِ قولِ محال کرتے ہُوئے

مَیں رنگ باندھ رہا تھا ہوا کی لہروں پہ
مَیں خواب دیکھ رہا تھا خیال کرتے ہُوئے

مَیں فکر مند نہ تھا اپنے آپ سے کہ مری
زوال پر بھی نظر تھی کمال کرتے ہُوئے

لڑائی ہے تو پھر اب صلح کس لیے کہ ظفرؔ
گزر ہی جائے گی جنگ و جدال کرتے ہُوئے

☆

مرنے والے مر جاتے ہیں
دُنیا خالی کر جاتے ہیں

روکتے روکتے، دیکھتے دیکھتے
خواب سے لوگ بکھر جاتے ہیں

آتے ہیں ہر روز کہاں سے
اور، یہ لوگ کدھر جاتے ہیں

دُنیا کو للکارنے والے
اپنے سایے سے ڈر جاتے ہیں

چڑھتے دن کے ساتھ ہی گویا
کُچھ دریا سے اُتر جاتے ہیں

رہتے ہیں باقی بھی وہاں پر
جہاں سے آپ گزر جاتے ہیں

ہو نقصان جدھر جانے سے
ہم تو اُدھر اکثر جاتے ہیں

دل سے گزرتے جاتے موسم
کبھی کبھار ٹھہر جاتے ہیں

وہ بھی، ظفرؔ مصروف بہت ہے
ہم بھی اپنے گھر جاتے ہیں

☆

اور یہ جو سر پہ سب کے چمکتا ہے آسماں
شیشے کی طرح ٹوٹ بھی سکتا ہے آسماں

ہونے کو آئی ہجرتِ آدم کو ایک عمر
چشمِ زمیں میں اب بھی کھٹکتا ہے آسماں

کس چرخِ نیلگوں کا تماشا ہے خاک پر
کس گردِ کارواں میں بھٹکتا ہے آسماں

بے منظری ہی خاک کی قسمت ہے آج کل
کیا چشمِ آفتاب سے تکتا ہے آسماں

کس کی ہوس میں رات لبالب تھا اس طرح
جس طرح کوئی دم میں چھلکتا ہے آسماں

چھایا ہوا مرے ہی دلِ زار پر نہیں
اس چشمِ ناز میں بھی جھلکتا ہے آسماں

اس خاک کے خمار میں جب ڈوبتا ہے دل
میری طرف کچھ اور بہکتا ہے آسماں

بادِ خزاں سے الجھا ہوا خواب خواب چاند
اک پھول ہے کہ جس سے مہکتا ہے آسماں

تارے سے دل میں ٹوٹتے رہتے ہیں، اے ظفر
اور، ساری ساری رات دھڑکتا ہے آسماں

☆

ایسے ہے کہ جیسے گھر میں ہونا
مشکل ہے بہت سفر میں ہونا

ہونا ہے نہ ہونے کے برابر
ایسا ہے نمِ نظر میں ہونا

ممکن ہوا کتنی مدتوں بعد
اڑتی ہوئی اک خبر میں ہونا

مصروف کبھی نہیں تھے اتنے
دن رات ہی ایک ڈر میں ہونا

اک مرحلہ چھوڑنا ہے پیچھے
صد مرحلۂ دگر میں ہونا

ہونے ہی کا ہے کرشمہ، اے دل
شبنم میں کبھی شرر میں ہونا

کب تک یونہی گردباد بن کر
کس کے لیے دشت و در میں ہونا

کم کم ہی رہا نصیب ہم کو
حیرت کدۂ ہنر میں ہونا

نکلو بھی ظفر، فسوں سے اس کے
اپنے بھی کبھی اثر میں ہونا

☆

حال کیسا ہے، وہ سب جانتا ہے
اور، کیوں کر ہے، سبب جانتا ہے

جانتا ہے وہ بہت پہلے سے
ہم تو سمجھے تھے کہ اب جانتا ہے

کیسی تکلیف میں ہیں اُس کے بغیر
اور، کتنی ہے طلب، جانتا ہے

ہم تو سُنتے تھے کہ جب عشق میں لوگ
خاک ہو جاتے ہیں، تب جانتا ہے

جا کے اب اُس کو جتانا کیسا
صُورتِ حال وہ جب جانتا ہے

دُور رہتا ہے خسِ خواب سے وہ
اثرِ شعلۂ لب جانتا ہے

طبع ہی اُس کی ہے ایسی، ورنہ
سبھی آداب و ادب جانتا ہے

اُس کے وعدے پہ بہت خُوش نہ پھرو
وہ مُکرنے کا بھی ڈھب جانتا ہے

زور سے اُس کو جتایا ہے، ظفر
ورنہ اِس طرح وہ کب جانتا ہے

☆

شام بھی، اور، سبک سیر خیالات اُس کے
دامنِ دل کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ اُس کے

چار سُو اُڑتی ہوئی ریگِ بیاباں سی کبھی
کبھی تا حدِ نظر پھیلتے باغات اُس کے

کہیں تحلیل سا ہوتا ہُوا اک خیمۂ خواب
کسی گہرائی میں گرتے ہوئے ذرّات اُس کے

نفی وہ کرتا چلا جائے گا خُود ہی اپنی
بنتے مٹتے ہوئے دیکھو گے نشانات اُس کے

اور سے اور ہُوا جاتا ہے مطلب اُن کا
کچھ سمجھ میں نہیں آتے ہیں اشارات اُس کے

شہر کی شکل ہی بدلی نظر آتی ہے کہ اب
اور ہی طرح بسر ہوتے ہیں دن رات اُس کے

مَیں اُسی موڑ پہ حیران کھڑا ہوں اب تک
اور، ہر روز بدلتے ہیں بیانات اُس کے

پیچ کھائی ہے جو بینائی تو اب سوچتا ہوں
قابلِ دید بہت ہوں گے مقامات اُس کے

دھوپ اُس کی ہے، ظفر، اور، ہوائیں اُس کی
اور، یہ ابر، یہ موسم، یہ مضافات اُس کے

☆

دل اگر اتنی مصیبت میں نہیں
یہ بھی مت سمجھو محبت میں نہیں

آئنہ مانوس ہے اس سے بہت
اس لیے اتنا بھی حیرت میں نہیں

وہم سا وہ بھی کہیں موجود ہے
میں بھی ہوں، لیکن، حقیقت میں نہیں

آج کل وہ بھی بہت مصروف ہے
کچھ دنوں سے ہم بھی فرصت میں نہیں

وہ بھی شرمندہ نہیں ہے اس قدر
میں بھی اب اتنی ندامت میں نہیں

یہ سبق سیکھا ہے اس کے عشق سے
فائدہ کچھ بھی شرافت میں نہیں

اتفاقاً ہی کیا کرتا ہوں میں
چاپلوسی میری عادت میں نہیں

شاعری کی نقل اتارا کیجیے
اصل تو اب اپنی قسمت میں نہیں

یوں افاقہ بھی نہیں دل کو، ظفر
لیکن، اگلی سی بھی حالت میں نہیں

-☆-

شاد کیسا ہو گیا، آباد کیسا ہو گیا
دور رہ کر مجھ سے وہ آزاد کیسا ہو گیا

میں کہ جو اک عمر سے پروا نہ رکھتا تھا بہت
دو ہی دن میں مائلِ فریاد کیسا ہو گیا

اس کے جانے سے اثر پڑتا تھا پہلے بھی بہت
شہر، لیکن، اس دفعہ برباد کیسا ہو گیا

مدتوں کے بعد مل کر خوش نہ تھا اتنا بھی وہ
میں بھی اس کو دیکھ کر ناشاد کیسا ہو گیا

اس کی ترکیبِ تغافل معتبر تھی کس قدر
اور، اپنا عشق بے بنیاد کیسا ہو گیا

کیا بدل کر رکھ دیا اظہارِ الفت نے اسے
پہلے وہ کیسا تھا اس کے بعد کیسا ہو گیا

میں نے اس کو دل میں دہرایا تھا بس دو ایک بار
اور، وہ سارے کا سارا یاد کیسا ہو گیا

میں نے مارے تو بہت شعر و ادب میں ہاتھ پانو
کچھ نہ بن پایا تو پھر نقاد کیسا ہو گیا

دیکھ لو، تھوڑی سی کوشش سے ہمارا بھی، ظفر
نام اس فہرست میں ایزاد کیسا ہو گیا

-☆-

قرض معاف بھی کرتا تھا
اور، انصاف بھی کرتا تھا

ظلم ضروری تھا، لیکن
لطف الطاف بھی کرتا تھا

سیدھی سچی کے ہمراہ
لاف گزاف بھی کرتا تھا

کہیں بچھاتا تھا خود کو
کہیں لحاف بھی کرتا تھا

ہو رہتا تھا موافق بھی
کام خلاف بھی کرتا تھا

کنجوسی کے ساتھ ہی ساتھ
کچھ اسراف بھی کرتا تھا

چوم کے چھوڑ آئے دیوار
کوئی شگاف بھی کرتا تھا

رہتا تھا ناراض بھی کچھ
رستہ صاف بھی کرتا تھا

سرکش بھی رہتا تھا، ظفر
اور، طواف بھی کرتا تھا

-☆-

سوچ کر لکھنا ہے، اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
اس ارادے پر سراسر سوچتا رہتا ہوں میں

گھر سے باہر فکر رہتی ہے مجھے گھر کی بہت
گھر میں ہوتا ہوں تو باہر سوچتا رہتا ہوں میں

یونہی موجوں کے مخالف چل نکلتا ہوں کہیں
اور، کبھی دریا کے رُخ پر سوچتا رہتا ہوں میں

پیاس کا گرداب سا رہتا ہے میرے چار سُو
خواب صحرا ہوں، سمندر سوچتا رہتا ہوں میں

کیا کہوں ہر روز کیوں موجِ ہوائے صبح سے
پھول سا کھلتا ہوں، پتھر سوچتا رہتا ہوں میں

اُس کو باہر سے تو ہے میری شرافت کا یقیں
کیا خبر اُس کو جو اندر سوچتا رہتا ہوں میں

فائدے کے کام ہی دُنیا میں ہیں اتنے اگر
رائیگاں پھر کیوں برابر سوچتا رہتا ہوں میں

دُوسرے اپنے سے باہر کیوں نہ سمجھیں گے مجھے
دُوسروں سے بھی تو ہٹ کر سوچتا رہتا ہوں میں

یعنی بھر پایا ہوں اندر کی خموشی سے ظفر
اس لیے اب شورِ محشر سوچتا رہتا ہوں میں

-☆-

نئی اس پر ہمیں اب خوش گمانی کون سی ہے
کبھی اس نے ہماری بات مانی کون سی ہے

ہمیں جلنا بھی ہے تو بس نہ ملنے کے برابر
سوائے اس کے اپنی سرگرانی کون سی ہے

محبت کا جواب اس نے محبت سے دیا تو
یہ اس کا فرض بھی تھا، مہربانی کون سی ہے

ابھی کیوں کر ملے گا گوہرِ مقصود ہم کو
ابھی ہم نے وہاں کی خاک چھانی کون سی ہے

یہ طغیانِ محبت ہی تو ہے اصل حقیقت
بڑھاپا کس طرف کا ہے، جوانی کون سی ہے

بہت ہم نے بھی دیکھا ہے یہ ناٹک زندگی کا
سبھی کردار ہیں اس میں، کہانی کون سی ہے

روانی ہے تو پانی سے الگ کر کے دکھاؤ
یہ پانی ہے تو پھر اس میں روانی کون سی ہے

جو رہتا ہے وہ ہر دم اپنے بندوں کے دلوں میں
تو پھر اس لامکاں کی لامکانی کون سی ہے

ظفرؔ یہ تو بتاؤ، شاعری اس کم نما سے
چھپائی کون سی ہے، اور، دکھائی کون سی ہے

☆

جو یہاں گفتگو ہو گئی ہے
پھر وہی کوبکو ہو گئی ہے

پہلے کچھ مختلف تھی جو خواہش
دیکھنا! ہوبہو ہو گئی ہے

صرف دل میں تھی پہلے محبت
اب مرے چار سُو ہو گئی ہے

بے خبر وہ بھی ہے، اور، میں بھی
کوئی شے آرزو ہو گئی ہے

سات پردوں میں خوش تھی اگر وہ
کس لیے رُوبرُو ہو گئی ہے

کچھ نتیجہ تو نکلے گا آخر
جنگ اب دُوبدُو ہو گئی ہے

چلتی رُکتی وہ موجِ ملامت
کچھ دنوں سے لہو ہو گئی ہے

اب تو کھولیں کوئی در، دریچہ
بے دلی اب تو خُو ہو گئی ہے

ڈھونڈنے کیا چلے تھے، ظفرؔ ہم
کیا سے کیا جستجو ہو گئی ہے

☆

کچھ سروکار کسی کو نہیں، اے دل میرے
کہ کھلے پھرتے ہیں کیوں شہر میں قاتل میرے

حسرتیں اتنا تقاضا بھی نہیں کرتی ہیں
دست بستہ ہی کھڑے رہتے ہیں سائل میرے

سب خبر رکھتے ہیں، کس حال میں ہوں کیسا ہوں
اتنے غافل بھی نہیں رہتے ہیں غافل میرے

وار چھپ کر ہی کیے جو بھی کیے ہیں اُس نے
کبھی آتا تو سہی وہ بھی مقابل میرے

دیکھتے دیکھتے اتنا ہُوا جاتا ہوں مُحال
خُود سے بھی طے نہیں ہوتے ہیں مراحل میرے

میں تو سو جاتا ہوں تھک ہار کے پانی سا، مگر
رات بھر جاگتے ہی رہتے ہیں ساحل میرے

رُک نہ سکتا تھا، سو، چلتا گیا دُھن میں اپنی
کبھی آگے، کبھی پیچھے رہی منزل میرے

کس لیے آئے تھے، اور، کون سی حالت میں ہیں اب
پھڑپھڑاتے ہُوئے شاخوں میں عنادل میرے

یہ وہ سچ ہے کہ، ظفر، بعد میں ثابت ہو گا
کیا ہے، فی الحال جو دعوے ہُوئے باطل میرے

☆

منزل الگ تراشی، رستہ الگ بنایا
پھر ڈوبنے کو ہم نے دریا الگ بنایا

تسخیر جس جہاں کی مطلوب تھی، سو پہلے
خُود ہم نے اُس جہاں کا نقشہ الگ بنایا

کھیتی الگ اُگائی آنکھوں کی سرزمیں سے
اور، دل کے آسماں پر تارا الگ بنایا

بھولے نہ اصل اپنی اس کیمیا گری میں
مٹی جُدا چھپائی، سونا الگ بنایا

تصویر کے تقاضے سب کر دیے ہیں پُورے
پانی سے دُور ہٹ کر پیاسا الگ بنایا

تنہائی چھا گئی تو محفل سجائی اپنی
وحشت ہُوئی تو ہم نے صحرا الگ بنایا

خانوں میں کر دیا جب تقسیم دل کو ہم نے
اُس کا الگ بنایا، اپنا الگ بنایا

مشترکہ بھی بنائے تعمیر کے عجوبے
ویسا نہ بن سکا پھر جیسا الگ بنایا

جیسے تھے خُود، ظفر، وہ ویسے ہی بن گئے ہم
عزت بہت کمائی، پیسا الگ بنایا

☆

اندر سے رواں رکھتا ہے مجھے
اِک خواب جواں رکھتا ہے مجھے

کچھ وقت کو آنکھیں ہوتا ہوں
کچھ دیر زباں رکھتا ہے مجھے

کبھی دُھول ہی دُھول ہوں چاروں طرف
کبھی دُھواں دُھواں رکھتا ہے مجھے

رکھنے کا جواز تو ہو کوئی
بے سُود و زیاں رکھتا ہے مجھے

اکثر جہاں خُود ہوتا نہیں وہ
اکثر ہی وہاں رکھتا ہے مجھے

کبھی آ کے مکیں تو ہُوا ہی نہیں
کہنے کو مکاں رکھتا ہے مجھے

دیکھیں ! اب اور کہاں تک وہ
بے نام و نشاں رکھتا ہے مجھے

لائق ہُوں کہاں رکھنے کے ، مگر
ظالم ہے ، کہاں رکھتا ہے مجھے

رہنا ہے تو کہنا کیا ہے ، ظفرؔ
رہتا ہوں ، جہاں رکھتا ہے مجھے

-☆-

گزرنا پڑا سرسراتے ہوئے
نیا کوئی نقشہ جماتے ہوئے

کسی اور تصویر کے شوق میں
کوئی اور منظر دکھاتے ہوئے

کسی اور الزام کی دُھن میں ہُوں
کوئی اور تُہمت اُٹھاتے ہوئے

یہاں سے نکل جاؤں گا ایک دن
کہیں اور دُھومیں مچاتے ہوئے

فضا میں بکھر جاؤں گا ٹُوٹ کر
کہیں دُور سے جھلملاتے ہوئے

اب اِتنا بھی خُود پر بھروسا نہیں
جو رونے ہی لگ جاؤں گاتے ہوئے

مجھے بھی ذرا پُوچھ لیتا ہے وہ
بس آتے ہوئے اور جاتے ہوئے

ندامت کے ساحل پہ اُتریں گے ہم
محبت کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے

خُوش اِخلاق تھا ، اُس نے اِنکار بھی
کیا ہے ، ظفرؔ ، مُسکراتے ہوئے

-☆-

شیشۂ جاں پہ ذرا سا ہی ضرر لے جائے
ہم سے ملتا ہے سو اتنا تو اثر لے جائے

شاید اس بار نتائج ہوں کوئی اور ، اگر
اپنی محفل میں ہمیں بارِ دگر لے جائے

مجھے دے جائے وہ اک لمحۂ خوں گشتۂ خواب
اور مجھ سے یہ مرے شام و سحر لے جائے

راستے ہی میں کیے بیٹھا ہوں اب کے تو قیام
کوئی آ کر مرا سامانِ سفر لے جائے

یوں ہی بے سمت نکل پڑتا ہے دوبارہ کہیں
اس سے پہلے کہ مجھے راہگزر لے جائے

لے کے جائیں گے جہاں تک مجھے یہ عیب کبھی
غیر ممکن ہے وہاں میرا ہنر لے جائے

شہر میں کوئی اگر ہے مرا ہوتا سوتا
راستہ بھول گیا ہوں ، مجھے گھر لے جائے

منتظر پھرتا ہوں جس موجِ ملاقات کا میں
اگر آئے بھی تو کیا جانے کدھر لے جائے

اب تو میں آپ بھی تیار ہوں جانے کو ، ظفر
آخری عمر کا یہ عشق جدھر لے جائے

-☆-

تھا دل میں زرِ خواب تو اظہار ہی کرتے
پیدا کہیں کچھ گرمیِ بازار ہی کرتے

بیٹھے تھے فراغت سے تو رکھتے اسے جاری
کرنا تھا سو یہ کام لگاتار ہی کرتے

ڈرتے ہی رہے ڈوب نہ جائیں کہیں ، ورنہ
دریائے تماشا تھا ، اُسے پار ہی کرتے

تھا بندہ بشر وہ بھی ، کہیں مان ہی جاتا
لوٹ آنے سے بہتر تھا کہ اصرار ہی کرتے

یہ تنگیِ دل ایک طرف تو کہیں لگتی
وہ کھُل کے مرے سامنے انکار ہی کرتے

وہ شوخ تو مصروفِ محبت تھا کہیں اور
ہم عشق جو کرتے بھی تو بیکار ہی کرتے

دُنیا سے تو ہم نے کبھی حق بھی نہیں مانگا
یہ کام جو کرتے بھی تو ناچار ہی کرتے

خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں ، دیکھو
اس کھیل میں ورنہ کوئی کردار ہی کرتے

اس دل سے ظفر کام تو لیتے کوئی ہم بھی
در ہو نہیں سکتا ہے تو دیوار ہی کرتے

-☆-

مدت سے کوئی میرے بھی جیسا نہیں آیا
میں یونہی تو منظر پہ دوبارہ نہیں آیا

باقی ابھی کتنا ہے بدی کا یہ سمندر
ہوں کب سے رواں ، اور ، کنارہ نہیں آیا

موسم کئی گزرے ہیں کہ اس پردۂ دل پر
بازو نہیں لہرائے ہیں ، چہرہ نہیں آیا

نکلے تھے یہ کس اندھے اندھیرے کے سفر پر
آنکھیں تو پلٹ آئیں ، تماشا نہیں آیا

کہتے ہیں کہ پانی ابھی گزرا نہیں سر سے
سیلاب ابھی شہر میں اتنا نہیں آیا

ہے کیسی مسافت کہ مری راہ میں اکثر
دیوار تو آئی ہے ، دریچہ نہیں آیا

ہم بھی وہیں پھرتے رہے اطراف میں اس کے
البتہ ملاقات کا موقع نہیں آیا

یہ طرفہ لطیفہ ہے کہ اس آگ میں ہم کو
چلنا نہیں آیا کبھی رکنا نہیں آیا

لوگوں میں ظفر آپ زباں ساز بھی کہلائے
اور ، بات بھی کرنے کا سلیقہ نہیں آیا

☆

بیٹھا مغز نہ چاٹا کر
اٹھ ! اور ، سیر سپاٹا کر

بات بھی مانا کر کوئی
یونہی رعب نہ چھانٹا کر

مطلب دونوں کا ہے ایک
گھاٹا کھا ، یا گھاٹا کر

نیفے سے پستول نکال
محفل میں سناٹا کر

آٹے سے روٹی پکوا
پھر ، روٹی کو آٹا کر

لمبی تان کے سو جا ، اور
سسکی کو خراٹا کر

مار بھی کھا ، ہنستا بھی جا
ہاتھ چلا ، اور ، ٹاٹا کر

ہاتھ باندھ پیچھے کی طرف
آگے اپنا کاٹا کر

آزادی اچھی ہے ، ظفر
تھوڑی قید بھی کاٹا کر

☆

[illegible]
گھوم آئے ہیں کیا کلکتہ بھی

لرزاں رہے بوٹا بوٹا ہم
اُڑتے پھرے پتا پتا بھی

نیچے ہے فرش کے اور اک فرش
چھت کے اُوپر پڑچھتا بھی

اِک حرف کی ادلا بدلی نے
تنہا سے کیا ہے نہتا بھی

کچھ جلد کی اپنی فکر کریں
اب تو نکل آیا ستا بھی

حصہ رکھتا ہے بھات میں جو
لیتا ہے وہ ہم سے بھتا بھی

لکھا ہوا پڑھ نہ سکو میرا
اِتنا تو نہیں بدخطا بھی

سب الفاظ استعمال ہوئے
'لیکن' بھی اور 'البتہ' بھی

اس کھینچا تانی میں ہی ظفر
اُترے کہیں کپڑا لتا بھی

☆

کچھ تو آزادانہ اس بستی میں بسنا چاہیے
کھل کے رونا چاہیے، جی بھر کے ہنسنا چاہیے

سوچتے ہیں، کیوں نہ کیجے اور بھی کچھ انتظار
صبر کے پھل کو ابھی کچھ اور رسنا چاہیے

سرپرستی بھی ہو تھوڑی سرزنش کے ساتھ ساتھ
جو گرجتے ہیں، انھیں کچھ تو برسنا چاہیے

آڑے آ جاتی نہ ہو اپنی شرافت ہی اگر
خود ہمیں معلوم ہے، ایسوں کو اسنا چاہیے

راہ چلتوں سے غرض ہم بھی نہیں رکھتے مگر
کوئی دم پر پانو رکھتا ہے تو ڈسنا چاہیے

عام ہے مضمون، اس کو خاص کرنا ہے ذرا
مصرعہ ہے ڈھیلا ڈھالا، اس کو کسنا چاہیے

سطح سے نیچے تو ہیں لیکن، زیادہ بھی نہیں
اس زمینِ شعر میں کچھ اور دھنسنا چاہیے

ایک بوسے کی طلب ہے، سو بھی لوٹا دیں گے ہم
یعنی کچھ اس بدگماں سے قرضِ حسنہ چاہیے

دل میں ہمت ہو تو گردابِ محبت سے ظفر
خود نکلنا چاہیے، اور، خود ہی پھنسنا چاہیے

☆

جتنے بھی قرینے ہیں جھجکنے کے بہت ہیں
عنوان اُسے دیکھ نہ سکنے کے بہت ہیں

خاموش نہ ہو جائے سُلگتی ہُوئی یہ شام
پیرائے بظاہر تو بھڑکنے کے بہت ہیں

بُجھتا ہُوا دل ، یہ مرا ٹوٹا ہُوا تارا
امکان ابھی اس کے چمکنے کے بہت ہیں

موسم کئی بے تاب ہیں کھِلنے کے ہر اک سمت
منظر ابھی آنکھوں میں جھلکنے کے بہت ہیں

جھونکے سے خیالات میں رُکنے کے نہیں اب
پتّے سے ہواؤں میں کھڑکنے کے بہت ہیں

سُورج سے لپکنے کو ہیں رُخسار یہ رُخسار
مہتاب سے ماتھوں پہ دمکنے کے بہت ہیں

وافر ہیں ابھی لفظ لرزنے کو لبوں پہ
سینوں میں سوالات بھٹکنے کے بہت ہیں

رنگت ابھی باقی ہے محبت کی لہو پہ
اسباب ابھی دل کے دھڑکنے کے بہت ہیں

مایُوس نہ ہونا ظفر اِس خوابِ خزاں سے
یہ باغ کوئی دن میں مہکنے کے بہت ہیں

☆

فغاں بھی وہ ہے کہ جو خود فغاں سے باہر ہے
کہ میرا ذکر تری داستاں سے باہر ہے

یہ ربط خاص کوئی مُعجزہ ہی تھا ، ورنہ
ترا ستارہ مرے آسماں سے باہر ہے

دلِ گرفتہ کی بابت وہ کچھ تو بتلاتا
کہ امتحاں میں ہے یا امتحاں سے باہر ہے

بُرا بھلا مرے دل کا مکیں ہُوا تو سہی
سو، کچھ مکاں میں ہے، اور، کچھ مکاں سے باہر ہے

کھِلا ہے چاروں طرف زرد حیرتوں کا چمن
خزاں کی ساری خرابی خزاں سے باہر ہے

اگر یہی روشِ برق و باد ہے ، تو وُہی
بچا رہے گا کہ جو آشیاں سے باہر ہے

مرا سُراغ یہاں ڈھونڈنے سے کیا حاصل
مری خبر کہیں اس خاکداں سے باہر ہے

سخن سرائی تھی مُمکن سو ہم نے کر ڈالی
کہ شاعری تو سراسر بیاں سے باہر ہے

کہاں سے ہو گی ظفر کے نصیب میں منزل
کہ بے مُہار ہے ، اور ، کارواں سے باہر ہے

☆

دل فسردہ جو اتنا خبر سے خالی ہے
مسافری میں ہے، لیکن سفر سے خالی ہے

یہ ممکنات سے باہر نہیں، مگر فی الحال
یہ خاک زار تری رہگزر سے خالی ہے

کبھی کبھی کا غنیمت ہے دیکھنا بھی ترا
اگرچہ یہ بھی بظاہر نظر سے خالی ہے

ہمارے جامِ طلب کا معاملہ ہے عجب
کہ یہ ابھی سے نہیں، عمر بھر سے خالی ہے

کچھ اس میں رنگ ریا کی رمق نہیں شامل
بیاں اسی لیے اپنا اثر سے خالی ہے

ہمارے نامۂ اعمال میں لکھا ہو گا
ہرا بھرا یہ شجر کیوں ثمر سے خالی ہے

یہ کن ہواؤں سے معمور ہیں مرے شب و روز
اگر یہ سارا بیاباں خطر سے خالی ہے

میں اب تو چاہے بھٹک بھی کہیں نہیں سکتا
کہ میری راہ غبارِ ہنر سے خالی ہے

فریب خوردۂ ظاہر ہیں اہلِ دل، ورنہ
میں وہ صدف ہوں، ظفر، جو گہر سے خالی ہے

☆

زمیں تھمی ہوئی ہے، اور، ستارے رُک گئے ہیں
یہ کیسی رات ہے، سارے کے سارے رُک گئے ہیں

تماشائے سفر جاری ہے گویا خواب در خواب
تھکے ہارے قدم لیکن ہمارے رُک گئے ہیں

کسی صورت کہیں جل بجھ سکیں بار دگر ہم
اگر اس راکھ سے اُڑتے شرارے رُک گئے ہیں

ہماری سرزمیں سمتیں ہی کھو بیٹھی ہے اپنی
ہمارے آسمانوں کے اشارے رُک گئے ہیں

ہوا حیران ہو کر تھم گئی ہے باغ در باغ
مہکتے موسموں کے سبز دھارے رُک گئے ہیں

زمیں پر سو گئی ہیں بہتے بہتے میری ندیاں
فلک پر چلتے چلتے میرے پیارے رُک گئے ہیں

ہمیں رُکنا نہیں تھا اس مسافت میں کہیں پر
یہ کیا دیوار تھی جس کے سہارے رُک گئے ہیں

روانی سے زیادہ روشنی تھی راستوں پر
اب آ کر شامِ غربت کے کنارے رُک گئے ہیں

یہ خاکِ خشک پیاسی ہی پڑی رہ جائے شاید
ظفر، لگتا ہے، سب دریا تمھارے رُک گئے ہیں

☆

چلو، جتنا بھی بوڑھا ہو گیا ہوں
میں پہلے سے تو اچھا ہو گیا ہوں

نہیں تھا میں تو بس کچھ بھی نہیں تھا
ہوا ہوں تو سراپا ہو گیا ہوں

کہا کرتا ہوں سیدھی بات، لیکن
میں خود تھوڑا سا ٹیڑھا ہو گیا ہوں

نظر آتا نہیں اُس کے سوا کچھ
بڑی حد تک تو اندھا ہو گیا ہوں

مری اک سمت گم ہے کچھ دنوں سے
سو لگتا ہے، تکونا ہو گیا ہوں

مجھے تو ہار ہی جانا ہے پھر بھی
بھلے نہلے پہ دہلا ہو گیا ہوں

محبت کے لیے خود آیئے گا
کہ میں اندر سے لنگڑا ہو گیا ہوں

ہوا کیا چل پڑی اندر ہی اندر
کہ میں جس سے لرزتا ہو گیا ہوں

کچھ ایسی بے حسابی ہو گئی پھر
جو بیٹھے بیٹھے آدھا ہو گیا ہوں

وہاں پر بیٹھ بھی سکتا کبھی کاش
جہاں میں آتا جاتا ہو گیا ہوں

مجھے اب خود بھی شرم آنے لگی ہے
میں رفتہ رفتہ ایسا ہو گیا ہوں

حریفوں نے نکالے ہیں مرے بَل
سو، گز کی طرح سیدھا ہو گیا ہوں

مجھے اصلاح راس آئی نہیں کچھ
تو میں پہلے ہی جیسا ہو گیا ہوں

زمانے نے مجھے ڈالی نہیں گھاس
تو میں خود ہی زمانہ ہو گیا ہوں

زمیں نے عکس کیا ڈالا ہے مجھ پر
یہ میں کیسا سنہرا ہو گیا ہوں

اضافہ اور اب کیا کیجیے گا
میں پہلے ہی زیادہ ہو گیا ہوں

مجھے اِکہرا نہ سمجھو، زندگی پر
میں ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا ہوں

یہ درجے بھی تو ہیں سب میرے اپنے
اگر اعلیٰ سے ادنیٰ ہو گیا ہوں

نشانہ باندھتے ہی باندھتے میں
کہیں خود ہی نشانہ ہو گیا ہوں

کناروں سے اُچھلنے کی ہوس میں
خُمارِ خواب دریا ہو گیا ہوں

الگ سب سے نظر آنے کی خاطر
اُجالے میں اندھیرا ہو گیا ہوں

اُجڑنے کی کسر باقی ہے اب تو
میں اتنا ہنستا بستا ہو گیا ہوں

میں کیوں اس خانۂ خاموش میں پھر
فضول اک شور و غوغا ہو گیا ہوں

ابھی تو میری کاوش ہے بس اتنی
کہ میں دُنیا میں پیدا ہو گیا ہوں

مجھے ضد اپنے دُشمن سے ہے اتنی
وہ سیدھا ہے تو آڑا ہو گیا ہوں

میں ایسا ہو سکا اب تک نہ ویسا
جبھی تو ایسا ویسا ہو گیا ہوں

میں باہر سے تو لاغر تھا ہی پہلے
اب اندر سے بھی دُبلا ہو گیا ہوں

مجھے نابود کر کے جب گیا وہ
اُسی لمحے دوبارہ ہو گیا ہوں

ہمیشہ آخری رہتا ہوں سب میں
مگر، اِس بار پہلا ہو گیا ہوں

ہوائے تازہ ہے موجِ ہوس بھی
سو، مرتے مرتے زندہ ہو گیا ہوں

جو بدلا ہے مرے اندر کا موسم
تو پتھر سے پرندہ ہو گیا ہوں

زیادہ اور کیا ہونا ہے مجھ کو
یہی کافی ہے جتنا ہو گیا ہوں

گرے گی ایک دن مجھ پر ہی آخر
میں وہ دیوار دُنیا ہو گیا ہوں

مجھے غسّال ہی نہلائیں دھلوائیں
بہت میلا کُچیلا ہو گیا ہوں

سو، مُنھ جاتا ہوں اپنے آپ کو ہی
میں کہنے کو تو کانٹا ہو گیا ہوں

ابھی مصروف تھا آہ و فُغاں میں
ابھی گاتا بجاتا ہو گیا ہوں

میں سیدھا چل رہا تھا اُس کی جانب
ابھی تھوڑا سا ترچھا ہو گیا ہوں

شرافت آڑے آجاتی ہے آخر
کھُلا عاشق تھا، خُفیہ ہو گیا ہوں

ابھی مرکز تو ہو سکتا نہیں میں
محبت کا کنارہ ہو گیا ہوں

اُنھیں میں ہضم تو کیا ہو سکوں گا
گلے میں بھی اٹکا ہو گیا ہوں

تن تنہا کوئی سچ بول کر میں
بھری محفل میں جھوٹا ہو گیا ہوں

مجھے پھیلائے آ کر دھوپ میں کون
کہ بیٹھے بیٹھے گیلا ہو گیا ہوں

کبھی ہوتا تھا کچھ دن کے لیے میں
مگر، اب تو ہمیشہ ہو گیا ہوں

لہو پیتا ہوں، سر کھاتا ہوں اپنا
بہت ہی کھاتا پیتا ہو گیا ہوں

وہ کھیلیں مجھ سے، لیکن بچ بچا کر
بظاہر تو کھلونا ہو گیا ہوں

اب اس کا فیصلہ بھی آپ فرمائیں
نہیں ہوں اب بھی میں یا ہو گیا ہوں

یہ کیا پلوا دیا ہے شربتِ شوق
جو پی کر اور پیاسا ہو گیا ہوں

بھلا یہ پھول ہیں کن موسموں کے
یہ کس رنگت کا سبزہ ہو گیا ہوں

نیا ہونے کی نوبت ہی نہ آئی
میں پہلے ہی پُرانا ہو گیا ہوں

لُٹا کر دین و دُنیا، اُس کی چالیں
سمجھتا ہوں، سیانا ہو گیا ہوں

منائیں خیر کاروبار کی سب
اگر میں کرتا دھرتا ہو گیا ہوں

تھکا ہارا ہے، کچھ آرام کر لے
اسی خاطر بچھونا ہو گیا ہوں

ندیدہ تھا فقط پہلے، مگر، اب
حقیقت ہے کہ بھوکا ہو گیا ہوں

یہ تبدیلی بھی مجھ میں آئی ہو گی
کھرا تھا، اور، کھوٹا ہو گیا ہوں

کوئی شے مجھ سے سِوا ہو گئی کیا
جو میں پہلے سے تھوڑا ہو گیا ہوں

جواب اُس کا تھا گرما گرم اتنا
جبھی تو سُن کے ٹھنڈا ہو گیا ہوں

سمٹنے کی سہولت بھی تھی، لیکن
بکھرنے کا بہانہ ہو گیا ہوں

جہاں رُوپوش ہونا تھا ضروری
وہیں کھل کر ہویدا ہو گیا ہوں

مجھے وہ ساتھ لے کر چل پڑے ہیں
مگر، میں اور تنہا ہو گیا ہوں

تو، اس میں آپ کا نقصان کیا ہے
اگر تھوڑا سا گھٹیا ہو گیا ہوں

ابھی تک تو پتا چلتا نہیں کچھ
میں سُورج ہوں کہ سایہ ہو گیا ہوں

میں پہلے بھی نہیں تھا سیدھا سادہ
مگر اب اور کھچرا ہو گیا ہوں

ترنم سے غزل پڑھتا ہوں اب تو
خدا رکھے گویّا ہو گیا ہوں

غنیمت ہے کہ میں اس حال میں بھی
ہُوا ہوں جیسا تیسا ہو گیا ہوں

اگر بڑھ چڑھ گیا ہے میرا دشمن
تو میں بھی چھوٹا موٹا ہو گیا ہوں

اُسے سیدھا تو کر پایا ہوں، لیکن
میں خود بھی اُلٹا پلٹا ہو گیا ہوں

مجھے بچہ سمجھتے ہیں ابھی وہ
میں حال آں کہ چو بچہ ہو گیا ہوں

گزارہ تو مرا ہوتا رہے گا
بس اک تھوڑا سا چھوٹا ہو گیا ہوں

عجب ہلچل مچی رہتی ہے مجھ میں
جو سچ پوچھو تو گدلا ہو گیا ہوں

میں اُس کی نوکری کرتا ہوں دن رات
مزہ یہ ہے کہ پکا ہو گیا ہوں

کہیں وہ بھی نہ آ شامل ہُوا ہو
مجھے لگتا ہے دُگنا ہو گیا ہوں

اُدھر حیرت زدہ وہ ہے سراسر
اِدھر میں ہکا بکا ہو گیا ہوں

میں بادل کا برسنا ہو نہ پایا
تو بجلی کا چمکنا ہو گیا ہوں

میں اپنی خامکاری میں بہرحال
بڑی حد تک تو پختہ ہو گیا ہوں

گھٹنا بجنے لگا ہوں کچھ دنوں سے
مجھے لگتا ہے تھوتھا ہو گیا ہوں

مجھے اب تولنا اور ناپنا کیا
میں کب کا اونا پونا ہو گیا ہوں

یہ ہونا سخت مشکل تھا بہرحال
مگر، میں گرتا پڑتا ہو گیا ہوں

میں جب ہونے پہ آیا ہوں کسی دم
تو ہر سُو بے تحاشا ہو گیا ہوں

میں سیدھا رہ نہیں سکتا کسی طور
برابر رُخ بدلتا ہو گیا ہوں

سمندر سے ہے میرا بھائی چارہ
کہ میں پانی کا مٹکا ہو گیا ہوں

لہو نے رنگ بدلا ہے اچانک
میں چلتے چلتے نیلا ہو گیا ہوں

ہُوا ہے جتنا عزت میں اضافہ
میں اُتنا ہی کمینہ ہو گیا ہوں

جہاں تفصیل کے طالب تھے احباب
وہاں پر میں خلاصہ ہو گیا ہوں

سمجھ پاتے نہیں عاقل بھی جس کو
میں اک ایسا اشارہ ہو گیا ہوں

میں غائب ہو چکا ہوں کافی حد تک
جو بچ نکلا بقایا ہو گیا ہوں

جہاں پر تیز رفتاری تھی مطلوب
وہاں، دیکھو تو، کچھوا ہو گیا ہوں

کیا تھا کام کوئی چھپ چھپا کر
زمانے بھر میں رُسوا ہو گیا ہُوں

اگر ویسا نہ ہو پایا کسی طور
تو اُس سے مِلتا جُلتا ہو گیا ہُوں

مَیں اُس سے پُوچھ کر ہوتا ہُوں اب تو
یہ مت سمجھو کہ بے جا ہو گیا ہُوں

اگر خُود جا نہیں سکتا وہاں پر
تو اُس کے گھر کا رستہ ہو گیا ہُوں

کشش کیا رہ گئی ہو گی کہ آخر
بہُت کُچھ دیکھا بھالا ہو گیا ہُوں

ہوا کا خیر مقدم تھا ضروری
سو، خُود ہی پُرزہ پُرزہ ہو گیا ہُوں

غرور اوقات ہو جاتی ہے اچھی
مَیں جب سے خواب پیشہ ہو گیا ہُوں

اگر وہ ہو چُکا ہے ٹُوٹا ٹُوٹا
تو مَیں بھی پٹا پٹا ہو گیا ہُوں

کبھی قسطوں میں ہوتا ہُوں بمُشکل
کبھی سارے کا سارا ہو گیا ہُوں

مرے ہونے کی صُورت ہی نہ تھی کُچھ
مگر، مَیں ہوتا ہوتا ہو گیا ہُوں

سرِ دست اِس کو ہی منظور کیجے
مَیں جو کُچھ واں ولیا ہو گیا ہُوں

نہیں سُنتا ہُوں مطلب کی بھی گر بات
تو مَیں بالکل ہی بہرا ہو گیا ہُوں

مری منزل نہیں ہے کوئی، بس مَیں
کسی جانب روانہ ہو گیا ہُوں

مُجھے جب کوئی بھی کرتا نہیں پیار
سو، مَیں اللہ کو پیارا ہو گیا ہُوں

نہیں ہے جس کے ٹل جانے کا امکان
یہاں ایک ایسا خطرہ ہو گیا ہُوں

کسی چہرے پہ بکھرا دُھول بن کر
کسی دامن پہ دھبّا ہو گیا ہُوں

مُجھے تُلوا کے لے جاتے نہیں کیوں
کہ اب تو اور سستا ہو گیا ہُوں

کُچھ اپنا ذائقہ وہ بھی تو بدلیں
کہ بے شک مَیں بھی کڑوا ہو گیا ہُوں

بُرائی اور نیکی بجھ گئے ہیں
کہ میں دونوں کا ناکا ہو گیا ہوں

بہا لے جاؤں گا خود کو بھی اک دن
میں وہ مُنھ زور چشمہ ہو گیا ہوں

مجھے قابو میں لانا ہی پڑے گا
بہت آفت کا ٹکڑا ہو گیا ہوں

اُتار آیا ہوں میں بارِ شرافت
سو، کیسا ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں

مسائل سب مرے حل ہو گئے ہیں
میں جب بھی دست بستہ ہو گیا ہوں

نہیں تھا جرم تو میرا کچھ اتنا
میں جتنا خوار و خستہ ہو گیا ہوں

ظفر، کیسا میں ہونا چاہتا تھا
مگر، دیکھو تو، کیسا ہو گیا ہوں

☆

زمین ڈھونڈتے ہیں آسمان کے نیچے
ذرا بھی سایہ نہیں سائبان کے نیچے

وہ اک دُکان پہ حیران رہ گیا، ورنہ
دُکان اور بھی تھی اک، دُکان کے نیچے

نگاہ رُکتی ہے جا کر نشان پر سب کی
ہے کاروبار تو سارا نشان کے نیچے

اُسی کا ردِعمل ہے مچان کے اندر
ہُوا جو واقعہ اُس دن مچان کے نیچے

کسی بھی لمحے مرا انہدام ہے ممکن
دبا ہے زلزلہ کوئی مکان کے نیچے

کھلے گی اور ابھی میری اصلیت کیا کیا
رہوں گا اور ابھی امتحان کے نیچے

شکست و فتح میں وہ بھی شریک ہے آخر
کہ میں تو لڑتا ہوں اُس کی کمان کے نیچے

تلاش کرتا رہا درمیاں میں وہ، اور میں
پڑا ہُوا تھا کہیں درمیان کے نیچے

مکر بھی سکتا ہوں میں صاف شاعری سے، ظفر
کہ دستخط ہی نہیں ہیں بیان کے نیچے

☆

لمبی تان کے سونا ہے
ہو جائے جو ہونا ہے

پڑے رہتے ہیں سُن کر ہم
اُس کی بات کھلونا ہے

کیسے موسم میں ہم نے
کیسا پھول پرونا ہے

چمکانا ہے دروازہ
دیواروں کو دھونا ہے

آخر کیا کہنے کے لیے
لفظ لہو میں بھگونا ہے

کیا لکھنے کے لیے قلم
رُوح کے بیچ ڈبونا ہے

ذہنوں کی زرخیزی میں
ایک خواب سا بونا ہے

سوچا نہیں کہ اب کی بار
کیا کِس شے میں سونا ہے

دل کو ہے منظور، ظفر
مٹی ہے یا سونا ہے

-☆-

اگر اس کھیل میں اب وہ بھی شامل ہونے والا ہے
تو اپنا کام پہلے سے بھی مُشکل ہونے والا ہے

ہوا شاخوں میں رُکنے اور اُلجھنے کو ہے اس لمحے
گزرتے بادلوں میں چاند حائل ہونے والا ہے

اثر اب اور کیا ہونا تھا اُس جانِ تغافل پر
جو پہلے بیش و کم تھا وہ بھی زائل ہونے والا ہے

زیادہ ناز اب کیا کیجیے جوشِ جوانی پر
کہ یہ طوفاں بھی رفتہ رفتہ ساحل ہونے والا ہے

ہمیں سے کوئی کوشش ہو نہ پائی کارگر، ورنہ
ہر اک ناقص یہاں کا پیرِ کامل ہونے والا ہے

حقیقت میں بہت کچھ کھونے والے ہیں یہ سادہ دل
جو یہ سمجھے ہوئے ہیں اُن کو حاصل ہونے والا ہے

ہمارے حال مستوں کو خبر ہونے سے پہلے ہی
یہاں پر اور ہی کچھ رنگِ محفل ہونے والا ہے

چلو! اس مرحلے پر ہی کوئی تدبیر کر دیکھو
وگرنہ شہر میں پانی تو داخل ہونے والا ہے

ظفر، کچھ اور ہی اب شعبدہ دکھلایئے، ورنہ
یہ دعوائے سخن دانی تو باطل ہونے والا ہے

-☆-

نکل سکیں ہم اگر شبِ ماہ سے کچھ آگے
سفر پڑا ہے ابھی سحرگاہ سے کچھ آگے

کڑی ہی غائب ہو جیسے دونوں کے درمیاں کی
ہوا کی سلوٹ بھی ہے پرِکاہ سے کچھ آگے

رہے کبھی غم، کبھی خوشی کے اسیر ہم تو
دیا دکھائی نہ آہ اور واہ سے کچھ آگے

صفائی پانی کی یوں تو مطلوب ہے سبھی کو
معاملہ ہے، مگر، تہِ چاہ سے کچھ آگے

کچھ ایسے رل مل گئی گرانی میں سرگرانی
کہ سوچنا پڑ گیا ہے تنخواہ سے کچھ آگے

خبر رسانی میں بس سے پیچھے تھے ہم، کہ اپنی
کوئی کہانی گئی نہ افواہ سے کچھ آگے

اگر نہ حل ہو سکا یہیں مسئلہ ہمارا
تو جائیں گے ہم خوشامدِ شاہ سے کچھ آگے

بشر کی حد ہی نہ پار کر پائے زندگی بھر
تلاش کرنے چلے جو اللہ سے کچھ آگے

ظفر، غزل میں مچائیں دھومیں تو ہم نے، لیکن
نہ جا سکے اس گھسی پٹی راہ سے کچھ آگے

-☆-

غلط کام کا ہے نتیجہ صحیح
کچھ اندازہ اپنا ہی نکلا صحیح

گیا راہ میں ہی کہیں ٹوٹ پھوٹ
یہ دل آپ تک تو پہنچتا صحیح

حساب آپ ہی اب لگایا کریں
ہے کتنا غلط، اور، کتنا صحیح

تماشائی سر پیٹتے رہ گئے
لگایا نہ ہم نے تماشا صحیح

جب اُس کا اشارہ ہی مشکوک تھا
تو پھر میں بھی کیسے سمجھتا صحیح

وہ آتے ہی جانے کی جلدی میں تھا
نہ دم بھر مرے پاس بیٹھا صحیح

یہی کام ہونا تھا سارا خراب
جو ہوتا نہ اپنا طریقہ صحیح

بگڑنے کا امکان ہی اب کہاں
ہمیں کر دیا اُس نے ایسا صحیح

ہمارے ہی پیچھے پڑے ہو، ظفر
کوئی کام وہ بھی تو کرتا صحیح

-☆-

لہرو لہر اُچھلتا دن
چڑھا ہُوا تھا دریا دن

سارے وقت ہیں گڈ مڈ سے
کیسی رات اور کیسا دن

ساتھ ساتھ چل سکتے کاش
ٹیڑھی کھیر اور سیدھا دن

صبح سے ڈرتا بیٹھا ہُوں
ٹُوٹ نہ جائے کچّا دن

کئی دِنوں سے لگتا ہے
پُورا دن بھی اَدھورا دن

رنگ اُتر جائیں گے سب
رہ جائے گا جھوٹا دن

بال کی کھال نکل آئی
گھوم رہا ہے گنجا دن

شام سے پہلے ٹیلے پہ
کھانس رہا تھا بُوڑھا دن

پہنچوں گا کس طور، ظفر
اِتنا پچھلا پُرانا دن

-☆-

بجھا ہے رنگِ دل، اور، خوابِ ہستی کربلا ہے
کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، یہ کیسی کربلا ہے

سروں تک آ گیا آبِ فراتِ خوف، دیکھو!
جو پیاسوں کو ڈبو دے گی، یہ ایسی کربلا ہے

وہی خنجر ہے پیوستِ گلو خیمہ بہ خیمہ
وہی میرے ہزاروں سمت پھیلی کربلا ہے

وہی تیرِ تغافل سب کے سینے میں ترازو
وہی کوچہ بہ کوچہ دیکھی بھالی کربلا ہے

اگر سوچو تو چلتا آ رہا ہے اک تسلسل
اگر سمجھو تو یہ پہلے ہی جیسی کربلا ہے

ازل سے حق پرستوں کے ہیں ایسے ہی شب و روز
نہ کوئی آخری ہے، اور، نہ پہلی کربلا ہے

اُنھیں تو خیر چھو کر بھی نہیں گزری، کہ یہ تو
ہماری کربلا ہے، اور، تُمھاری کربلا ہے

وہی قاتل وہی مقتول بھی ہیں، لیکن اب کے
محمدؐ کے جگر گوشے سے خالی کربلا ہے

عزاداری میں شامل تو سبھی ہوتے ہیں، لیکن
ظفر، جس پر گزر جائے اُسی کی کربلا ہے

-☆-

ہمارا کچھ نہیں ہے، اور، تمھارا کچھ نہیں ہے
کہیں ہے بھی اگر کچھ تو دوبارہ کچھ نہیں ہے

زمیں ظاہر نہیں کرتی یہاں اپنے خزانے
کسی نے آسمانوں سے اُتارا کچھ نہیں ہے

بنالیں اس نہ ہونے سے کوئی ہونے کی صورت
سوائے اس کے اپنے پاس چارہ کچھ نہیں ہے

وُہی ہے خواب دل سے خواب دُنیا تک اندھیرا
سو، پردے میں ہے سب کچھ، آشکارا کچھ نہیں ہے

کھلی رکھتا بھی ہوں آنکھیں تو ہے بے سُود وہ بھی
کہ خالی کیفیت ہے، اور، نظارا کچھ نہیں ہے

اگر یہ کر سکو تو کچھ نہ کرنے میں سراسر
مُنافع ہی مُنافع ہے، خسارہ کچھ نہیں ہے

نہیں پہنچا کوئی نقصان اُس کو بھی کچھ ایسا
نئے اس کھیل میں ہم نے بھی ہارا کچھ نہیں ہے

جھمیلے اور بھی دل کو لگا رکھے ہیں، لیکن
ہمیں اُس جانِ رُسوائی سے پیارا کچھ نہیں ہے

ظفر، خُوش ہو لیا کرتے ہیں اُس کو دیکھ کر ہم
وگرنہ اور تو مقصد ہمارا کچھ نہیں ہے

☆

یادِ حسینؑ اب جو منانے کو رہ گئی
اِک رسم سی ہمارے نبھانے کو رہ گئی

اُس کا سبق تو ہم سے فراموش ہو چکا
بس داستاں ہی اُس کی سُنانے کو رہ گئی

کرنا تھا جس گھڑی حق و باطل میں امتیاز
وہ کیفیت بھی رونے رُلانے کو رہ گئی

ہم ایک دُوسرے کے ہی کاٹا کیے گلے
رُسوائی ایک یہ بھی اُٹھانے کو رہ گئی

کیا چیز کھو گئی تھی سرِ دشتِ کربلا
جس کی تلاش ایک زمانے کو رہ گئی

وہ بے مثال تھا، مگر، اُس شخص کی مثال
گاہے بگاہے بزم سجانے کو رہ گئی

اِک لفظ ہے کہ خُود پہ ہی روشن نہیں ہُوا
اِک بات ہے کہ سب سے چھپانے کو رہ گئی

ہم اُن کو ناپسند ہیں، وہ ہم کو ناگوار
دیوار ایک یہ بھی گرانے کو رہ گئی

اِک خواب دیکھنے کے لیے رہ گیا، ظفر
اور، ایک پیاس جیسے بُجھانے کو رہ گئی

☆

تماشا دیکھتے رہنا نہیں ہے
یہ جھگڑا دیکھتے رہنا نہیں ہے

ادا کرنا ہے اب کردار بھی کچھ
کہ تنہا دیکھتے رہنا نہیں ہے

کنارے تک پہنچنا بھی ہے آخر
کنارہ دیکھتے رہنا نہیں ہے

بہت اس کے علاوہ بھی ہے ممکن
لہٰذا دیکھتے رہنا نہیں ہے

ہم اُس میں ڈوب جائیں گے کسی دن
وہ دریا دیکھتے رہنا نہیں ہے

پکڑ کر روک بھی لینا ہے اُس کو
ہمیشہ دیکھتے رہنا نہیں ہے

ہے اس میں ٹوٹتے رہنا بھی شامل
یہ دنیا دیکھتے رہنا نہیں ہے

بھرا ہی چھوڑ جانا ہے کسی دن
یہ میلا دیکھتے رہنا نہیں ہے

ظفرؔ، دیکھا کیے اب تک جو منظر
دوبارہ دیکھتے رہنا نہیں ہے

-☆-

جتنا گھٹتے جاتا ہے
اُس نے چھنٹتے جاتا ہے

تُس سے مَس تو کیا ہونا
ٹلتے ملتے جاتا ہے

اپنی راہ نکالیں کیا
رستے رستے جاتا ہے

اُوپر آنے کے دوران
نیچے دھنستے جاتا ہے

ڈھیلے ڈھالے لوگوں پر
فقرے کستے جاتا ہے

لاکھ اُجاڑو بستی کو
اِس نے بستے جاتا ہے

دیکھتے رہنا ہے اُس کو
اور، ترستے جاتا ہے

کبھی گرجتا ہے خالی
کبھی برستے جاتا ہے

تھا کس کو معلوم، ظفرؔ
اِتنا سستے جاتا ہے

-☆-

آگے کیا اور پیچھے کیا
اوپر کیا ، اور ، نیچے کیا

رہی خزاں ہی ساری عمر
لگواتے باغیچے کیا

سیلانی کے سامنے ہیں
در ، دالان ، دریچے کیا

اٹھو ! اور ، دُنیا دیکھو
پڑے ہو آنکھیں میچے کیا

آتا ہے اُس کا معلوم
بچھوائیں غالیچے کیا

ہو جائے جو ہونا ہے
کھچوائیں زائچے کیا

آپ ہے باراں دیدہ وہ
چڑھے ہمارے ٹیچے کیا

نیت ہی جب صاف نہیں
گلے لگا کر بھینچے کیا

پانی ہے پایاب ، ظفر
اُڑسے ہو پائینچے کیا

☆

ہم ہیں جدھر اُسے بھی اُدھر ہونا چاہیے
پہلے سے ہے تو بارِ دگر ہونا چاہیے

منزل جدھر کہیں نہیں ، تفریح کے لیے
تھوڑا سا اُس طرف بھی سفر ہونا چاہیے

صورت اگر ہے ایسی ہی ویسی تو کم سے کم
کوئی زبان میں تو اثر ہونا چاہیے

وہ فتنہ خُو ہم ایسے شریفوں کی بزم میں
موجود تو نہیں ہے ، مگر ، ہونا چاہیے

البتہ اختلاف بہت ہے دماغ کو
دل تو اُسی طرف ہے جدھر ہونا چاہیے

پوچھا کہ ہونا چاہیے کیا بندوبست وصل
کہنے لگے کہ آپ کا سر ہونا چاہیے

ہونا نہ چاہیے تو کسی کی ہے کیا مجال
ہے کس کو اعتراض اگر ہونا چاہیے

چل دوں کبھی تو میں بھی جسے چھوڑ چھاڑ کر
میرا بھی تو کہیں کوئی گھر ہونا چاہیے

بنتا ہے شہر یار ہمارا وہی ، ظفر
دراصل جس کو شہر بدر ہونا چاہیے

☆

عداوت سب سے رکھتا ہوں کہ یہ منظور ہے میرا
نشانِ منزلِ مقصود کتنی دور ہے میرا

میں اپنی بات پر خود بھی کبھی رہتا نہیں قائم
سو، جیسا بھی ہے، یہ انداز تو مشہور ہے میرا

بہت ممکن ہے پھر سے آندھیوں کی زد میں آ جائے
وگرنہ اس برس بھی ٹہنیوں پر بُور ہے میرا

میں اپنے معجزے کی خود وضاحت کیا کروں آخر
کہ یہ میری روایت ہے نہ یہ دستور ہے میرا

مسافت پر نکلنے کا ابھی سوچا ہی تھا میں نے
جو دیکھا تو بدن سارا تھکن سے چُور ہے میرا

سبھی کے سامنے ہے، صورتِ حالات جو بھی ہے
لب خاموش ہیں اُس کے، دلِ رنجور ہے میرا

مسائل اپنے اپنے تھے، ضرورت اپنی اپنی تھی
نہ میں ممنون ہوں اُس کا، نہ وہ مشکور ہے میرا

کہیں پر بھی کوئی اب میری گنجائش نہیں باقی
زمیں مشکل میں ہے، اور، آسماں مجبور ہے میرا

ظفر، تعمیر ایسی کر رہا ہوں خوابِ ہستی کی
کہ جس میں بادشاہِ وقت خود مزدور ہے میرا

☆

لہو آپے سے باہر ہو رہا ہے
بدن سارا ہی ابتر ہو رہا ہے

جو برسوں میں ہوا کرتا تھا پہلے
یہاں برسوں سے اکثر ہو رہا ہے

جو پہلے ہو چکا ہے شہر کے ساتھ
وہی کچھ بار دیگر ہو رہا ہے

مسلسل آ رہا ہے دیکھنے میں
کئی دن سے برابر ہو رہا ہے

سمجھ میں ہی نہیں آتا کسی کی
یہ کیسے، اور، کیوں کر ہو رہا ہے

اسی پر بس نہیں، اے چشمِ حیراں
یہ ہنگامہ تو گھر گھر ہو رہا ہے

مری اپنی بھی ہیں مجبوریاں کچھ
اثر جیسا بھی مجھ پر ہو رہا ہے

نظر بھی آئے، کچھ محسوس بھی ہو
اگر پہلے سے بہتر ہو رہا ہے

ظفر، باہر بھی آئے گا کسی دن
جو یہ اندر ہی اندر ہو رہا ہے

☆

پسِ نگاہ ، کبھی رُوبرُو لرزتا ہے
ہوا کی لہر پہ کیا کیا لہُو لرزتا ہے

خزاں کا خوف نہیں ، ہے یہ چیز ہی کوئی اور
جو صبح سے ہی گُلِ آرزُو لرزتا ہے

میں اتنی دیر کا جاگا ہُوا بھی ہوں ، لیکن
وہ عکسِ خواب ابھی سُو بہ سُو لرزتا ہے

وہ لفظ کیا ہے کہ جس کی ادائی پر میری
زباں اٹکتی ہے اکثر ، گلُو لرزتا ہے

یہ زور کیسی توانائیوں کا ہے آخر
کہ تھرتھراتا ہوں میں ، اور ، تُو لرزتا ہے

ہماری کوئی تو بنیاد ڈھے چکی ہے جو اب
تمام سلسلۂ گفتگو لرزتا ہے

یہ طُرفگی ہے مرے اختیار سے باہر
جو زرد گھاس پہ نقشِ نمُو لرزتا ہے

دھنک سی ایک لپکتی ہے اور کھلی چھت پر
دُھواں سا کوئی سرِ آبجُو لرزتا ہے

وہ زلزلہ ابھی گزرا نہیں ادھر سے ، ظفرؔ
یہ شہر جس کے لیے کُو بہ کُو لرزتا ہے

☆

رُوح میں دیوار سی اُٹھتی ہے ، در کھلتا نہیں
کھُل بھی جائے تو کبھی بارِ دِگر کھلتا نہیں

دیر سے جنبش نہیں سنگِ سماعت میں کوئی
اور ، کسی صورت یہاں قُفلِ نظر کھلتا نہیں

کیا تماشا ہے کہ صبح و شام رازِ آسماں
خاک پر کھلتا ہے ، لیکن ، سر بسر کھلتا نہیں

بند ہی رہتا تھا اُس کے دل کا دروازہ کہ ہم
کھولتے تھے خود ہی اُس جانب جدھر کھلتا نہیں

کیا سفر طے ہو کہ دورانِ مسافت ہم سے تو
اپنا ہی باندھا ہُوا رختِ سفر کھلتا نہیں

اک حجابِ خواب سا درپیش رہتا ہے اُسے
ہم سے مِل لیتا بھی ہے اکثر ، مگر ، کھلتا نہیں

راستوں ہی میں بسر ہونے لگی ہے زندگی
بیت جاتے ہیں زمانے ، اور ، گھر کھلتا نہیں

کچھ بھی ہو سکتا ہے اِن سہمے ہُوئے لوگوں کے ساتھ
شہر پر چھایا ہُوا بادل اگر کھلتا نہیں

اور ہی صورت نکالی جائے کوئی ، اے ظفرؔ
سر بھی ٹکراتا ہوں ، اور بابِ ہُنر کھلتا نہیں

☆

بھی غبار، کسی دن دھواں دکھائی دیا
بہت دنوں میں مجھے آسمان دکھائی دیا

وہ چل چلاؤ تھا کیسا، کہ اُن دنوں مجھ کو
رُکا ہُوا بھی ہمیشہ رواں دکھائی دیا

مسافرت میں خلل بھی رہا اُسی کے طفیل
میں رُک گیا ہوں وہیں پر جہاں دکھائی دیا

وہی سرابِ خبر ہے، وہی فریبِ نظر
کہ جس کو دیکھا ہے وہ بھی کہاں دکھائی دیا

چلو، کچھ اُس کی توجہ اِدھر ہوئی تو سہی
وہ اب کی بار بہت بدگماں دکھائی دیا

کھلی تو تھیں مری آنکھیں، مگر، نہ جانے کیوں
گزر گیا تو مجھے کارواں دکھائی دیا

وہ نقشِ ناز بھی ہوگا کہیں کہیں موجود
یہی بہت ہے جو اس کا نشاں دکھائی دیا

بیاں کا بوجھ ہی بنتا گیا ہے آخرِ کار
جو پہلے پہلے تو رنگِ بیاں دکھائی دیا

بڑھا چڑھا کے بتاتے تھے جس کا مول، ظفر
وہی ہنر ہمیں خود رائیگاں دکھائی دیا

-☆-

میرے دل میں محبت بہت ہے
اور، محبت میں طاقت بہت ہے

چاہتے تو زیادہ ہی تھے ہم
اس قدر بھی غنیمت بہت ہے

چومتے وہ ہمیں ہاتھ اپنے
ہم کو تم سے عقیدت بہت ہے

کتنا مشکل ہے خاموش رہنا
یعنی اِس میں بھی محنت بہت ہے

دشمنوں کی توجہ ہے اتنی
دوستوں کی عنایت بہت ہے

عشق خود کار ہے، اس لیے بھی
آج کل ہم کو فرصت بہت ہے

کام کرنے میں عظمت بھی ہوگی
لیکن، اس میں مصیبت بہت ہے

ہے شب و روز تحسین باہم
دوستوں میں مروّت بہت ہے

جانتے ہیں، ظفر، آپ کو ہم
شاعری کم ہے، شہرت بہت ہے

-☆-

بہت مشکل میں رہنا اور کبھی آسان ہو جانا
اگر کچھ بھی نہ ہو سکتا تو بس حیران ہو جانا

کسی طوفاں سے گھر جانا ہے جیسے شام پڑتے ہی
پھر اُس میں رفتہ رفتہ آپ بھی طوفان ہو جانا

کوئی دشمن نہیں، کوئی مخالف بھی نہیں، آخر
یہ کس سے لڑتے لڑتے اس طرح ہلکان ہو جانا

اُلٹ جانا بھی ہو اندر کا یہ موسم کسی لمحے
بہت آباد بھی ہوتے ہوئے ویران ہو جانا

سفر کی شرط ہی کرنی ہے پوری، جس طرح بھی ہو
سواری ہو نہیں سکتا تو پھر سامان ہو جانا

ہماری تو سمجھ میں ہی نہ آئے گا کسی صورت
یہ بے آباد گھر میں آپ کا مہمان ہو جانا

ہم اُس کے گھر کا حصہ ہی جو بن سکتے کسی حیلے
در و دیوار ہو رہنا، کبھی دالان ہو جانا

کبھی اس بھیڑ سے باہر نکل جانا بھی ہو ممکن
اکیلے بیٹھے بیٹھے اس قدر گنجان ہو جانا

ظفر، رکھنا تھا آواز و ہوا سے رابطہ کچھ تو
بہت اچھا نہیں لگتا ہے یوں سنسان ہو جانا

☆☆

کبھی یہ دیکھنا وہ خود لہو میں شامل ہے
کہ جس کا ذکر ابھی گفتگو میں شامل ہے

مَیں اُس کو معرکۂ دل سے کیا بچا سکتا
وہ اپنے آپ ہی اس دوبدو میں شامل ہے

کہاں کا رنگ ہے یہ راستوں پہ بکھرا ہوا
یہ کس کا عکس ابھی آب جو میں شامل ہے

ہوس پرست نہ کہنا ہمیں، بس اک یہ بھی
ہمارے سلسلۂ آرزو میں شامل ہے

مزہ تو یہ ہے، کوئی نام بھی نہیں اُس کا
وہ ایک شے جو ترے رنگ و بُو میں شامل ہے

کوئی سُراغ ہے میرے وجود میں موجود
نہ کوئی سمت مرے چار سُو میں شامل ہے

ہوائے شام کو فارغ نہ جانیے، یہ بھی
ہمارے ساتھ کسی جستجو میں شامل ہے

ہمارے شعر و سخن کی ہے بات بس اتنی
کہ اپنا شور بھی اس ہا و ہو میں شامل ہے

کچھ اپنے ساتھ نہیں خاص یہ سلوک اس کا
کمینگی تو، ظفر، اُس کی خو میں شامل ہے

☆☆

کچھ ابھی کھویا نہیں ہے، اور، برابر ڈھونڈتے ہیں
کوئی دُنیا ہے جسے دُنیا کے اندر ڈھونڈتے ہیں

جو انہی انجان گلیوں میں کہیں بچھڑا تھا ہم سے
آؤ! اُس کو شہر سے باہر نکل کر ڈھونڈتے ہیں

جستجوئے رنگِ رفتہ ہے سرِ خاکِ تماشا
نقش جو آنکھوں میں تھے اُن کو ہوا پر ڈھونڈتے ہیں

خواب سا آنکھوں میں رکھ کر اِک تلاشِ رائگاں کا
جو کہیں ہوتا نہیں ہے اُس کو اکثر ڈھونڈتے ہیں

کون سی آنکھوں سے کس کو دیکھنا ہے کس جگہ پر
طے ابھی کچھ بھی نہیں، لیکن، سراسر ڈھونڈتے ہیں

جو کہیں باہر ہے اُس کو کھوجتے ہیں جان و دل میں
جو چھپا بیٹھا ہے اندر، اُس کو باہر ڈھونڈتے ہیں

یہ وہ ہے بھی یا نہیں، شک سا ہے کوئی دل کے اندر
جس کو پایا ہے اُسی کو بار دیگر ڈھونڈتے ہیں

شہر سے جا بھی چکا دیوانہ اپنی بات کہہ کر
اور، یہ لڑکے ابھی سڑکوں پہ پتھر ڈھونڈتے ہیں

بارِ معنی سے جھکی شاخِ سخن ٹوٹی تھی کیسی
کیا وہ لمحہ تھا، ظفر، جس کو مکرر ڈھونڈتے ہیں

☆

پسِ الفاظ مطلب اور بھی ہے
بہت آگے بھی تھا، اب اور بھی ہے

سخن پیچیدہ پہلے ہی تھا اپنا
مگر، اب کے مُرتّب اور بھی ہے

اِسی پر بس نہیں، گر غور فرمائیں
ہماری بات بے ڈھب اور بھی ہے

اگر کافی نہیں جاں سے گزرنا
ہمارے پاس کرتب اور بھی ہے

بظاہر جو بھی کچھ ہے، اس کے باوصف
ہمارا دین و مذہب اور بھی ہے

کفایت کس لیے کرتے ہو اتنی
یہ کنجوسی ہے کیوں، جب اور بھی ہے

یہ خوابِ وصل ہے، دیکھیں گے پھر بھی
سحر ہے اور بھی، شب اور بھی ہے

کچھ اُس در کی فقیری کے علاوہ
سوالِ جاہ و منصب اور بھی ہے

لیا ہو گا بھی نام اُس نے ظفر کا
گمانِ جنبشِ لب اور بھی ہے

☆

کبھی ہے شعلہ، کسی شب دھواں نکلتا ہے
ہوں بے نشاں تو یہ کیسا نشاں نکلتا ہے

پناہ چاہتا ہوں، اور، ظلم توڑتے ہیں
زمیں سمجھتا ہوں، اور، آسماں نکلتا ہے

ہنر وہ شے ہے جسے پوچھتا نہیں کوئی
زباں سے لفظ یہاں رائیگاں نکلتا ہے

بہت اثر میں کمی آ گئی ہے، کیا کیجے
اگرچہ روز ہمارا بیاں نکلتا ہے

کہاں کی ریگِ بیاباں میں جذب ہوتا ہوا
یہ کس پہاڑ سے دریائے جاں نکلتا ہے

کچھ اعتبار کسی طرح کا نہیں باقی
یقین کرتا ہوں جس کا، گماں نکلتا ہے

میں اپنی آئی پہ جب آ گیا تو بات بنی
کہ سیدھی انگلیوں سے گھی کہاں نکلتا ہے

دکانِ خواب کا دیکھا ہے کر کے ہم نے حساب
ابھی ہمارا تمھارا زیاں نکلتا ہے

میں رنج کھینچتا رہتا ہوں اس لیے، کہ ظفر
غبار سے بھی کبھی کارواں نکلتا ہے

☆

کیا ترے لوٹ کے آنے کے لیے زندہ رہوں
شاید اس جان سے جانے کے لیے زندہ رہوں

یہ بھی جینا کوئی جینا ہے کہ میں دنیا میں
کبھی رونے، کبھی گانے کے لیے زندہ رہوں

کوئی پروا نہیں رکھتا ہے زمانہ میری
کیوں بھلا میں بھی زمانے کے لیے زندہ رہوں

دھند اور دھول میں لپٹا ہوا یہ منظرِ خواب
کس لیے سب کو دکھانے کے لیے زندہ رہوں

نہیں عزت کی اگر موت یہاں میرے لیے
کوئی ذلت ہی اٹھانے کے لیے زندہ رہوں

میرے حصے کی ملاوٹ بھی کیا کم ہے کہ میں
شور میں شعر ملانے کے لیے زندہ رہوں

راس ہے سب کو مرے خون پسینے کی مہک
یعنی میں سارے گھرانے کے لیے زندہ رہوں

زندگی نام اسی کا ہے کہ میں سب کی طرح
کہیں کھونے، کہیں پانے کے لیے زندہ رہوں

سنگ باری کی ہی امید ہے دنیا سے، ظفر
لاکھ میں پھول کھلانے کے لیے زندہ رہوں

☆

سمٹنے کی ہوس کیا تھی، بکھرنا کس لیے ہے
وہ جینا کس کی خاطر تھا، یہ مرنا کس لیے ہے

محبت بھی ہے، اور، اپنا تقاضا بھی نہیں کچھ
ہم اُس سے صاف کہہ دیں گے، مکرنا کس لیے ہے

جھجکنا ہے تو اُس کے سامنے ہونا ہی کیسا
جو ڈرنا ہے تو دریا میں اُترنا کس لیے ہے

مسافت خواب ہے تو خواب میں اب جاگنا کیا
اگر چل ہی پڑے ہیں تو ٹھہرنا کس لیے ہے

نہ کرنے سے بھی ہوتا ہو جہاں سب کا گزارہ
وہاں آخر کسی نے کام کرنا کس لیے ہے

اگر رُکنا نہیں اُس نے ہمارے پاس، تو پھر
ہمارے راستے پر سے گزرنا کس لیے ہے

ہم اپنی جلد بازی سے ہوئے ہیں آپ رُسوا
کسی بھی اور پر الزام دھرنا کس لیے ہے

وہ کہہ دے گا تو اُٹھ جائیں گے اُس کی بزم سے ہم
مناسب ہی نہیں لگتا، پسرنا کس لیے ہے

ظفر، اُس پر اثر تو کوئی ہوتا ہے، نہ ہو گا
تو پھر یہ روز کا بننا سنورنا کس لیے ہے

☆

جو اِک رنگ تماشا ٹوٹتا ہے
تو اُس کے ساتھ کیا کیا ٹوٹتا ہے

بڑی مُشکل سے جس کو جوڑتا ہوں
اُسی لمحے دوبارہ ٹوٹتا ہے

وہیں کھلتی ہے میری نیند سے آنکھ
جہاں پر خواب دریا ٹوٹتا ہے

چُبھی جاتی ہیں دل میں کرچیاں سی
لہو میں کوئی شیشہ ٹوٹتا ہے

یہ اُن دونوں میں ہے کیسا تعلّق
ہوا چلتی ہے، پتّا ٹوٹتا ہے

فلک پر پارہ پارہ ہے زمیں سی
زمیں پر آسماں سا ٹوٹتا ہے

شکست و ریخت ایسی ہے کہ ہر سُو
سبھی کچھ والہانہ ٹوٹتا ہے

کبھی تو یوں بھی لگتا ہے کہ دل میں
محبت کا کنارہ ٹوٹتا ہے

پرانی گرد ہوتی ہے کہیں صاف
نہ یہ صدیوں کا جالا ٹوٹتا ہے

نیا ٹوٹے گا دیکھیں اس برس بھی
کہ وہ پہلے ہی والا ٹوٹتا ہے

صراحی اپنی چھوٹے گی تو کیا غم
کسی کا بھی تو پیالہ ٹوٹتا ہے

اُلجھتے ہیں کہیں اُلفت کے دھاگے
کہیں تارِ تمنا ٹوٹتا ہے

کرو اب چاند کی بھی فکر کوئی
ابھی تو صرف ہالہ ٹوٹتا ہے

تو بس تیار سمجھو دُوسرا بھی
اگر اس طور پہلا ٹوٹتا ہے

کڑی غائب ہے کوئی درمیاں سے
کہیں کوئی حوالہ ٹوٹتا ہے

اکارت جا رہی ہے ساری محنت
بہت مضبوط ٹانکا ٹوٹتا ہے

ہے اُس کا ٹوٹنا ہی بس غنیمت
یہ مت پوچھو وہ کتنا ٹوٹتا ہے

الگ بھی ٹوٹتا ہو گا، مگر، وہ
ہمارے ساتھ کیسا ٹوٹتا ہے

ہماری طرح کیا ٹوٹے گا، لیکن
کسی دن وہ بھی اچھا ٹوٹتا ہے

جو پہلے ٹوٹتا تھا عارضی سا
وہی اب پکّا پکّا ٹوٹتا ہے

مَیں خود تو ثابت و سالم رہوں گا
فقط میرا ارادہ ٹوٹتا ہے

وہاں کوشش کرے وہ آپ بھی کچھ
جہاں پر زور اپنا ٹوٹتا ہے

مرا اندر مرے باہر کی نسبت
زیادہ ہی بکھرتا ٹوٹتا ہے

کسی شاخِ کشیدہ سے شب و روز
کوئی پیکر اُلجھتا ٹوٹتا ہے

وہ آدھا ہی نظر آیا تھا، لیکن
بدن سارے کا سارا ٹوٹتا ہے

زمیں ذرّوں میں بٹتی ہے دما دم
سمندر قطرہ قطرہ ٹوٹتا ہے

تسلّی ہو نہیں پاتی کسی طور
کہ سارا کچھ ادھورا ٹوٹتا ہے

محبت کانچ کا برتن ہے، لیکن
یہ اُلٹا ہے کہ سیدھا ٹوٹتا ہے

تو اصلی ہم بھی کیوں ٹوٹیں گے آخر
جو خود وہ ایسا ویسا ٹوٹتا ہے

اُسے کہنا خود آ کر دیکھ لے وہ
کوئی کچھ دن سے تنہا ٹوٹتا ہے

جو کھولیں تو ہوا لے جائے گی ساتھ
نہ کھولیں تو دریچہ ٹوٹتا ہے

کبھی چلنے سے پہلے یہ مسافر
کبھی ہو کر روانہ ٹوٹتا ہے

کسی کو دھیان ہی اس کا نہیں کچھ
یہاں بچہ کہ بوڑھا ٹوٹتا ہے

کسی دن ٹوٹنے پر آ ہی جائے
تو یہ دل اچھا خاصا ٹوٹتا ہے

تسلسل ہی نہیں رہتا ہے کوئی
جب اُس کا آنا جانا ٹوٹتا ہے

بصد مشکل اذانِ شوق سے بھی
سکوتِ صبحِ صحرا ٹوٹتا ہے

ہمارے کچھ نہ کہنے سے بھی اب تو
ہمارا کچھ نہ کہنا ٹوٹتا ہے

بہت کچھ اور ہے یہ ٹوٹنا بھی
وگرنہ کون اتنا ٹوٹتا ہے

کوئی تعمیر ہے تخریب میں بھی
جو سب کچھ جا و بے جا ٹوٹتا ہے

اگر بازو سلامت رہ بھی جائیں
تو سو جگہوں سے چہرہ ٹوٹتا ہے

کسی کا سنگ ہے، توڑے گا ہر آن
کسی کا آئنہ تھا، ٹوٹتا ہے

بچا رکھا بھی ہے میں نے بہت کچھ
یہ سب کچھ تو بقایا ٹوٹتا ہے

بہت بھڑکا محبت کا الاؤ
سو اب یہ شعلہ شعلہ ٹوٹتا ہے

اگر آغاز کار اپنا نہ ٹوٹے
تو پھر اس کا نتیجہ ٹوٹتا ہے

پتا چل جائے گا یہ بھی کہ آخر
دل اب کے ڈوبتا یا ٹوٹتا ہے

جسے پیوست ہونا چاہیے تھا
مرے آگے وہ اُلٹا ٹوٹتا ہے

جو ہم ایمانداری سے نہ ٹوٹیں
تو وہ بھی جھوٹا موٹا ٹوٹتا ہے

ہوا آزاد ہونے کو ہے شاید
کہ صدیوں کا شکنجہ ٹوٹتا ہے

سکوتِ شام کا حصہ بنیں ہم
تو یہ کچھ اور گہرا ٹوٹتا ہے

ہوا سی چل پڑے جب ٹوٹنے کی
تو سب کچھ بے محابا ٹوٹتا ہے

بھلا اس کا تدارک کیا کریں ہم
جو اپنے آپ بجتا ٹوٹتا ہے

خیال آنے لگا اس دل شکن کا
کئی جگہوں سے مصرع ٹوٹتا ہے

کہیں جا کر نہیں اب ٹوٹتا دل
یہاں بیٹھا بٹھایا ٹوٹتا ہے

کچھ اپنا ذائقہ ہے ٹوٹنے کا
یہاں کڑوا نہ میٹھا ٹوٹتا ہے

مری ہر سمت ٹوٹے گی کسی دن
ابھی تو آگا پیچھا ٹوٹتا ہے

کئی راتوں سے آپس میں ہی اب تو
یہ سارا کچھ اُلجھتا ٹوٹتا ہے

لہو میں گرم رفتاری نہیں وہ
سو، کیا کیا کچھ اٹکتا ٹوٹتا ہے

نئی بھی ٹوٹتی آخر کوئی چیز
کہ سب کچھ دیکھا بھالا ٹوٹتا ہے

کہیں دولخت ہو جاتے ہیں خود پیڑ
کہیں پیڑوں کا سایہ ٹوٹتا ہے

بہت روکا تھا جس کو ٹوٹنے سے
وہ اب پہلے سے دُگنا ٹوٹتا ہے

کسی کو روک بھی سکتے نہیں ہم
اندھیرے میں اُجالا ٹوٹتا ہے

سو ، یہ تاثیر بھی ہے خاص اس کی
جو ہر جانب چمکتا ٹوٹتا ہے

فلک پر رنگ سے اُڑتے ہیں کیسے
کہاں کا پھول کھلتا ٹوٹتا ہے

فضاؤں پر فضائیں گر رہی ہیں
زمیں پر کوئی ملبا ٹوٹتا ہے

زمین و آسماں جس سے بندھے تھے
بالآخر وہ بھی رستا ٹوٹتا ہے

قرار اس کو نہیں دم بھر میسّر
سو ، جب دیکھو لرزتا ، ٹوٹتا ہے

یہ دل کا ٹوٹنا معمول ہی تھا
مگر ، اب کے تجربہ ٹوٹتا ہے

ترس بھی کھانے لگ جاتا ہوں اس پر
جو اتنا بھولا بھالا ٹوٹتا ہے

قبا رہتی ہے خود ویسی کی ویسی
مگر ، ایک ایک تکمہ ٹوٹتا ہے

یہاں گرنے سے تو ٹوٹے ہی ٹوٹے
سنبھلنے سے بھی منکا ٹوٹتا ہے

یہی ہے منزلِ مقصود اس کی
مُسافر گرتا پڑتا ٹوٹتا ہے

کنارِ خوابِ ہستی سے دل اس کو
صدا دیتا ہے ، گویا ٹوٹتا ہے

جو ربط خاص تھا اس کا مرے ساتھ
تغافل کا وہ دھاگا ٹوٹتا ہے

زیادہ فکر کیا ہو ، دل تو کب سے
اسی صورت دھڑکتا ، ٹوٹتا ہے

کبھی دل میں ترختی ہے تمنا
کبھی آنکھوں میں جلوہ ٹوٹتا ہے

بدن سے رُخصتِ جاں کا یہ عالم
سحر ہوتی ہے ، پہرا ٹوٹتا ہے

کوئی تصویر ہوتی ہے مکمل
فضا میں اک پرندہ ٹوٹتا ہے

ہوا چلتی ہے جب اندر ہی اندر
تو سارا تانا بانا ٹوٹتا ہے

مکاں کے ٹوٹنے بننے سے پہلے
کئی بار اس کا نقشہ ٹوٹتا ہے

منائے خیر خود اپنی بھی اب وہ
اگر اس کا کرشمہ ٹوٹتا ہے

جو اکثر ٹوٹتا تھا ساتھ مل کر
وہ اب سب سے علیحدہ ٹوٹتا ہے

کبھی تو ٹوٹ جائے ایک ہی بار
جو ایسے لمحہ لمحہ ٹوٹتا ہے

رکو تو پسلیاں توڑیں گے آ کر
اگر بھاگو تو ٹخنا ٹوٹتا ہے

کبھی زوروں سے ٹوٹے گا یہی جسم
جو اب تک ہلکا ہلکا ٹوٹتا ہے

اٹکتی ہے زباں کیا اس کے آگے
بناتا ہوں تو جملہ ٹوٹتا ہے

کبھی مضمون ہی ٹوٹے گا سارا
ابھی تو ایک فقرہ ٹوٹتا ہے

نکلتی آ رہی ہے اصل صورت
چڑھا تھا جو ملمع ٹوٹتا ہے

مرے اندر کی قیمت پر ہی آخر
مرا باہر وغیرہ ٹوٹتا ہے

مسلسل ٹوٹنے کا منتظر وہ
ابھی تک چیدہ چیدہ ٹوٹتا ہے

یہ تبدیلی نئی آئی ہے مجھ میں
سخن قائم ہے ، لہجہ ٹوٹتا ہے

سمندر کا ہو اب جیسا بھی انجام
ابھی تک تو سفینہ ٹوٹتا ہے

کلہاڑی کند ہوتی ہے کسی دن
کسی دن اس کا دستہ ٹوٹتا ہے

مزہ کیا ٹوٹنے میں ہو کہ اب تو
یہاں ہر ایرا غیرا ٹوٹتا ہے

فلک پر کوئی بندوبست ہو اب
زمیں سے میرا قبضہ ٹوٹتا ہے

کبھی ٹوٹا تھا جیسا ، آج کل بھی
اسی سے ملتا جلتا ٹوٹتا ہے

برآمد کچھ بھی ہو، سب دیکھ لیں گے
غنیمت ہے کہ انڈا ٹوٹتا ہے

وہیں سے راستے نکلیں گے ہر سو
جہاں یہ دائرہ جا ٹوٹتا ہے

محبت سے رہا ہونا ہے خود ہی
یہ مت سمجھو کہ پنجرا ٹوٹتا ہے

غنیمت ہے کبھی جو بھولا بھٹکا
ہمارے پاس بھی آ ٹوٹتا ہے

اکڑ کر ٹوٹنے والا بھی آخر
کسی دن دست بستہ ٹوٹتا ہے

منافع ہے محبت کا یہی کچھ
جو تھوڑا سا خسارہ ٹوٹتا ہے

ترے اثبات کی خاطر ازل سے
یہاں سارا زمانہ ٹوٹتا ہے

یکایک ٹوٹنے کے ساتھ ہی ساتھ
بہت کچھ لحظہ لحظہ ٹوٹتا ہے

پتا چلتا ہی کب ہے ٹوٹنے کا
کچھ ایسے رفتہ رفتہ ٹوٹتا ہے

میں کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں مجھ پر
مرا سارا قیافہ ٹوٹتا ہے

جُڑے ہیں آپ تو جا کر کسی سے
کوئی اب بھی اکیلا ٹوٹتا ہے

خرابی ہے مرے ہونے سے کیا کیا
سو ، یہ سارا علاقہ ٹوٹتا ہے

مٹھائی بانٹتے پھرتے ہیں دشمن
مرا اور اُس کا ایکا ٹوٹتا ہے

جھٹک دینا ہے اپنا بوجھ میں نے
کہ اب تو میرا کندھا ٹوٹتا ہے

کچھ ایسے ٹوٹتا ہے پیڑ سے پھل
کہ جیسے کوئی ناتا ٹوٹتا ہے

میں خود عرضِ تمنا کر رہا ہوں
مرا برسوں کا روزہ ٹوٹتا ہے

کبھی لکڑی بھی ٹوٹی تھی نہ اپنی
مگر ، اب میرا لوہا ٹوٹتا ہے

نہا دھو کر بھی تو ٹوٹے کسی دن
وہی میلا کچیلا ٹوٹتا ہے

یہی تعمیر کی صورت ہے اس کی
یہ گھر کب سے اُدھڑتا ٹوٹتا ہے

تماشا سا ہمارا بھی یہاں پر
کہیں بنتا بگڑتا ٹوٹتا ہے

یونہی بس خرچ ہو جائے گا یہ دل
بہت اس سے لپٹنا ٹوٹتا ہے

اندھیرے میں اندھیرا ہو رہے خود
اسی خاطر شرارہ ٹوٹتا ہے

کوئی الزام کیا اب دے کسی کو
کہ از خود ہی گھروندا ٹوٹتا ہے

طلسم اس جانِ جانانِ وطن کا
ابھی سے قریہ قریہ ٹوٹتا ہے

بکھرتا ہے کہیں بادل کا بستر
کہیں پانی کا ریلا ٹوٹتا ہے

خبر بھی ہے کہ تیرے سنگِ در پر
کوئی مدت سے بیٹھا ٹوٹتا ہے

ابھی ہونے کو ہے شکلوں کی پہچان
کسی حد تک اندھیرا ٹوٹتا ہے

ترستی مر گئی بلّی بچاری
کہیں اب جا کے چھینکا ٹوٹتا ہے

نیا ہوتا نہیں کچھ وضع، لیکن
پرانا ہر طریقہ ٹوٹتا ہے

وہاں سرسبز رہتا ہے جو ہر دم
یہاں آ کر سنہرا ٹوٹتا ہے

تمنائیں ہوئی جاتی ہیں رخصت
ہمارے دل کا میلہ ٹوٹتا ہے

ہمیں وہ باندھ کر لایا تھا جس میں
وہی کمزور فیتا ٹوٹتا ہے

تمہارے چوک میں ہی کیوں پہنچ کر
ہمارے دل کا بھانڈا ٹوٹتا ہے

سفر وہ ہے کہ دل کے پانو میں اب
نیا ہر روز کانٹا ٹوٹتا ہے

کچھ ایسے ٹوٹتا ہے اس دفعہ تو
کہ جیسے کوئی وعدہ ٹوٹتا ہے

من و تو کا کوئی جھگڑا نہیں اب
جو کچھ ٹوٹے تو سانجھا ٹوٹتا ہے

اٹھانے پر قدم ہوتا ہے وہ نیم
لگانے پر انگوٹھا ٹوٹتا ہے

اُسے سارا ہی سمجھو ٹوٹا پھوٹا
وہ جس کا کوئی حصہ ٹوٹتا ہے

مجھے سالم سمجھتا ہے ، صد افسوس
جو مجھ سے بالا بالا ٹوٹتا ہے

یہ کیسا خوابِ طفلی ہے کہ جیسے
مرے سر میں کھلونا ٹوٹتا ہے

مرا باہر جو ہے پُرزے ہی پُرزے
نہیں معلوم کب کا ٹوٹتا ہے

روانی ہی روانی میں کہیں پہ
ہوا کا کوئی جھونکا ٹوٹتا ہے

یہ سب کچھ کھیل ہے اس کی نظر میں
وگرنہ گھر تو میرا ٹوٹتا ہے

جہاں وہ چاہتا ہے پھینک دینا
وہیں پہ اپنا کاسہ ٹوٹتا ہے

چٹان ایسی ہوں میں جس سے کم و بیش
نیا ہر روز ٹکڑا ٹوٹتا ہے

نرنگ اس دل میں لگتی ہے کبھی ، اور
کبھی اس گھر کا تالا ٹوٹتا ہے

میں سیدھا توڑنے کی سعی میں ہوں
مگر ، وہ ہے کہ ترچھا ٹوٹتا ہے

یہ دروازہ بھی ٹوٹے گا کسی دن
ابھی تو بیکل قبضہ ٹوٹتا ہے

ہمیشہ کا سلامت رہنے والا
کسی دن بے تحاشا ٹوٹتا ہے

غنیمت جانیے ، ڈرتے جھجکتے
وہ جیسا اور جتنا ٹوٹتا ہے

سلامت ہے بقایا ناک ساری
ابھی تو صرف بانسا ٹوٹتا ہے

کبھی چھاپا اُلٹتے ہیں ہمارا
کبھی چھپّر تمھارا ٹوٹتا ہے

گرانی کے بھی ہاتھوں خود شکن ہوں
کچھ اپنا آپ سستا ٹوٹتا ہے

بہت بھی ٹوٹنے والا ہو آخر
تو پہلے تھوڑا تھوڑا ٹوٹتا ہے

اِدھر کا بھی لگائے کوئی چکّر
وہ جس موسم میں پورا ٹوٹتا ہے

ظفر یہ احتیاط اچھی ہے ، لیکن
جو ڈرتا ہے ، زیادہ ٹوٹتا ہے

☆

کوئی حربہ کارگر ہونے ہی والا ہے
جیسے اُس پر کچھ اثر ہونے ہی والا ہے

پھر بدل جانے کو ہے آنکھوں کا یہ موسم
پھر کہیں اُس کا گزر ہونے ہی والا ہے

اُس کے ہونے کے کوئی آثار بھی تو ہوں
اس نہ ہونے میں اگر ہونے ہی والا ہے

کب تک آخر سب سے یہ کہتے رہیں گے ہم
ہو نہیں پایا ، مگر ، ہونے ہی والا ہے

زہر اپنا بھی قریب الختم ہے آخر
وہ بھی کافی بے ضرر ہونے ہی والا ہے

شام بھی جل بجھ رہی ہے لحہ لحہ ، اور
شہر بھی زیر و زبر ہونے ہی والا ہے

چل پڑے تو جائیں گے پیچھے کی جانب ہی
لاکھ آغازِ سفر ہونے ہی والا ہے

عیب اپنے کھولنا آساں نہیں ، لیکن
آج ہم سے یہ ہنر ہونے ہی والا ہے

روک تو سکتے نہیں ، اب جھیل ہی جائیں
جو نہ ہونا تھا ، ظفر ، ہونے ہی والا ہے

-☆-

کہیں آتا ہوں اب نہ جاتا ہوں
یہیں دن رات سرسراتا ہوں

پیاس رکھتی ہے تازہ دم مجھ کو
دھوپ میں اور لہلہاتا ہوں

بو رہا ہوں زمین میں تارے
آسماں پر درخت اُگاتا ہوں

کیا خبر رات رات بھر آخر
کن ہواؤں میں سنسناتا ہوں

چاند لکھتا ہوں روشنی کے لیے
یُوں میں اپنا دیا جلاتا ہوں

اُڑ گئے پھول تتلیاں بن کر
کب سے واپس اُنھیں بُلاتا ہوں

لفظ سب سُوکھ سے گئے مجھ میں
جبھی چلتے میں کھڑکھڑاتا ہوں

دوستی بھی نہیں لگی ہے تو کیا
دشمنی تو بہت نبھاتا ہوں

بوجھ اپنا ہی اس قدر ہے ، ظفر
کبھی رکھتا ، کبھی اُٹھاتا ہوں

-☆-

یہ میری آگ ہے، لیکن، دھواں میرا نہیں ہے
بیاں میرا سہی، رنگِ بیاں میرا نہیں ہے

اماں مجھ کو ملی ہے دل میں اس کے عارضی سی
میں جس میں رہ رہا ہوں وہ مکاں میرا نہیں ہے

میں جی سکتا ہوں کیسے، اور، کہاں جاؤں گا مر کر
زمیں دشمن کی ہے، اور، آسماں میرا نہیں ہے

مجھے دکھلا، کہاں تک ہے محبت کا علاقہ
کدھر میرا ہے اس میں، اور، کہاں میرا نہیں ہے

اگر دو چار لوگ اچھا سمجھتے ہیں مجھے بھی
تو اس میں بھی قصور، اے مہرباں، میرا نہیں ہے

جہانِ آب و گِل میں ملکیت ہے اپنی اپنی
یہاں پر پیاس میری ہے، کنواں میرا نہیں ہے

میں ہر نفع و ضرر سے لاتعلق ہو چکا ہوں
یہاں میرا بھی اب سود و زیاں میرا نہیں ہے

وہی میرا ہے جس کی میں ادا کرتا ہوں قیمت
مجھے دیتے ہیں جو کچھ رائگاں میرا نہیں ہے

ظفر، خالی ہی نکلا صفحۂ ہستی بھی آخر
وہاں پر بھی کہیں نام و نشاں میرا نہیں ہے

-☆-

ایک ہی بار دوبارہ سی
گول مٹول، غبارہ سی

بڑھتی بیل، ہری ہریال
چڑھتی پینگھ ہلارہ سی

خوشیاں بانٹتی پھرتی ہے
گلی گلی ہرکارہ سی

اپنے مطلب کی ہے خاص
ہنس مکھ اور، آوارہ سی

چلتی پھرتی چھاؤں بھی ہے
بیٹھی دھوپ کنارہ سی

کوئی سمجھ سکتا ہی نہیں
ایسی ہے وہ اشارہ سی

لگتی ہے آسان، مگر
اصل میں ہے دشوارہ سی

نہیں یہ روگ اپنے بس کا
ڈھونڈیں کوئی گزارہ بھی

کیا تھی جان اپنی بھی، ظفر
جگنو ذات، شرارہ سی

-☆-

یہی تھی ضد مجھے دانا سمجھنے والوں سے
کہ میں بھی کچھ تو سمجھتا سمجھنے والوں سے

میں کم سمجھتا ہوں، اور، نسبتاً سکون میں ہوں
ہر ایک بات زیادہ سمجھنے والوں سے

غلط جو سمجھے ہیں مجھ کو تو ٹھیک سمجھے ہیں
مجھے گلہ نہیں ایسا سمجھنے والوں سے

ہوا ہوں اتنا زیادہ ہی ناسمجھ آخر
رہا قریب میں جتنا سمجھنے والوں سے

مرا بھی کوئی تعلق بہت قریب کا ہے
سرابِ دشت کو دریا سمجھنے والوں سے

کچھ اور طرح سے سمجھایئے مجھے اس بار
میں مختلف ہوں اشارہ سمجھنے والوں سے

سمجھ کچھ اور بھی آئی تو ہو گی دوسری بار
یہ پوچھنا ہے دوبارہ سمجھنے والوں سے

بس ایک میں ہی سمجھتا نہیں ہوں کچھ، ورنہ
بھری پڑی ہے یہ دنیا سمجھنے والوں سے

بُرا ہوں جن کی نظر میں، انہی میں خوش ہوں، ظفر
میں بچتا پھرتا ہوں اچھا سمجھنے والوں سے

☆

حدوں کے بیچ رہا ہے کنار ہو کر بھی
کسی سبب تو معزز ہوں خوار ہو کر بھی

اِدھر ہوں یا کہ اُدھر، اور، ہوں بھی یا کہ نہیں
مجھے یہ شک ہی رہا آر پار ہو کر بھی

لگا سکے کوئی کیوں کر درست اندازہ
چھپا ہوا سا ہوں کچھ آشکار ہو کر بھی

میں کچھ بھی ہوں، مجھے اچھا یہی لگا ہے کہ میں
شمار ہی میں رہوں بے شمار ہو کر بھی

کچھ اعتبار نہیں اس کا، اے ہوائے سحر
یہ دل تو دل ہی رہے گا غبار ہو کر بھی

دھرا نہ اُس نے قدم ایک بار بھی آ کر
کہ میں نے دیکھ لیا رہگزار ہو کر بھی

عجب طرح کی جدائی ہے یہ کہ میں اس بار
سکون میں ہوں بہت بے قرار ہو کر بھی

ہوئی نہیں ہے کوئی خاص پیش رفت اُدھر
وہاں سے آئے تو ہیں بار بار ہو کر بھی

زباں کو سر پہ اُٹھائے بھی ہم پھرے ہیں، ظفر
سخن کیا ہے زباں پر سوار ہو کر بھی

☆

کر نہیں سکا ، لیکن ، کمال ہوتا جاتا ہوں
اپنی جان کا بھی میں وبال ہوتا جاتا ہوں

ٹوٹنے اور سمٹنے کا دھیان ہی نہیں آتا
ٹوٹتا ، بکھرتا سا خیال ہوتا جاتا ہوں

وہ بھی بنتی جاتی ہے سوال میری آنکھوں کا
میں بھی اُس کے چہرے کا ملال ہوتا جاتا ہوں

پُرسکوں پڑا ہوں میں صبح کے کنارے پر
لیکن اندرے اندر دھال ہوتا جاتا ہوں

سر کا بوجھ بھی آخر پانو پر ہی آنا تھا
سوچتا رہتا ہوں ، اور ، نڈھال ہوتا جاتا ہوں

ہے تو بات اَن ہونی ، لیکن ایسے لگتا ہے
رفتہ رفتہ جیسے میں بحال ہوتا جاتا ہوں

چلنے والے چلتے ہوں جتنا بچ بچا کر بھی
راستے میں ہوں ، اور ، پامال ہوتا جاتا ہوں

یا تو سب سے اچھا ہوں ، یا بُرا ہوں سب سے ہی
جس طرح کا بھی ہوں میں ، مثال ہوتا جاتا ہوں

آئے گی سمجھ میری کیا ، ظفر ، زمانے کو
خود بھی میں اپنے لیے محال ہوتا جاتا ہوں

☆

جینے کے درمیاں ہوں کہ مرنے کے درمیاں
میں چپ کھڑا حدوں سے گزرنے کے درمیاں

بیڑا اُٹھا لیا ہے جو اصلاح کا ، تو کیا
بگڑا ہوں کتنا اور سنورنے کے درمیاں

پانی ہی اجنبی ہے کہ تھا میں ہی کوئی اور
کیوں ڈوبتا گیا ہوں اُبھرنے کے درمیاں

تھک کر نڈھال ہونا ہی تھا اس لیے کہ میں
گرمِ سفر رہا ہوں ٹھہرنے کے درمیاں

ممکن ہے صد ہزار سخن اُس کی بزم میں
کرنے کے ، اور ، بات نہ کرنے کے درمیاں

پایاب تھا وہ سلسلۂ خواب اگر تو میں
کیوں رُک گیا تھا پار اُترنے کے درمیاں

بے خوف رہ کے ہو نہیں سکتا تھا ایک بھی
جو کام کر گیا ہوں میں ڈرنے کے درمیاں

تھی گھاس کی گھنیری سی ڈھلوان کی طرف
اور ، چاند سا چھپا ہوا جھرنے کے درمیاں

دیتا نہیں سجھائی ، ظفر ، کچھ غبار میں
میں کھو گیا ہوں آپ بکھرنے کے درمیاں

☆

بُرا سمجھوں اُسے اب یا کہ اچھا کر چکا ہوں
وہی کافی ہے جیسا اور جتنا کر چکا ہوں

کِیا ہے جو بھی کُچھ ، یہ دردِ سر میرا نہیں ہے
کہ ایسا کر چکا ہوں یا کہ ویسا کر چکا ہوں

مری دانست میں تو کارنامہ یہ ہے میرا
کہ مَیں کُچھ کر گزرنے کا ارادہ کر چکا ہوں

بھلا اب اور کیا کرنے کی ہو مُجھ سے توقّع
اُسے دیکھا ہے ، اور ، اُس کی تمنّا کر چکا ہوں

مُجھے وہ کام کرنے کے لیے اب کہہ رہے ہیں
جسے مَیں اپنی جانب سے دوبارہ کر چکا ہوں

کسی صورت مُجھے کُچھ بھی نہ کرنے دے یہ دُنیا
اگر معلوم ہو جائے مَیں کیا کیا کر چکا ہوں

مُجھے توفیق ہی سب سے الگ بخشی گئی تھی
جو یہ سب کر رہے ہیں ، مَیں وہ تنہا کر چکا ہوں

بظاہر تو روانی ہی فقط ڈالی ہے مَیں نے
کہ دریا ہی نہ تھا جو ، اُس کو دریا کر چکا ہوں

ظفر ، اب اور یارانِ غزل کیا چاہتے ہیں
کہ مَیں اک بار تو مُردے کو زندہ کر چکا ہوں

☆

ہے آشکار ، مگر ، آشکار سے کم ہے
غُبار کِتنا ہے ، پھر بھی ، سوار سے کم ہے

شُمار ہوتے ہوئے بھی شُمار سے کم ہے
کہ بار بار یہاں ایک بار سے کم ہے

کُھلی کُھلی اسے کُچھ اور پھیل جانے دو
یہ انتشار ابھی انتشار سے کم ہے

مُجھے اگر چمک اُٹھنا ہے ان اندھیروں میں
تو فُرصت اس کی بھی شاید شرار سے کم ہے

جو ہے زیادہ تو اس کا کوئی سبب ہو گا
اگر ہے کم تو کِسی اعتبار سے کم ہے

مُجھے کہیں نہیں پہنچائے گی محبت بھی
کہ رہگزار ہے ، اور ، رہگزار سے کم ہے

مَیں جانتا ہوں ، مگر مانتا نہیں ، ورنہ
تری اُمید ترے انتظار سے کم ہے

مَیں اپنے آپ بھی کوشش میں ہوں سنبھلنے کی
ہے آسرا بھی ، مگر ، انحصار سے کم ہے

سُکیڑ رکھے ہیں چادر میں اپنے پانو ، ظفر
کروں گا وہ جو مرے اختیار سے کم ہے

☆

ابھی کسی کے نہ میرے کہے سے گزرے گا
وہ خود ہی ایک دن اس دائرے سے گزرے گا

بھری رہے ابھی آنکھوں میں اُس کے نام کی نیند
وہ خواب ہے تو یونہی دیکھنے سے گزرے گا

جو اپنے آپ گزرتا ہے کوچہ دل سے
مجھے گماں تھا مرے مشورے سے گزرے گا

قریب آنے کی تمہید ایک یہ بھی رہی
وہ پہلے پہلے ذرا فاصلے سے گزرے گا

قصوروار نہیں، پھر بھی چھپتا پھرتا ہوں
وہ میرا چور ہے، اور، سامنے سے گزرے گا

چھپی ہو شاید اسی میں سلامتی دل کی
یہ رفتہ رفتہ اگر ٹوٹنے سے گزرے گا

ہماری سادہ دلی تھی جو ہم سمجھتے رہے
کہ عکس ہے تو اسی آئنے سے گزرے گا

سمجھ ہمیں بھی ہے اتنی کہ اس کا عہدِ ستم
گزارنا ہے تو اب حوصلے سے گزرے گا

گلی گلی مرے ذرّے بکھر گئے تھے، ظفر
خبر نہ تھی کہ وہ کس راستے سے گزرے گا

☆

کیا کروں آغاز کو، انجام اُدھورا رہ گیا ہے
بات ہے ساری مکمل، کام اُدھورا رہ گیا ہے

کوئی منظر میں کمی سی آ گئی ہے کچھ دنوں سے
دیکھتے ہی دیکھتے وہ بام اُدھورا رہ گیا ہے

چاند کیا اُبھرا، بکھر جانے کو ہے تصویر ساری
سایے گڈ مڈ ہیں، غبارِ شام اُدھورا رہ گیا ہے

سو بھی رفتہ رفتہ ہٹ جائے گا دیوار ہوا سے
بے نشاں ہوں، اور، میرا نام اُدھورا رہ گیا ہے

دل میں ہنگامے تو اُٹھتے ہیں، مگر کچھ واجبی سے
سر میں جو برپا تھا وہ کہرام اُدھورا رہ گیا ہے

میں سبب تھا آپ بھی کچھ اپنی ان بدحالیوں کا
یوں یہ میرا شکوۂ ایّام اُدھورا رہ گیا ہے

بیچ میں چھوڑا ہے میں نے چھیڑ کر سازِ سخن بھی
اس طرح میرا یہ ذوقِ خام اُدھورا رہ گیا ہے

ٹھیک ہی تھا فیصلہ اُس کا مرے عیب و ہنر پہ
ہے سزا پوری، مگر، انعام اُدھورا رہ گیا ہے

اے ظفر، تکمیل کیا کرتا کتابِ خواب کی میں
سلسلہ ٹوٹا ہے، اور، الہام اُدھورا رہ گیا ہے

☆

تھکنا بھی لازمی تھا کچھ کام کرتے کرتے
کچھ اور تھک گیا ہوں آرام کرتے کرتے

اندر سب آ گیا ہے باہر کا بھی اندھیرا
خود رات ہو گیا ہوں میں شام کرتے کرتے

یہ عمر تھی ہی ایسی، جیسی گزار دی ہے
بدنام ہوتے ہوتے، بدنام کرتے کرتے

پھنستا نہیں پرندہ، ہے بھی اسی فضا میں
تنگ آ گیا ہوں دل کو یوں دام کرتے کرتے

کچھ بے خبر نہیں تھے جو جانتے ہیں مجھ کو
میں کوچ کر رہا تھا بسرام کرتے کرتے

سر سے گزر گیا ہے پانی تو زور کرتا
سب روک رکتے رکتے، سب تھام کرتے کرتے

کس کے طواف میں تھے اور، یہ دن آ گئے ہیں
کیا خاک تھی کہ جس کو احرام کرتے کرتے

جس موڑ سے چلے تھے پہنچے ہیں پھر وہیں پر
اک رائیگاں سفر کو انجام کرتے کرتے

آخر، ظفر، ہوا ہوں منظر سے خود ہی غائب
اسلوب خاص اپنا میں عام کرتے کرتے

☆

کس کو خبر تھی وہ بھی مرا یار ہوئے گا
اور، عورت ساتھ سونے کو تیار ہوئے گا

کچھ ہونے اور کچھ بھی نہ ہونے کے درمیاں
اقرار ہوئے گا، کبھی انکار ہوئے گا

کھولا جو اُس نے راز ہمارا تو بیش و کم
پوشیدہ اُس میں بھی کوئی اسرار ہوئے گا

گمنام جو بھی رہتا ہے، عزت اُسی کی ہے
مشہور ہوئے گا تو بہت خوار ہوئے گا

جو کچھ سمجھ میں آئے گا، رُک جائے گا وہیں
جو فہم سے ورا ہے وہ اظہار ہوئے گا

باہر سے جتنی ہوئے گی تعمیر سر بلند
اندر اُسی حساب سے مسمار ہوئے گا

رہنے کا حق اُسی کو عطا ہو گا شہر میں
اب شہریار کا جو طرفدار ہوئے گا

جو چھپ چھپا کے ہوتا رہا اب سے آج تک
اب ہوئے گا تو بر سرِ بازار ہوئے گا

اچھا نہیں ہے بوسۂ چشم اُس کا، اے ظفر
تُو رفتہ رفتہ آپ ہی بیمار ہوئے گا

☆

کہیں جانے سے ہُوا، اور، نہ آنے سے ہُوا
کچھ ہُوا بھی تو کسی اور بہانے سے ہُوا

فائدہ رازِ دلِ رفتہ کسی صورت بھی
نہ بتانے سے ہُوا، اور، نہ چھپانے سے ہُوا

کچھ سمجھ آپ بھی آتی گئی اُس کو آخر
اور، قائل بھی وہ کچھ پاس بٹھانے سے ہُوا

راہ سے دل کو ہٹایا تو کہیں بات بنی
ربطِ خاص اِک یہی دیوار گرانے سے ہُوا

تھا اندھیرا بھی کسی اور طرح کا اب کے
گھر یہ روشن بھی فقط آگ لگانے سے ہُوا

جو کہیں بھی نہیں موجود، یہ ہنگامہ تمام
اُس کی تصویر ہی دُنیا کو دکھانے سے ہُوا

سب سمجھتے ہیں کہ اِس بار تو برپا یہ فساد
رنگ پر اور کوئی رنگ چڑھانے سے ہُوا

جمع پُونجی تو بہا لے گیا میری بھی وہ ساتھ
یعنی نقصان بھی طوفان اُٹھانے سے ہُوا

منکشف اُس پہ مرا شوقِ مُلاقات، ظفر
دُور رہنے سے ہُوا، آنکھ چُرانے سے ہُوا

-☆-

کچھ غم کا بدل جانا، کچھ ہم کا بدل جانا
بے وجہ نہیں آخر موسم کا بدل جانا

حیران و پریشاں سے ہم دیکھتے رہتے ہیں
پھولوں کا الگ رہنا، شبنم کا بدل جانا

اِک بھیک سمجھ کر ہی دیتے ہیں توجّہ بھی
پھر، گاہے بگاہے سے پیہم کا بدل جانا

دونوں کا اثر دل پر کچھ ایک ہی جیسا ہے
ہم نے تو خُوشی کو بھی اِس غم کا بدل جانا

کچھ دھول کی لہریں سی اِک دھند کے بادل پر
واضح تھا بہت اب کے مُبہم کا بدل جانا

لالچ نہیں کرتے ہم، بدلے تو سہی آخر
کافی ہے زیادہ سے کچھ کم کا بدل جانا

مصروف رہے دونوں کچھ دُوسرے کاموں میں
محسوس بھی کیا ہوتا باہم کا بدل جانا

نقصان کی تلافی تو اِس سے نہیں ہو سکتی
کیا ہم کو دکھاتے ہو ماتم کا بدل جانا

قائم تو کبھی رہتے خُود پر بھی، ظفر صاحب
اچھا نہیں لگتا ہے ہر دم کا بدل جانا

-☆-

کہاں تک مفت میں رسوایے گا
کسی دن تو بغل گیرایے گا

بہت ارزاں نہیں پہلے بھی ملنا
اسے اب اور مت منہگایے گا

خیال آخر کو آئے گا کبھی تو
کوئی دن اور بے پروایے گا

کبھی تعریف کرتے ہیں ہماری
کسی دن آپ بھی اچھایے گا

طبیعت کی روانی رک گئی ہے
کبھی آ کر اسے دریایے گا

تغافل اب تو عادت ہو گیا ہے
اسے اب اور کیا مختایے گا

کبھی تو کیجیے گا منصلح بھی
سو، کب تک رنجش بچایے گا

میں ہر سو ڈھونڈتا پھرتا ہوں دل میں
کہاں تک اور اسے صحرایے گا

ظفر، جیسا سلوک اُس نے کیا ہے
جواباً آپ بھی ویسایے گا

☆

کیا کچھ وہ ابھی میرے حوالے نہیں کرتا
لگتی ہے مجھے پیاس تو پیالے نہیں کرتا

میرے بھی تقاضے ہیں پسند اُس کو پُرانے
اپنے بھی وہ نخروں کو نرالے نہیں کرتا

اپنا وہ اکیلے میں بھروسا کسی صورت
کر جائے بھی شاید کبھی، حالے نہیں کرتا

رہتا ہے رقیبوں میں ہی مشغول وہ اکثر
اور، بزم سے مجھ کو بھی نکالے نہیں کرتا

کہہ دیتا ہے وہ بات نکلا کر مجھے خود ہی
میری طرح کاغذ کبھی کالے نہیں کرتا

ایسے بھی نہ سمجھو کہ محبت ہے اُسے بھی
ایسا بھی کوئی روگ وہ پالے نہیں کرتا

نقصان رسائی کا نہیں اتنا کوئی غم
افسوس تو یہ ہے کہ ازالے نہیں کرتا

اندر بھی اندھیرا سا کیے رکھتا ہے اب تو
باہر بھی کئی دن سے اُجالے نہیں کرتا

جیسے ہیں، ظفر، آپ کے حالات، کوئی بھی
اس غم میں اس طرح کے چالے نہیں کرتا

☆

زباں کھینچی گئی جس بات پر حلقوم کی حد تک
ہمیں معلوم تھی وہ صرف نامعلوم کی حد تک

کسی کو ہو غلط فہمی تو پھر کیا کیجیے ، ورنہ
ہمارا شوق ہے اُس کی گلی میں گھوم کی حد تک

ستائش اہلِ صورت کی بھی کچھ ہو سکی ہم سے
کسی پر جھوم کی حد تک ، کسی کو چوم کی حد تک

ہماری بات کو مت لیجیے سنجیدگی سے بھی
یہ واویلا ہے بس اک مقصدِ موہوم کی حد تک

اُٹھا لانا ہے اک دن اپنے خلوت خانے میں اُس کو
میں دل کے ساتھ ہوں اس جذبۂ معصوم کی حد تک

کچھ اپنا تو گزارہ ہو ہی جائے گا کسی صورت
کہ محرومی ہے ساری اس دلِ محروم کی حد تک

سوائے شکوۂ مقسوم خود بھی کچھ کیا ہوتا
خدارا اس طرح مت کیجیے مقسوم کی ہتک

پسِ الفاظ بھی اک حشر برپا ہے اگر دیکھیں
وگرنہ آپ کی تو دوڑ ہے مفہوم کی حد تک

زیادہ فکرمندی کا نہیں موقع ، ظفر ، اب کے
کہ اپنا عشق ہے اس نامۂ منظوم کی حد تک

☆

سامان کچھ اِدھر سے اُدھر ہونے والا ہے
اک دوسرے کی سمت سفر ہونے والا ہے

بُجھتے ہوئے دیے بھڑک اُٹھیں پھر ایک بار
ایسی بھی آندھیوں کا گزر ہونے والا ہے

جو فکر تھی شعور میں ڈھلنے کو ہے کہیں
جو خواب تھا کبھی وہ خبر ہونے والا ہے

پھیلے ہوئے خیال کی یکسوئی کے عوض
سمٹا ہوا وجود بکھر ہونے والا ہے

طوفاں سا ہے بپا مرے اطراف میں کوئی
ہنگامہ اک نیا مرے گھر ہونے والا ہے

یوں بھی نہیں کہ اپنی فغاں ہو بلند بانگ
یہ بھی نہیں کہ اُس پہ اثر ہونے والا ہے

جو ہوتے ہوتے رہ گیا ، اُس کے بجائے اب
جو ہو چکا ہے ، بار دگر ہونے والا ہے

کھلنے لگے جو عیب تو ہم خوش ہوئے کہ اب
ظاہر ہمارا اُس پہ ہنر ہونے والا ہے

تنگ آ گیا ہوں اب تو ، کہ ہو بھی چکے ، ظفر
وہ عشق ناتمام اگر ہونے والا ہے

☆

آواز کی لہروں میں گہرائی ہوا کی ہے
کس شے میں ہے کیا شامل، اُلجھن یہ صدا کی ہے

موسم کے فلک پر ہیں تارے سے تمنا کے
تنہائی کے ہاتھوں میں تصویر صبا کی ہے

کس رات کے روزن میں کیا آنکھ اُلجھتی سی
کچھ بات بتا کی ہے، کچھ بھید چھپا کی ہے

اک فاصلہ رہتا ہے پانی سے روانی تک
دریائے ہوس میں بھی اک موج وفا کی ہے

جس شور نے گھیرا ہے اس شام تماشا کو
اس خواب کی ٹوپی سے اک چیز جُدا کی ہے

اس ریت کے رازوں سے بے گانہ ابھی تک ہوں
صحرائے محبت میں اک عمر گنوا کی ہے

نقشہ ہی بدل ڈالا مٹتی ہوئی خواہش کا
اُتنی ہی سزا دیتے جتنی کہ خطا کی ہے

کس کے لیے مرتے تھے، کس کے لیے جیتے ہیں
کاغذ ہے کُجا دل کا، تحریر کُجا کی ہے

ہوتے ہوئے کھو جانا، روتے ہوئے سو جانا
عادت ہے، ظفر، لیکن کچھ اور طرح کی ہے

☆

وہ صبر تھا تو صبر کا پھل ہونا چاہیے
یہ مسئلہ ہے، اور، اسے حل ہونا چاہیے

یہ فکر ہے تو اس کو کوئی شکل ہو عطا
تجویز ہے تو اس پہ عمل ہونا چاہیے

تفصیلِ وصل آپ نے طے کی تو ہے، مگر
تھوڑا سا اس میں ردّ و بدل ہونا چاہیے

ممکن ہے جتنا، آج ہی کر ڈالیے نہ کیوں
جو کام بچ رہے اُسے کل ہونا چاہیے

گرتا ہے وزن بھی تو گرے، کچھ زیاں نہیں
مقصد ہے یہ کہ مال اصل ہونا چاہیے

کہتے ہیں، رونا پیٹنا ہی اس میں ہو فقط
یعنی غزل کو صرف غزل ہونا چاہیے

وہ دسترس سے دور سہی، اس کے باوجود
ہے یہ دماغ، اس میں خلل ہونا چاہیے

گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا یہ روز روز
ہے فیصلہ تو اس کو اٹل ہونا چاہیے

گندم نہ ہو تو بھُس بھی غنیمت ہے، اے ظفر
گر وہ نہیں تو اُس کا بدل ہونا چاہیے

☆

رہتا ہے جو اک سلسلۂ آب پسِ خواب
لگتا ہے کہ ہے یہ بھی کوئی خواب پسِ خواب

آگے وہ دُھندلکا، بہت آگے وہ اندھیرا
پیچھے وہ مہکتے ہوئے مہتاب پسِ خواب

یہ جاگتے میں میری سمٹتی ہوئی دُنیا
پھیلا ہُوا وہ عالمِ اسباب پسِ خواب

مَیں سنگِ حقیقت سے پٹختا رہا خُود کو
لرزاں رہا اک نغمۂ نایاب پسِ خواب

طغیان تماشا تھا، گزرتا رہا سر سے
باقی ہے بس اک موجۂ پایاب پسِ خواب

وہ بھیڑ، وہ رونق، وہ تب و تاب کہاں ہے
بیٹھا ہُوں بہت دیر سے تہہ آب پسِ خواب

وہ ماہِ مُلاقات بھلا جائے گا سب کچھ
کھولے گا جُدائی کا بھی اک باب پسِ خواب

ہمخواب تھا، اور، صاف بچا لے گیا خُود کو
ہُوں مَیں ہی بھرے شہر میں رُسواب پسِ خواب

الفاظ کے باغی ہیں، ظفر، جن کے ماتے
خالی ہے معانی کی جو محراب پسِ خواب

☆

کبھی چھپ کے، اور کبھی آشکار میں آئے گا
وہ سوارِ خواب کسی غُبار میں آئے گا

جو رُکے ہوئے ہیں وہ گُل کھلانے کے واسطے
اگر آ سکا تو اسی بہار میں آئے گا

جو نہ آئے گا تو بتائے گا کوئی وجہ بھی
چلو کچھ مزہ تو اس انتظار میں آئے گا

نہ تو اس طرف نظر آئے گا نہ ہی اُس طرف
وہ ہوائے وصل کے آر پار میں آئے گا

ابھی زاویے ہی نہیں دُرست نگاہ کے
اُسے رُک کے دیکھنا جب مدار میں آئے گا

ابھی دسترس میں نہیں تو رنگ ہی اور ہیں
وہ کچھ اور ہو گا جب اختیار میں آئے گا

سو، رواں کرے گا رگوں میں رُکتا ہوا لہو
کوئی آفتاب سا برف زار میں آئے گا

کوئی اور اُس کے سوا نہ ہو گا کسی طرف
وہ کچھ ایسا بے حد و بے شمار میں آئے گا

کسی دن تو کھائے گا بھی فریبِ وفا، ظفر
کسی روز تو مرے اعتبار میں آئے گا

☆

رہتا نہیں خاموش گھنیرے میں اندھیرا
کچھ اور دھڑکتا ہے اندھیرے میں اندھیرا

جو صورتِ حالات ہے، پہلے تو نہیں تھی
کتنا ہے گھٹاٹوپ تو ڈیرے میں اندھیرا

تانی ہوئی تھی رات نے پہلے ہی سے چادر
بادل نے کیا اور بسیرے میں اندھیرا

البتہ سمندر کی سیاہی ہے الگ چیز
مچھلی میں ہے اتنا نہ مچھیرے میں اندھیرا

کچھ دل کو ٹٹولیں گے تو ہو گا کہیں معلوم
تیرے میں زیادہ ہے کہ میرے میں اندھیرا

یہ پیار کا دھندا بھی عجب ہے کہ جہاں پر
گھاٹے میں اُجالا ہے، ودھیرے میں اندھیرا

مَیں وسط میں ہوں، اور، مجھے اندازہ نہیں کچھ
ہے میرے پھیرے کہ اگیرے میں اندھیرا

کھلتی ہی گئی روشنیٔ خواب معانی
بڑھتا رہا الفاظ کے گھیرے میں اندھیرا

تُو شامِ حریفاں پہ، ظفرؔ، خوش نہ بہت ہو
اتنا ہے ترے اپنے سویرے میں اندھیرا

☆

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ تماشا سکتا
اور پھر وہ بھی بھرے شہر میں تنہا سکتا

رہ گئی تھی کسر اک موج محبت کی وہاں
ورنہ مَیں اور بھی شاید تہِ دریا سکتا

ابتدا میں جو ہُوا اُس کو غنیمت سمجھو
مُدعا یہ ہے کہ مَیں اُس کو دوبارہ سکتا

تھا خسِ خواب کے پیچھے وہ دہکتا ہُوا پھول
روز اس طرح کا منظر کہاں پیدا سکتا

کچھ دنوں سے یہ رگوں میں جو دُھواں سا ہے رواں
کسی مُنہ زور اندھیرے میں چمکتا سکتا

دل کے اس خانۂ خفیہ کی تلاش کے لیے
روز آ جاتے ہیں، اور، کچھ نہیں ملتا سکتا

میرے حصے کی مصیبت ہی مجھے مل جاتی
کوئی انصاف مرے ساتھ بھی کرتا سکتا

خاکِ خواہش کے اُڑانے کو ہوا کی اک موج
چاکِ دل کے لیے اک تارِ تمنا سکتا

ریتلی رات سرکتی رہی آنکھوں میں، ظفرؔ
ایک ہی بار جو مَیں وحشتِ صحرا سکتا

☆

سب سے آگے گا
اتنا بھاگے گا

آنکھ جھپکنے میں
کوکو گا گے گا

پکّی عمر میں دل
کچّے دھاگے گا

کان کھول کر سُن
کچھ تو راگے گا

کس کی خاطر وہ
سب کو تیاگے گا

سو جائے گا پھر
یونہی جاگے گا

مُڑ جائے گی موج
ساحل جھاگے گا

نا ہمواری کو
کون سُہاگے گا

ایسا نہیں ظفرؔ
جیسا لاگے گا

☆

زمانے بھر سے ہم اُس کو حسیں بھی مانتے ہیں
جو کچھ کہتا ہے وہ اُس کا یقیں بھی مانتے ہیں

یہاں بھی مانتے ہیں، اور، اُس بُت کو وہاں بھی
جہاں پر بھی وہ منوائے، کہیں بھی مانتے ہیں

کسی کمزور لمحے میں ہمیں بھی تو وہ مانے
ہم اپنا تو اُسے دُنیا و دیں بھی مانتے ہیں

اُفق بھی کوئی ہو گا، دونوں ملتے ہیں جہاں پر
فلک اُس کو تو ہم خُود کو زمیں بھی مانتے ہیں

چلو قدموں سے تو اُس کے لپٹ سکتا ہے اُٹھ کر
جو اِس دل کو غبار تہ نشیں بھی مانتے ہیں

فقط احساس ہے، اور فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے
کہ ہم سے دُور ہے جس کو قریں بھی مانتے ہیں

بہُت آزادہ رَو ہوتے ہُوئے بھی کچھ دنوں سے
ہم اپنے آپ کو زیرِ نگیں بھی مانتے ہیں

عقیدہ تو ہمارا اور ہی کچھ تھا، مگر اب
بُتاں بھی مانتے ہیں، اور، بُتیں بھی مانتے ہیں

ظفرؔ، شاعر ہمیں اِس عزلت آبادِ سُخن میں
اگر کچھ مانتے ہیں، کچھ نہیں بھی مانتے ہیں

☆

سفرِ تازہ پہ ہوتا ہوں رواں از سرِ نو
نہیں معلوم کہ رُکتا ہوں کہاں از سرِ نو

چل پڑا سلسلۂ سُود و زیاں از سرِ نو
مَیں نے کھولی جو محبت کی دُکاں از سرِ نو

مطلعِ خواب کا منظر نہیں پہلے جیسا
دھول ہے تازہ تریں ، اور دُھواں از سرِ نو

گُزر اوقات اُسی کاہشِ دیرینہ پہ ہے
کہ یہاں از سرِ نو ہے نہ وہاں از سرِ نو

اچھے لگتے ہیں مُجھے اپنے غروب اور طلوع
چھپنے والا ہوں کہ ہوتا ہے عیاں از سرِ نو

اپنی ہی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے مُجھے
مُدّتوں بعد جو کھولی ہے زُباں از سرِ نو

مُجھ میں چلتی ہے تو اِس تیز ہَوا کے ہاتھوں
بجھتے جاتے ہیں کئی اور نشاں از سرِ نو

کہنہ بنیاد کے درپے ہوں کہ صاحب انھیں نے
اسی ملبے سے بنانا ہے مکاں از سرِ نو

کر چکا ہوں کبھی لکھا ہوا منسوخ ، ظفر
اب جو کہنا ہے ، سو ، کرنا ہے بیاں از سرِ نو

-☆-

آبِ رواں سے عیب و ہُنر تک

ظفر اقبال اُردو غزل میں تجدید اور اجتہاد کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایت کے تحفظ و تسلسل کے حوالے سے ہمارے اہم ترین شاعر ہیں کہ عمر کی ساتویں دہائی میں ہونے کے باوُجود اُن کے تخلیقی وفُور کی شِدّت میں روزِ اوّل کی سی سرشاری اور وارفتگی صاحبانِ دانش و بینش میں ایک نعمت اور سعادت تصوّر کی جاتی ہے۔

''آبِ رواں'' سے ''عیب و ہُنر'' تک اسالیب کا اور لہجوں کا، موضوعات کا اور لغت کا، لفظوں کی نشست برخاست اور آہنگ کے در و بست میں سلیقے کا جو کمال اور جیسا تنوّع ظفر اقبال کے یہاں نظر آتا ہے، وہ ہمارے غزل کے عصری منظر نامے میں شاید ہی کہیں اور نظر آتا ہو۔۔۔ تازہ ہنری کے اسرار و رموز سے گہری آگہی اور شعوری صناعی و سادہ کاری کے باوُجود وہ غزل کے جوہرِ اصلی اور عنصرِ اساسی یعنی ''عشق'' کے اسمِ اعظم کے ورد و وظیفہ و ذکر کے مسلک پر بصد ہزار حکمت و وقار سے کاربند نظر آتے ہیں۔ شعری وجدان اور فنی تجاربے کے خوشگوار تخلیقی ارتکاز و ارتباط نے ظفر اقبال کے شعر میں جو تاثیر پیدا کر دی ہے، وہ اُردو غزل کی صدیوں پر پھیلی ہُوئی روایت میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اُن کے ہاں کھلتے ہُوئے ''کچے'' مصرعے آتے ہیں اور آتے چلے جاتے ہیں، مگر بیان اور زُبان پر کامل دسترس اور قابلِ رشک گرفت اور بے پناہ قُدرت کے باوُجود اُن کی شادابی اور تازگی برقرار رہتی ہے، ورگرنہ یُوں ہماری شاعری پختہ کاروں کے باسی اور یبوست زدہ کلام کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

نرم نرم ریشم لہجوں کے مسحور کُن شعری ماحول سے لے کر کھردرے اور بظاہر اُکھڑی اُکھڑی کڈھب لفظوں سے تشکیل پائی ہُوئی فضا تک اُسلوب کی اِتنی Variations ہیں اور اظہار کی ایسی Range ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ Liberties بھی لیتے ہیں، چھیڑ چھاڑ بھی کرتے ہیں، مگر بنیادی طور پر وہ غزل کی ہیئت کے فنی تقاضوں کی روایت کے مثالی امانت

ظفر اقبال کو میں نے اُس وقت پہچانا جب میری نظر میں ناصر کاظمی کی غزل اور منیر نیازی کی نظم کے سوا دورِ حاضر کے کسی شاعر کا کلام جچتا ہی نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ظفر اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس کی بات بھی نئی ہے، لہجہ بھی نیا ہے اور زبان بھی نئی ہے۔ ناصر اور منیر نے اُردو شاعری کو نئی بات بھی دی ہے اور نیا لہجہ بھی، لیکن انھوں نے زبان کے تقدّس کا بہت خیال رکھا ہے۔ یہی کچھ اُن کے ایک بڑے پیش رو فیض احمد فیض نے کیا تھا۔ اُس نے بھی نئی بات نئے لہجے میں کی تھی، لیکن زبان وبیان وہی استعمال کی تھی جو میر، مصحفی، غالب اور اقبال تک آتے آتے کوثر و تسنیم میں دھل چکی تھی۔

لیکن ظفر اقبال کو اُس روش سے انحراف پر اصرار تھا، اُس نے انحراف کرتے کرتے اُردو شاعری کی زبان ہی بدل ڈالی۔ محسوس تو بہت سوں نے کیا تھا کہ:

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن یہ جرأت ظفر اقبال ہی نے کی کہ اپنے وجود میں مچلتی ہوئی وسعتِ بیان کی ضرورت کے تحت زبان کے تنگ اور فرسودہ شکنجوں کو بہ یک جنبشِ قلم توڑ کر رکھ دیا اور یوں اُردوے معلّی کو کوٹھے سے اُتار کر بھرے بازار میں دھکیل دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس ساری کوشش میں اُس کی زبان کبھی بازاری نہیں ہوئی۔ ہاں، اپنے اُوپر ہنستے ہنستے جب وہ پورے معاشرے پر ہنستا ہے تو بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ پھکڑپن پر اُتر آیا ہے۔ اصل میں جہاں اُس نے غزل میں میر، غالب اور یگانہ و فراق تک سے بہت کچھ سیکھا ہے وہاں وہ نظیر اکبر آبادی کا بھی وارث ہے، اور یہی بات اُسے غزل اور نظم کی دونوں صنفوں میں دورِ حاضر کا نمایندہ ترین شاعر بنا دیتی ہے۔ بظاہر وہ غزل کا شاعر ہے، لیکن اُس کی ہر کتاب کا ایک الگ ذائقہ ہے۔ اُس کی کتابیں غزلوں کا مجموعہ محسوس نہیں ہوتیں، بلکہ ہر کتاب ایک طویل نظم کی طرح اپنا آپ کھولتی چلی جاتی ہے۔

ایک اور بات جو مجھے متاثر کرتی ہے ظفر اقبال کا یہ رویّہ ہے کہ وہ نہ صرف پُرانوں میں نیا نظر آتا ہے، بلکہ تازہ ترین شاعروں سے بھی تازہ تر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

داروں میں ہیں۔ اُردو غزل کے جدید ترین شعرا کی نسل پر ظفر اقبال کا اثر و نفوذ بہت واضح نظر آتا ہے۔ فیض کے علاوہ شاید ہی کسی اور شاعر نے اپنے بعد آنے والے غزل گو شعرا کو ظفر اقبال کی طرح متاثر کیا ہو۔ اعتراف و استفادہ کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو ظفر اقبال کے شعری قد و قامت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظفر اقبال میرے نزدیک جدید اُردو غزل کے روشن حال کے سرفراز و سُرخرو شاعر بھی ہیں اور اس کے مستقبل کی روایت کے ہراول دستے کے لائق تعظیم و قابلِ اعتبار رہنما بھی۔ اللہ تعالیٰ توفیق ارزانی فرمائے۔

افتخار عارف

(ظفر اقبال پر مضمون سے اقتباس)

-☆-

ہر دور کے بڑے شاعر اور فن کار کی طرح وہ اپنے ارد گرد کے تمام درمیانے درجے کے شاعروں اور فن کاروں کے کلام سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہے۔ جس کے پاس جو مال ہوتا ہے وہ سب سے لے کر اپنی بھٹی میں ڈال کر اپنا "عیب و ہنر" بنا لیتا ہے، بڑے فقیر بھی یہی کرتے ہیں ان کی دیگ میں ہر کسی کا لایا ہوا دال دلیا پک کر تبرک بن جاتا ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری دورِ حاضر کی رنگا رنگ واردات کا بڑا لذیذ اور مفرح تبرک ہے۔

محمد حنیف رامے

اس کتاب کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسے ترتیب دیتے وقت میں انتخاب کے مرحلے سے نہیں گزرا، بلکہ پچھلے مجموعے کے بعد اب تک جو غزلیں کہی گئیں، وہ سب کی سب یعنی جس حد تک بھی دستیاب ہوئیں، شامل کر دی گئی ہیں۔ گویا اس دفعہ انتخاب کا کام میں نے قارئین پر چھوڑ دیا کہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق یہ مرحلہ خود سر کر لیں۔ کچھ میں نے محسوس بھی کیا ہے کہ شاعر اپنے کلام کا بہترین نقاد ہمیشہ ہی آپ نہیں ہوتا، اور یہ کہ اس کا حق دوسروں کو بھی ملنا چاہیے۔

تخلیقی عمل کے دوران درپیش مسائل کا ذکر یہاں پر اس لیے نہیں کروں گا کہ وہ بعض اشعار میں خود ہی بیان ہو گئے ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ میں ابھی تک شاعری کی تلاش و تعاقب میں ہوں اور فی الحال اس سے مڈ بھیڑ نہیں ہو سکی، تاہم میری یہ عاجزانہ کوشش جاری و ساری ہے، اور شاید یہ کوشش بجائے خود بھی کسی شمار و قطار میں آ سکے۔ بصورتِ دیگر ناکامی تو ہے ہی، جس کا اعتراف میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔

ظفر اقبال

-☆-